

خواتین اور مردوں کے لیے اکیسویں صدی کا منفرد ماہنامہ

عید الفصحی مبارک

رحا ڈائجسٹ

SEPTEMBER  
2017



www.pakistanipoint.com

پاکستانی پوائنٹ

اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ

ایک رابطہ ہیں

ماڈل: ریا خان

میک اپ: روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی: موسیٰ رضا

چیف ایڈیٹر  
صالحہ محمود

رداء المجسطی

خطبات کا مجموعہ  
رداء المجسطی

۱۳۶۰ھ - ۱۳۶۱ھ  
۱۴۰۱ھ - ۱۴۰۲ھ

ایڈیٹر  
سیدی محمود جعفری، بلال جعفری  
فائندہ ایجوکیشن، قراچہ جعفری  
E-Mail: frazjafri@aol.com  
فائندہ ایجوکیشن، UAE  
E-Mail: saqrulh@comirates.net.ae  
فائندہ ایجوکیشن، شکار پور  
آرٹسٹ: جنید انصاری



## سلسلے وار ناول

## افسانے

۸۲ حفصہ کنول

مریم فاطمہ ۹۰

۱۱۲ حنا شامد

زندگی تنویر ۱۴۲

۱۷۲ مہرین کنول

نظیر فاطمہ ۱۷۴

۱۷۸ ثناء کنول

بڑی عید

## عید کا چاند

## فیصلہ

سوکھا آسمان۔

## عید کا چاند

شاید کہ اتر جاے

## آج کا مسلمان

مکمل ناول

میری زندگی ہے تو عائشہ مری

## ناولٹ

۶۶ وصلِ عشق آسیہ مظہر

نام تیرا ہے مجھ سے تہینہ چوہدری ۱۲۸

ستمبر 2017ء

جلد نمبر 21 شماره نمبر 9

قیمت 60 روپے

**[www.facebook.com/rida.digest](http://www.facebook.com/rida.digest)**

زِرَّ سَالَانَهٗ بِذَرِيعَةٍ رَّجَسْتَرِي

**720 روپے**

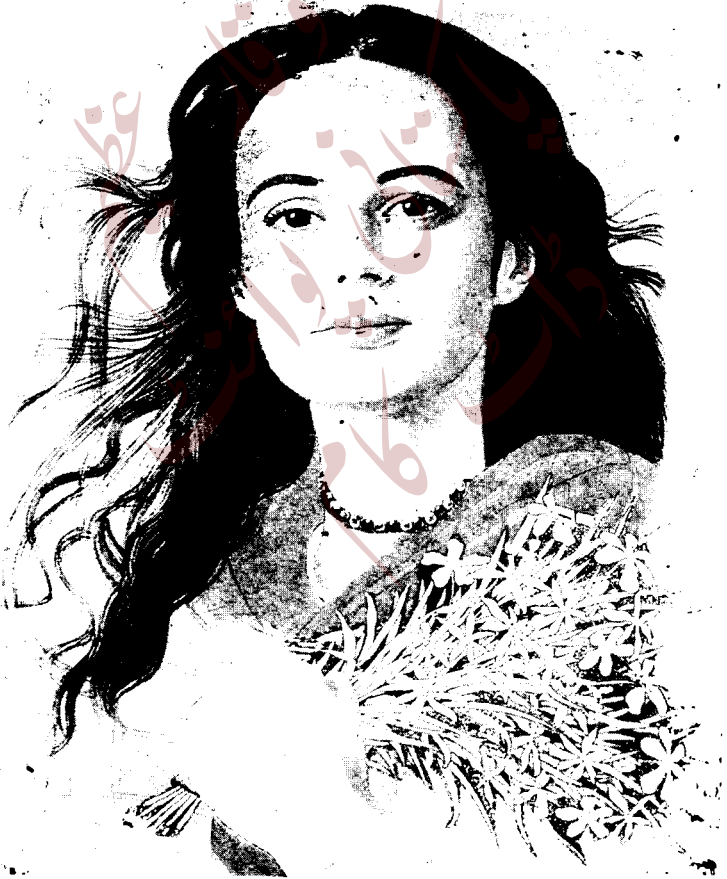
پبلشر وائیڈ میٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھوڑا کر شائع کیا۔  
مقام اشاعت: ۱۲۹/ ڈی بلاک - 2 - بی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی، کراچی

### انتباه:-

ماہنامہ ”روداد“ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ٹی وی چینل کی اشاعت برادرادہ جوری کی انف آئی آر جوریج کر اومے گاس لئے پیشتر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ ”روداد“ یلمین۔“

## مستقل سلسلے

۲۲۲	ثریا اقبال	۷	کچن	۲۰۲	صلحہ محمود	ردائے جنت
۲۲۵	شہلا مشاق	۲۰۲	سنگھار	۲۱۲	صدف سعد	ردا کی ڈائری
۲۰۴	نورین ملک	۲۰۸	اشعار	۲۰۸	شہلا مشاق	ذرا پھر سے کہنا
۲۱۷	صلحہ محمود	۲۰۶	سندیلے	۲۰۶	نورین ملک	خوشبو
۲۲۰	ادارہ		دوستوں کے نام پیغام		نورین ملک	اس ماہ میں





کوئی کسی کے لیے رکتا ہی نہیں ہے نہ زندگی کی رفتار رکتی ہے ہر چیز ایک دن اپنی جگہ آ کر رک جاتی ہے۔ بس دکھوں کے دریا ہیں جو آباد رہتے ہیں۔ یادوں کا کوئی پتھر اٹھا پھینکو لیکن لہر دم توڑ جاتی ہے۔ یہ زندگی کا اثاثہ ہے جو تہہ آب ہو گیا۔ انسان ساکت ہوا، تو لب خاموش ہو گئے لیکن دریا بل پڑے۔ قطرہ قطرہ دکھوں نے اسے سمندر بنا دیا۔ کہیں گرتی ہوئی آبشاروں میں شنو ہاتھ چھڑا کر چلی گئی، دکھ کا ایک دریا تھا جو ابلتا رہا اور شام ہو گئی کب دن ڈھلا کب رُت بدلی بس دل کا موسم بنجر بنجر دھوپ بجی رہی آنکھوں میں اچانک پھر کہیں دکھ کی آندھی چلی، سیاہ بلکو لے لے گئے اٹھا کر مجھے۔ خشک دھوپ میں جہاں ہر چیز ساکت تھی بس دل کی صدائے بازگشت آج بھی کانوں میں آرہی ہے۔ میرا بھائی مجھ سے پھڑ گیا وہ بھائی جو عکس تھامیری تحریروں کا جس کی کتابوں سے میں نے استفادہ حاصل کیا۔ وہ ایک شب علم و ادب کا کثیر سرمایہ چھوڑ کر راہ عدم کا راہی ہوا۔ سنانوں سے گلی کو بچے آباد ہو گئے۔ گھر ویران سا لگا، قیمتی کپڑے ویران سے، پرندے چچھاتے رہ گئے۔ کتابوں کے اوراق رہ گئے ان نایاب کتابوں میں جہانگیر بادشاہ کے ہاتھ سے لکھا ہوا روزنامہ ایک شام محبت کی طرح کتابوں کے بیچ رہ گیا۔ وہ ہنستی ہوئی شوخ براؤن آنکھیں سفید چہرے مسکراتی ہوئی وہ ماتھے کی ٹھنکینیں وہ قرب کا احساس کے بیٹھ کر اٹھنے کا دل نہ چاہے، علم و ادب کا ایک ایسا چراغ جو گل ہو گیا وہ میرا بڑا بھائی تھا جس سے میں نے انپاریشن لی وہ میرا خیر تھا۔ جو گل روٹھ کر مٹی میں سو گیا۔ گلاب چہرہ تھا جو کھڑ گیا۔

یارب! دعاؤں اور محبتوں کے سحر

جب تک دلوں میں آباد ہیں

تا ابد رمتوں کے سائے ابر کی طرح

لحد پر رہتے ہیں

سب منزلیں ہوں آسان

رمتوں کے در کھلے رہیں

یارب! تو کر لے یہ التجا قبول

یہ ہیں میری محبتوں کے پھول

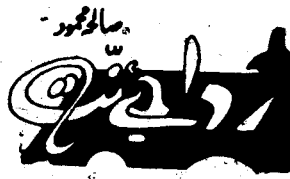
جنت کا وہ مکیں بنے

سب گناہوں سے پاک کر دے اسے

معاف کر دے اسے

صالحہ محمود

ہمارے چاہنے والے پڑھنے والوں سے اتنا س ہے کہ ڈاکٹر عزیز صدیقی جو کہ ہمارے بڑے بھائی تھے ان کے درجات کی بلندی کی دعا کریں۔



طرف سے ذبح کرتے۔ (مسند احمد)

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ گئے۔“ (مسند احمد)

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ”میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

”کیا قربانی واجب ہے؟“

انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان قربانی کرتے رہے اور یہی طریقہ جاری ہے۔“ (طبرانی)

قربانی کا ثواب:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قربانی کے دن آدم کا بیٹا کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (جانور کی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ (جانور) قیامت کے دن اپنے بیٹگوں، کھروں اور بالوں سمیت آئے گا (اور بیٹی کے پڑے میں رکھا جائے گا قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں (قبولیت کا) مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس

قربانی کی دعا:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو مینڈھے قربان کیے۔ جب انہیں قبلہ رخ کیا تو فرمایا: (ترجمہ) میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس اللہ کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں۔ بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔ اے اللہ! یہ جانور تجھ ہی سے ملا اور تیرے ہی لیے قربان کیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت کی طرف سے۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی:

حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے بڑے، موٹے تازے، سینگوں والے، چتکبرے اور خسی مینڈھے خریدتے۔ ایک اپنی امت کی طرف سے ذبح فرماتے، یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا ہو اور دوسرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی



لیے خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔“ (ترمذی)  
قربانی کا جانور:

حضرت یونس بن میسرہ بن حلبس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ”میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوسعید رزقی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قربانی کے جانور خریدنے لگا۔

یونس بن میسرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے مینڈھے کی طرف اشارہ کیا جس کے کانوں اور گلے کا کچھ حصہ سیاہ تھا۔ وہ جسمانی طور پر نہ زیادہ اونچا تھا نہ زیادہ پست تھا۔ انہوں نے فرمایا: ”میرے لیے یہ خرید لو۔“ گویا انہوں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مینڈھے کے مشابہ قرار دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: ”ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عید الاضحیٰ آگئی چنانچہ ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔“ (ترمذی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”ہم نے حدیبیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک اونٹ سات افراد کی طرف سے اور ایک گائے سات افراد کی طرف سے ذبح کی۔“ (صحیح مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ (ابوداؤد)

کس عمر کے جانور کی قربانی درست ہے؟

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کچھ بکریاں دیں جو انہوں نے قربانی کے لیے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے) صحابہ کرام میں تقسیم کر دیں۔ (ان کے پاس) بکری کا ایک سالہ بچہ (باقی) رہ گیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو انہوں نے فرمایا: ”اس کی قربانی تم دے دو۔“ (بخاری)

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو، یا جس کا کان چرا ہوا ہو یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔“ (ابوداؤد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔“ (ترمذی)

قربانی کی کھالیں:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کے (قربانی کے) تمام اونٹوں کا گوشت، ان کی کھالیں غریبوں میں تقسیم کر دیں۔

قربانی کا گوشت کھانا:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر اونٹ کی ایک ایک بوٹی لے کر ہڈیاں میں ڈالی گئی (اور پکائی گئی) تب انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے) کچھ گوشت کھایا اور کچھ شور بہ پیا۔ (مسند احمد)

☆.....

قمر و شہک

# صبر و شہادت کی لکیریں

”السلام علیکم!“ اجیارہ نے ادب سے سلام کیا۔  
”وعلیکم السلام... آپ شاید اجیارہ حسن ہیں۔“ زبیرہ نے بغیر کوئی سوال کئے ڈائریکٹ بات کی تھی۔  
”جی.... وہ مجھے سنی کو پڑھانے کے لئے سرچو ہدیری قیصر صاحب نے بھیجا ہے۔“





”جی، میری ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈیڈ سے بات ہوئی ہے، آپ آئیے اندر۔“ زئیرہ آگے بڑھی اور اجیارہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی تھی۔ زئیرہ اس کو سیدھا سنی کے بیڈروم میں لے آئی تھی۔

”آئیے.... یہ سنی کا بیڈروم ہے۔ یہ میرا چار سال کا پیارا سا بیٹا ہے۔“ زئیرہ نے موبائل فون پر گیم کھیلتے سنی کو گود میں اٹھالیا، سنی نے اجیارہ کو دیکھا۔

”سنی جانو، سلام کرو اپنی نئی بچہ کو۔“

”آج پھر سے نئی بچہ.... دیکھ لیں ارشی ماما ان کو بھی نکال دیں گے یا یہ خود ڈر کے بھاگ جائیں گی۔“ سنی نے اپنے معصومانہ انداز میں کہا۔

”سنی بری بات، ایسے نہیں کہتے، پتہ ہے ان کو تانا ڈیڈ نے بھیجا ہے۔“ زئیرہ نے سنی کے چھوٹے سے

## فصل نمبر 12



ہونٹوں پر ہاتھ رکھا اور سامنے کھڑی اجیارہ کو دیکھا۔

”ایم سوری۔“ زئیرہ کو معمولی سی شرمندگی ہوئی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اجیارہ ہولے سے مسکرا دی اگر اس کو چوہدری قیصر عسکری نے سب کچھ بتایا نہیں ہوتا تو وہ

سنی کی بات پر حیران ہوتی مگر وہ سب جانتی تھی۔

”تو پھر یہ لیجئے آپ کا اسٹوڈنٹ..... مجھے ذرا باہر جانا ہے۔ میں ایک گھنٹے میں آ جاؤں گی۔“ زئیرہ نے سنی کو گود میں اٹھا کے اجیارہ کی طرف بڑھایا۔ اجیارہ نے اس معصوم سے پیارے سے بچے کو تھام لیا۔

سنی تو اپنی کہہ کر پھر سے اپنے وڈیو گیم میں لگ چکا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں، ہر روز اس کے ٹیوٹر آتے رہتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں۔

”آپ فی الحال اس کو بند کیجئے۔“ اجیارہ نے سنی کے ہاتھ سے موبائل فون لیا اور آف کر کے ایک سائیڈ پر رکھا اس دوران زئیرہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

”اب سب سے پہلے مجھے اپنا پورا نام اپنی کلاس اور اپنے فرینڈز کے بارے میں بتائیے۔“ اجیارہ اس کو اس کے بیڈ پر لے آئی گود میں بیٹھا کر اس کا رخ اپنی سمت کیا۔



”خیریت تو ہے؟“ ندیم بلوچ نے سید اذکار علوی کو اس کے گھر سے پک کیا تھا۔

”ہاں یار سوچا ایک بہت اہم کام کرنے جا رہا ہوں تو تجھے اپنے ساتھ لے کر چلوں آخر کو بہت گہرا اور اچھا دوست ہے تو میرا، تو سب سے پہلے اپنی پہلی خوشی میں تجھے شامل کرنا چاہتا ہے۔“ ندیم بلوچ نے گاڑی کا اسٹیرنگ گھمایا تھا۔

”اللہ رحم کرے یقیناً شادی کے بارے میں سوچ لیا ہے۔“ سید اذکار علوی، ندیم بلوچ کے ہر رنگ کو پہنچاتا تھا ان کی یہ دوستی ابھی کی نہیں تھی، اسکول لائف سے بھی دونوں نے ایک ساتھ ہی پڑھائی مکمل کی تھی بس فیلڈ الگ الگ جوائن کر لی تھی۔ فیلڈ بھلے ہی الگ الگ ہو مگر ان کی دوستی پر حرف نہیں آیا تھا۔

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ ندیم بلوچ کی آنکھوں میں چھپ سے رجاء صدیقی کا بھللا تا ہوا عکس ابھرا تھا۔

”بہت زبردست نیوز سنائی ہے، کون ہے وہ؟ یقیناً خاص ہی ہوگی، کچھ تو بات ہوگی جسے میرے بارے میں پسند کیا ہے۔“ سید اذکار علوی کو دلی خوشی ہوئی تھی، وہ بہت خوش تھا کہ ندیم بلوچ اس کے میٹ فرینڈ نے کسی لڑکی کو پسند کیا ہے۔

”ہاں، بہت خاص اور اہم ہے، ہر لڑکی سے الگ اور مختلف، کوئی ناز و انداز نہیں، کوئی بناوٹ نہیں۔ ہر مادی

شے سے پاک، سادہ چہرہ، سادہ انداز، باتوں میں خوشبو... رجاء صدیقی راؤ!“

”اوں..... رجاء صدیقی راؤ..... گڈ نیم.... تو میری جان کہاں تک پہنچی یہ کہانی۔“ سید اذکار علوی اس کے چہرے کے کھلتے رنگوں کو دیکھنے لگا تھا، آج پہلی بار اس کے چہرے پر وہ رونق دیکھی ہے جو کبھی نہیں دیکھی تھی حالانکہ جس فیلڈ میں وہ تھا وہاں ہر موٹ، ہر قدم پر حسن ہی حسن بھرا پڑا تھا۔ خوبصورتی اس کے قدموں میں پڑی تھی مگر ندیم بلوچ نے بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔

”اس انڈسٹری میں بہت سی خوبصورتی، کھلا عریاں حسن، ہوشربا شباب دیکھا کتنی نے مجھ کو متاثر کرنے کی کوشش بھی کی تو بہت سی نے آفر بھی دی مگر میرے دل کو، میری آنکھوں کو کبھی کسی کی خوبصورتی نے متاثر نہیں کیا،

کوئی میری آنکھوں میں چٹانیں، کوئی میرے دل کو بھایا نہیں۔ یہ دل بھی اٹکا تو کہاں اٹکا، پہلی نظر، پہلی ملاقات میں ایسا لگا جسے میں اپنا سب کچھ بارگیا، اپنا دل بارگیا۔“ کھویا کھویا سا انداز، آنکھوں کی چمک، لبوں سے جھڑتے پھول مکمل طور پر رجا صدیقی کے سراپے میں ہی کھوئے ہوئے تھے۔ اس کے گرد جیسے رجا صدیقی کا حصار ہی بندھ گیا تھا۔

”لگتا ہے چاروں شانے چٹ ہو گیا ہے میرا بار۔“

”ہاں ایک جھٹکے میں ہی۔“

گڈڑی اس شہر کے مہنگے ترین مال کے پارکنگ لائٹ میں رگ چکی تھی۔ ندیم بلوچ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے سید اذکار علوی کو دیکھا۔

”تو پھر شادی کے لڈو کب کھلا رہا ہے۔“

”شادی کے لڈو؟“ ندیم بلوچ نے کم صم سے انداز میں کہا۔

”اوہ بھائی تو تو اس طرح کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا ہے جیسے اب تک ہم کسی اور کی بات کر رہے تھے۔“

”مگر ابھی میں نے رجا سے بات کب کی ہے۔“

”واٹ!“ سید اذکار علوی جیسے اپنی سیٹ سے دو فٹ اوپر اچھلا ہو۔

”تو جو اس قدر رجا صدیقی کے سادے حسن میں زمین آسمان کے فلابے ملائے جا رہے تھے وہ سب کیا

تھا۔“

”وہ تو ابھی میری کچھ دنوں پہلے ہی رجا صدیقی سے ملاقات ہوئی ہے۔ رجا صدیقی مجھے ایک الٹرا شیو گنگ

کے ایڈیٹر آفر دینے آئی تھی۔“

”ویری گڈ! اور میں سمجھ رہا ہوں کہ اب تو مجھے گڈ نیوز دینے والا ہے اسی ہفتے سر پر سہرا سجانے والا ہے۔“

”ارے نہیں نا۔ ابھی تو میں نے اس پر اپنی پسند بھی ظاہر نہیں کی۔“

”تو جب کرنا جب تیری رجا صدیقی کسی اور کے ساتھ شادی ہو کر چلی جائے گی۔“ سید اذکار علوی تپ کر

بولا۔

”اللہ نہ کرے، بد دعا تو مت دے، کیسا دوست ہے تو۔“ ندیم بلوچ نے گھور کر سید اذکار علوی کے تپے

ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔

”میں بد دعا نہیں دے رہا، بھی لڑکی پسند کر لی ہے تو جاؤ بغیر ڈرے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بول

دو کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔“

”ہاں، میں یہی تو کرنے آیا تھا، سوچا تیرے ساتھ شاپنگ مال سے رجا صدیقی کے لئے ایک ڈائمنڈ رنگ

خریدوں گا۔“

”اچھا تو پھر دیر کیسی، چل جلدی سے نیچے اتر، میں تجھے دلاتا ہوں ایک اچھی سی ڈائمنڈ رنگ۔“ دونوں ایک

ساتھ نیچے اترے تھے۔

”تو چھٹی ناں بہت سست نکلا، ویسے انڈسٹری میں اپنے غرور کے جھنڈے گاڑھے ہوئے ہیں مگر اپنے دل کی

بات ابھی تک دل میں ہی چھپا کر رکھی ہے۔“

سید اذکار علوی اور ندیم بلوچ ایک قیمتی اور مہنگی جیولری شاپ پر آر کے جہاں بیش و قیمت کی طرح کی ہر

جیواری موجود تھی۔

”چل دکھ، کیا اچھا لگے گا تیری رجا پر۔“ ندیم بلوچ نے شاپ کیپر سے قیمتی اور مہنگی ترین انگٹھیاں منگوائیں۔ کوئی آدھے گھنٹے تک دیکھنے کے بعد بالآخر دونوں کو ایک ڈائمنڈ رنگ پسند آئی گئی۔

”یہ بہت خوبصورت ہے۔“ ندیم بلوچ نے ڈائمنڈ کی چمک دیکھی جس میں اسے رجا صدیقی نظر آئی۔

”ہاں اور یہ یقیناً رجا صدیقی کو بہت پسند بھی آئے گی۔“ سیداز کارعلوی کو بھی وہ ڈائمنڈ رنگ بہت اچھی لگی تھی۔

”اس کو پیک کر دیں۔“ ندیم بلوچ نے شاپ کیپر کو وہ انگٹھی دے دی۔

”تو بھی دیکھ لے کچھ، بھابی کے لئے۔“ سیداز کارعلوی کی نظر سامنے شیشے میں رکھے مخملی باکس میں رکھی سلور پائل پر پڑی۔

”یہ دکھائیے ذرا۔“

”جی سر!“ شاپ کیپر نے شیشے کا ڈور کھول کے سرخ مخملی باکس نکالا تھا اور سیداز کارعلوی کے آگے رکھ دیا۔

”زبردست.... لے لے بریزے بھابی پر اچھی لگے گی مگر اس کی مینٹ میں کردں گا، میری طرف سے گفٹ۔“ ندیم بلوچ نے وہ مخملی باکس اٹھالیا۔

”پاگل ہوئے ہو کیا۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سیداز کارعلوی نے منع کرنا چاہا۔

”کیا مطلب ضرورت نہیں ہے؟ بلکہ بہت ضرورت ہے تیری شادی اتنی ارجنٹ ہوئی کہ میں کوئی گفٹ دے ہی نہیں سکا، اس لئے میری طرف سے یہ چھوٹا سا گفٹ سمجھ کے رکھ لے۔“

”اب میں آگے کیا کہہ سکتا ہوں۔“ سیداز کارعلوی نے ہار مان لی تھی اس کے پر خلوص پیار اور دوستی کے آگے۔

”آپ آگے سے کچھ کہہ سکتے بھی نہیں ہیں۔“ ندیم بلوچ نے مسکراتے ہوئے وہ سرخ مخملی باکس شاپ کیپر کو تھما دیا۔

”اس کا بھی بل میرے کارڈ پر بنا دیجیے۔“

”تجھے کچھ اور بھی پسند آ رہا ہے۔“ کاٹیج کے شوکیس میں دیکھتے سیداز کارعلوی کو ندیم بلوچ نے دیکھا تھا۔

”اوں..... یہ لاکٹ دکھانا ذرا۔“ سلور اور گولڈ کی بھاری سی چین میں گولڈ کا جالی کی طرح چھوٹا سا دل بنا تھا اس پر خوبصورت سالمٹی نگوں سے مزین ”A“ لکھا ہوا تھا۔

”اب یہ مت کہنا کہ یہ بھی تو گفٹ کرنے والا ہے۔“ سیداز کارعلوی نے چین ہاتھ میں لی۔

”نہیں یہ تیرا اپنا پرنسپل میٹر ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا۔

دو ڈھائی لاکھ کا بل بنا تھا، ان تین چیزوں کا جس میں رنگ اور پائل کی مینٹ ندیم بلوچ نے کی تھی جبکہ سیداز کارعلوی نے وہ سلور گولڈ کی بھاری چین لاکٹ بریزے کے لیے خریدا تھا۔

”چلیں!“

”ہاں!“ دونوں باہر نکلے تھے۔

”ارے ہاں ندیم، سبب سے ملاقات ہوئی تھی کل کچھ کہہ رہی تھی۔“

”نہیں میں تو اس کو ہوں میں چھوڑ کر چلا گیا تھا، ہاں تمہارا ایک آئی فبز ڈا کر حیات وہ روم میں آیا تھا، اس نے

کچھ پوچھا ہو تو میرے علم میں نہیں۔“

”تو میں تیرا جتنا شکرا ادا کروں کم ہے تو نے میری مدد کی ہے۔“

”دیکھ دوستوں میں کوئی شکر یہ نہیں ہوتا یہ تو میرا فرض ہے بلکہ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ اپنے پاک ملک اپنی مٹی اپنی زمین کا تھوڑا سا قرض ادا کر سکوں اگر میری وجہ سے ہم اس ملک دشمن تک پہنچ جائیں تو یہ میرے لیے بہت فخر کی بات ہے اور میری تو تجھ سے یہ ریکوسٹ ہے کہ سہد وڑائچ کو ایسی موت دینا کہ موت کو بھی خود پر رحم آئے۔“ ندیم بلوچ کی آنکھوں میں اپنے پاک ملک پاکستان کے لئے جذبہ تھا، جس قدر محبت تھی اس سے کئی گنا سہد وڑائچ کے لئے نفرت بھی تھی۔

”جو ہمارے ملک کی جڑوں کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی کوشش کر رہا ہے ہمارے ملک کی عزت و ناموس، آبرو سے کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے، ہماری نئی آنے والی جنریشن کو تباہ برباد کر رہا ہے مگر وہ بھول گیا ہے کہ جب پاکستان پر ہماری پاک سرزمین پر کسی نے مصیبت ڈھائی ہے اسے گندی و مٹی نظروں سے دیکھا وہ خود تباہ برباد ہوا ہے۔“

”فکر مت کر، سہد وڑائچ کو میں ایسی موت دوں گا کہ موت بھی کانپ جائے گی تل تل مرے گا اور خود اپنی آنکھوں سے اپنی موت دیکھے گا بس مجھے اس کی خبر مل جائے پتہ چل جائے کہ وہ رزیل آدمی کس بل میں چھپا بیٹھا ہے پھر لچر بھی نہیں لگاؤں گا اس کو اپنے مضبوط شکنجے میں جکڑنے کے لئے۔“ سید اذکار نے پرسوج نظروں سے وینڈا سکرین کو گھورا تھا۔

”مجھے تجھ سے یہی امید ہے اذکار! بھلے ہی میرے کیریئر پر انگلی اٹھتی ہے، میری ذات کو نشانہ بنایا جاتا ہے مگر میں ہر صورت تیرا ساتھ دوں گا۔“ ندیم بلوچ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھرنا تھا۔

”بھینکس میرے یارا! اب وہ وقت دور نہیں جب مجرم بہت جلد سٹاکخوں کے پیچھے اپنی ہی دھول چاٹ رہے ہوں گے۔“ سید اذکار علوی نے ندیم بلوچ کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ دھر دیا تھا۔

اسی اثناء میں ندیم بلوچ کا فون بجنے لگا تھا۔ اس نے فون دیکھا جہاں رجا صدیقی کا لنگ جگمگا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر دھیرے سے مسکراہٹ کھل اٹھی اور اپنا ہاتھ آہستگی سے سید اذکار علوی کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔

”تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ بتا رہی ہے رجا صدیقی کا فون ہے۔“ سید اذکار علوی نے اس کے چہرے کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اندازہ لگا لیا تھا۔

”ہاں۔“

”تو ٹھیک ہے، تم انجوائے کرو، میرا گھر بھی آگیا ہے میں بھی نکلتا ہوں۔“

”اوکے مگر رات کا ڈنر ہم ساتھ کر رہے ہیں، تو بریزے بھابی کو لے کر ٹھیک دس بجے پرل ہوٹل میں پہنچ جانا۔“ ندیم بلوچ نے سید اذکار علوی کو یاد دہانی کرائی۔

”میرا خیال ہے تجھے اب فرصت نہیں ملے گی۔“ اس نے ندیم بلوچ کے ہاتھ میں اس کا سیل فون بجاتے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

”ارے یار ایسی کوئی بات نہیں ہے، پیارا اپنی جگہ دوستی اپنی جگہ۔“ ندیم بلوچ کے منہ سے بے دھڑک بالکل اچانک ہی نکلا تھا۔

”اوہو.... پیار....!“ سید اذکار علوی نے اس کا جملہ پکڑ لیا تھا۔

ندیم بلوچ کچھ خفیف سا ہو گیا۔

”چل مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تجھے جیسے ریزرو بندے کو بھی کسی سے پیار ہوا لیکن ندیم تو جانتا ہے تائیں بریزے کو نہیں لاسکتا اس لئے معذرت۔ کچھ ٹائم ویٹ کر لے پھر تیرے ویسے کی دعوت کھائیں گے۔“

”اوکے میں سمجھ سکتا ہوں، اچھا اب اجازت دے، فون چیج چیج تھک گیا ہے، مجھے بھی اب نکلنا چاہیے۔“

ندیم بلوچ نے اپنا سیل فون ڈیش بورڈ پر رکھا۔

”اوکے، فی امان اللہ۔“

سید اذکار علوی گھر آ گیا اور ندیم بلوچ نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

سید اذکار علوی گھر میں داخل ہوا تو کچھ سنا سنا محسوس ہوا تھا۔ اپنی کلائی پر بندھی قیمتی و مہنگی ہینڈ واچ دیکھی جہاں اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اس وقت تو سید آغا شہباز علوی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہوتے تھے مگر ٹی وی بھی بند تھا اور سید آغا شہباز علوی بھی غائب تھے۔

”عبدل، دادو کہاں ہیں؟ اسے روم میں ہیں؟“ سید اذکار علوی نے صفائی کرتے ملازم سے پوچھا جو اس وقت پھولوں کی منی پلانٹ کی صفائی کر رہا تھا۔

”نہیں چھوٹے سرکار، بڑے سرکار برابر والے بنگلے میں گئے ہیں۔ شیخ صاحب کی طبیعت ناساز تھی، انہیں بخار ہو گیا ہے تو بڑے سرکار کو فون کر کے ملنے بلایا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ سید اذکار علوی اپنے بیڈ روم میں اوپر کی جانب بڑھنے لگا کہ سامنے کچن سے کچھ کھڑ پھڑکی آواز آئی اور ساتھ ہی ریڈ کلر کا آئینہ بھی نظر آیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا وہ جیولری باکس سائیڈ میں رکھے آئرن کارنر پر رکھا اور کچن کی جانب چل دیا۔

”آہ۔“ ایک دردناک چیخ کے ساتھ سید اذکار علوی کی بھی زوردار چیخنی ہوئی آواز نکلی تھی۔

”بریزے۔“ آگ کا ایک شعلہ بھڑکا تھا اور گرم کھولتا ہوا تیل بریزے کے پیروں پر گرا تھا۔ سید اذکار علوی تیزی سے اس کے پاس آیا اور اس کو اپنی جانب کھینچا تھا۔

”بریزے.... بریزے....“ بریزے درد اور خوف سے بے ہوش ہو چکی تھی، عقل و خرد سے بے سود وہ سید اذکار علوی کے اہنی مضبوط بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ سید اذکار علوی نے اس کے نازک وجود کو اپنی بانہوں میں بھرا اور ٹی وی لاؤنج میں لے آیا تھا۔ اس کو صوفے پر لٹایا اور اسی کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ سید اذکار علوی کی چیخ سن کر گھر کے سارے ملازم اکٹھا ہو گئے تھے۔

”چھوٹے سرکار، بریزے ٹی بی کے پیر جل گئے ہیں۔“ عبدل نے بریزے کے پیروں کو دیکھا۔ گورے چٹے پیر گرم تیل کی وجہ سے سرخ ہو گئے تھے۔

ملازمہ سب سمجھ گئی تھی۔ جلدی سے بھاگ کے کچن سے برنال لے کر آئی اور بریزے کے پیروں پر لگا دیا۔

”بریزے....!“ وہ اس کا گال تھپتھارہا تھا، بریزے کو بے ہوش دیکھ کر ڈرائیور بھی ڈاکٹر کو لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے بریزے کا چیک اپ کیا تھا۔

”ڈاکٹر صفدر! بریزے ٹھیک تو ہے نا؟“ سید اذکار علوی کے چہرے پر جہاں بھری پریشانی تھی، فکر تھی۔ اس کی تو جیسے جان ہی نکلی جا رہی تھی بریزے کو اس حالت میں دیکھ کر۔



”اذکار فکر مت کریں، بریزے ٹھیک ہیں، بس ذرا ڈر اور خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گئی ہیں۔ میں نے اچھی طرح چیک اپ کر لیا ہے اور سکون کا انجکشن بھی لگا دیا ہے۔“ ڈاکٹر صفدر نے سید اذکار علوی کو تسلی دی تھی۔

”کیا ہوا ہے، کیا ہوا ہے میری پھولوں سی بچی کو؟“ پریشان حال سے سید آغا شہباز علوی کی آواز پورے ہال میں گونجی تھی۔ وہ سید ہاریزے کی طرف آئے تھے۔

”آغا انکل! آپ پریشان مت ہوں، بریزے ٹھیک ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ انھیں گی تو بالکل فریش ہوں گی۔ ہاں پیپر بری طرح جلا ہے، تکلیف تو ہوگی اس لئے میں آپ کو کچھ میڈیسن اور ٹیوب لکھ کر دے رہا ہوں، یہ استعمال کریں گی تو آرام محسوس ہوگا۔“ ڈاکٹر صفدر نے ایک پیپر پر کچھ دوائیاں اور ٹیوب لکھ کر پرچی سید اذکار علوی کو تھما دی اور اپنا ایڈ باکس تھامے چلے گئے۔

”مگر یہ سب ہوا کیسے۔ یہ گرم کھولتا تیل بریزے بیٹی پر کیسے گرا، وہ کچن میں کیوں گئی تھی اور تم سب ملازم کہاں مر گئے تھے۔“ سید آغا شہباز علوی کا پس چلتا تو ایک ایک ملازم کو دھکے دے کر کھر بے باہر نکال دیتے۔

”بڑے سرکار! میں کچن میں کھانا بنا رہی تھی کہ بریزے بی بی آئیں اور مجھ سے کہا کہ آج وہ کھانا پکا میں گی۔ میں نے منع کر دیا کیونکہ میں جانتی ہوں بریزے بی بی کو کچن کا کوئی کام نہیں آتا، بس میں باہر بھرنی لینے گی، واپس آئی تو یہ سب.....“ ملازمہ نوری نے سر جھکائے سب بتا دیا، انداز میں بے انتہا ڈرتھا۔

”چلو تم نہیں تھیں، باقی سارے ملازم کہاں مر گئے تھے، وہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بریزے کچن میں کیا کر رہے تھے۔“ سید آغا شہباز کا غصہ جلال، غیض و غضب آج بہت عرصے بعد پھر عود آیا تھا، سارے ملازموں کو اپنی گردن پر سولی لٹکتی نظر آ رہی تھی، سب کو اپنی اپنی نوکری خطرے میں پڑتی دکھائی دے رہی تھی۔

”دفع ہو جاؤ سب یہاں سے اگر میری بریزے بیٹی کا خیال نہیں رکھ سکتے تو مجھے تم جیسے ہڈ حرام، کام چور ملازم نہیں چاہئیں۔“ انہوں نے بغیر کوئی بات کہنے سب کو نکال دیا۔

”ہمیں معاف کر دیں بڑے سرکار! ہم سے غلطی ہو گئی، آئندہ سے ایسا نہیں ہوگا۔“ سارے ملازم گھنٹوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے تھے اور گڑ گڑا کے معافی مانگ رہے تھے۔

”نہیں، کسی کو کوئی معافی نہیں ملے گی، سب جاؤ، دفع ہو جاؤ میری نظر دھکے کے سامنے سے ورنہ ایک ایک کو

شوٹ کر دوں گا۔“ سید آغا شہباز علوی بری طرح دباڑے تھے۔

”تم لوگ جاؤ فی الحال ابھی یہاں سے۔“ سید اذکار علوی نے گردن موڑ کے سب کو دیکھا تھا وہ بھی جانتا تھا اگر سید آغا شہباز علوی غصہ اور جلال میں آگئے تو کوئی ان کو روک نہیں سکتا اس لیے فی الحال بہتر یہی لگا سب ملازمین کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔

”اذکار بریزے کو ہوش کیوں نہیں آ رہا۔“

”دادو بریزے ڈر گئی ہے اس کا دل سہم گیا ہے آگ کا شعلہ بھی تو کتنی اوپر تک بھڑکا تھا۔“

”مگر بریزے بیٹی کچن میں کرنے کیا گئی تھی۔“ سید آغا شہباز علوی وہیں سکتل صوفے پر براہمان ہو گئے

ان کے ہر انداز سے بے چینی اور پریشانی و فکر ظاہر ہو رہی تھی۔

”وہ تو مجھے بھی نہیں معلوم مگر یہ ہوش میں آجائے تو میں اس کو اچھی طرح ڈانٹوں گا کہ جب ملازم ہیں کام کرنے کو اور اوپر سے اس کو کچن کا کوئی کام بھی کرنا نہیں آتا تو کیا ضرورت تھی کچن میں جانے کی۔“ سید اذکار علوی کے لب و لہجے میں بھی فکرمندی تو ساتھ غصہ بھی تھا، پیار بھی تھا جو سید آغا شہباز علوی کی زیرک نگاہوں سے

چھپا نہیں رہ سکا۔

”نہیں، نہیں، اذکار خبردار جو تم نے میری معصوم بچی کو ڈانٹا بھی ہو تو وہ ویسے ہی تمہارے غصے سے سخت ٹالاں رہتی ہے ڈرتی رہتی ہے میری پھولوں سی بچی نے بہت تکلیفیں سہی ہیں اوپر سے تم بھی اس کو کچھ کہو گے تو یہ اور پریشان ہو جائے گی سمجھانا پیار سے محبت اور آرام سے..... مگر غصہ نہیں کرنا نہ ہی ڈانٹا۔“ انہوں نے کڑے لفظوں سے سید اذکار علوی کو تنبیہ کی تھی۔

نرمی سے سکون سے سونی بریزے کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔  
”او کے جو حکم سرکار کا!“ وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا۔

”اب تم ایسا کرو بریزے بٹی کو بیدروم میں لے جاؤ اور آرام سے بیڈ پر لیٹا دو، میں جب تک ہم سب کے لیے اچھا سا کھانا بنواتا ہوں۔“

”جی دادو۔“ سید اذکار علوی بریزے کو اوپر بیڈروم میں لے آیا اور آرام دہ بستر پر لیٹا دیا تھا، خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بغور اس کے چہرے کے نقش کو اپنی گرے کانچ میں بھر کے دل میں اتارنے لگا تھا، یہ وہ چہرہ ہے جو اس کے دل میں بس گیا ہے اس کی محبت اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہے۔ وہ شدت سے اس کو چاہنے لگا ہے اس سے پیار کرنے لگا ہے اگر وہ پل بھر کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے دل پریشان ہو جاتا ہے۔ کبھی تو وہ سوچتا تھا کہ اتنی ٹف جاب کے باوجود یہی محبت کے حال میں اچھے گیئر محبت کی خوشبو ایسی ہی ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی ہر کسی کو اپنے حصار میں باندھ لیتی ہے قید کر لیتی ہے لاکھ پر پھڑ پھڑاؤ مگر یہ نکلنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ وہ جانتا ہے کہ بریزے کو محبت کی اب بھی نہیں آتی پیار و عشق کا مطلب نہیں جانتی محبت و چاہت کے کیا رنگ خوشبو ہوتی ہے وہ نہیں جانتی، وہ نہیں سمجھتی کہ محبت کا کھار کیا ہوتا ہے محبت میں جنون کیا ہوتا ہے مگر اس کو بریزے سے کوئی شکوہ گلہ کوئی شکایت نہیں، جس طرح محبت کی آگ میں وہ جل رہا ہے یقیناً ایک دن آئے گا کہ اس محبت اس عشق جنون کی تپش اس کی چنگاری ضرور اس تک پہنچے گی وہ ضرور محبت کے رگوں کو پہچانے گی اور جب پہچان جائے گی تو خود ہی محبت و پیار۔ چاہت و عشق کے قوس و قزح کے رگوں میں بسکینے کا دل چاہے گا اس بنجر زمین اس تپتے صحرا میں ایک دن ضرور پھولوں کی بارش ہوگی اور سید اذکار علوی اس ایک دن کا ضرور شدت سے انتظار کرے گا کہ جب وہ اس کے ہمقدم ساتھ ساتھ خوشنما وادیوں کی سیر کرے گی۔

سید اذکار علوی جھکا اور اپنے بے قرار دل کی صدا پر لبیک کہتا اس کی روشن پیشانی پر اپنے جنون کی ایک مہر ثبت کرتا چلا گیا تھا۔  
یہ دہکتا لکس یہ سلگتی تپش تھی یہ احساس تھا یا کچھ اور مگر بریزے کی آنکھ کھلی تھی وہ ہوش میں آئی تھی اور جو سب سے پہلے احساس جاگا شعور میں جو بات سب سے پہلے آئی وہ تھی اپنے پیردوں کی تکلیف... اپنا درد... وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔

”آہ!“ اس نے اپنے پیروں کو دیکھا جو تکلیف کی شدت سے موڑے بھی نہیں جا رہے تھے۔ ”بریزے کیا ہوا دروز یاد ہو رہا ہے۔“

تکلیف کی شدت سے اس کا بے انتہا خوبصورت چہرہ سرخ اناری ہو گیا تھا جیسے ابھی وہاں سے خون چھٹک پڑے گا، نیلے جھیل کانچ میں سمندر ٹھہاں مارنے لگا تھا اور جو سب سے بڑی اور اہم بات اس نے نوٹ کی وہ بھی

کہ تکلیف سے زیادہ وہ کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح خوفزدہ تھی اس کے چہرے پر جہاں درد کے آثار تھے وہیں اس سے کہیں زیادہ خوف تھا ایک ڈر تھا۔

”بریزے ڈر نہیں تمہیں کچھ نہیں ہوگا میں ہوں نا دیکھو معمولی سا تو زخم ہے دوا یاں لوگی تکلیف کم ہو جائے گی۔“

”نہیں وہ..... وہ مجھے بہت ڈانٹے گا..... اس نے کہا ہے کہ میرے جسم پر کہیں بھی کوئی نشان نہیں ہونا چاہیے..... سینے مجھے اس سے بچالیں مجھے وہ بالکل اچھا نہیں لگتا.....“ بریزے کے ہر عضو میں ڈر تھا وہ گھبرا رہی تھی سہم رہی تھی اس نے سیداز کار علوی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”تم کیا کہہ رہی ہو سک کی بات کر رہی ہو کون تمہیں ڈانٹے گا.... بریزے کھل کے بتاؤ مجھے دیکھو میری طرف!“ سیداز کار علوی نے اپنی چوڑی ہتھلیوں کے پیالے میں اس کا سندر چہرہ بھر لیا تھا۔

”سہد وڑا اچ!“ وہ بری طرح چونکا تھا، آج بھی بریزے اس غبیث کے خوف کے زیر اثر تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو تم بریزے۔“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں وہ مجھے بہت ڈانٹتا ہے کہتا ہے کہ میرے جسم پر ایک کھروچ بھی نہیں آنی چاہیے۔ آپ مجھے اس سے بچالیں گے نا مجھے اس سے بات نہیں کرنی۔“

کیلی جھیل آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے وہاں اس قدر گھبراہٹ اسناٹا تھا کہ پل بھر کے لیے تو سیداز کار علوی دنگ رہ گیا تھا، نفرت تو وہ ویسے بھی سہد وڑا اچ سے بہت کرتا تھا مگر اس لمحے اس نفرت میں مزید اضافہ ہوا تھا اور اتنا شدید غصہ آیا کہ دل شدت سے چاہا وہ اس پل سامنے ہو اور اس کا ایک ایک ریشہ الگ الگ کر دے جسم کے اتنے ٹکڑے کرے کہ قیامت تک گن نہ سکے مگر اچھا یہ نفرت بھی بڑھے گی بدلہ اور انتقام کی آگ اس سے زیادہ دہکے گی اس کی سزا میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا مگر فی الحال اس وقت بریزے کو سنبھالنا ضروری تھا۔

”ایک منٹ!“ سیداز کار علوی روم میں رکھے چھوٹے سے فریج کی طرف گیا یہ فریج بھی سید آغا شہباز علوی نے رکھوایا تھا اس کے لیے، اس کو اپنے کھانے پینے کا بالکل خیال نہیں رہتا تھا اس لیے سید آغا شہباز علوی نے یہی کہا کہ تم کچھ نہ کچھ کھاتے رہو جب اسے بیڈ روم میں رہو، فریج میں بہت سے فروٹس، چاکلیٹ، چپس جوس وغیرہ کا ڈھیر لگا ہوا تھا، سیداز کار علوی فریج میں سے فریش جوس نکال کر لے آیا جوس گلاس میں نکالا اور گلاس بریزے کے کپکپاتے ہونٹوں کی جانب بڑھایا۔

”پیو پہلے اسے۔“ سیداز کار علوی نے زبردستی اس کو سارا جوس پلا دیا تھا، بریزے کو تھوڑا سکون ملا تھا۔

”اب میری بات سنو، سہد وڑا اچ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ تم کو ڈانٹنے تمہارا بال بھی بیکا کر سکے تم تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے اس کو میرا مقابلہ کرنا ہوگا اور اللہ کا بہت بڑا کرم اور احسان ہے کہ اس نے مجھے اتنا مضبوط بنایا ہے وہ میرے ایک ہی وار میں ڈھیر ہو جائے گا۔“

”بریزے، سہد وڑا اچ تم تک کبھی نہیں پہنچے گا میں اسے تم تک پہنچنے ہی نہیں دوں گا۔“ گرے کا نج ان نیلے جھیل آنکھوں میں ڈال دیے۔

”جج..... آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“ ایک آس تھی امید تھی ایک سچائی کی رمت تھی ان نیلے جھیل میں۔

”سو فیصد سچ۔“ سیداز کار علوی نے شرارت سے اس کی ناک دبائی تھی۔

”اچھا ایک بات بتاؤ سہد وڑاچ تم سے روز بات کرتا تھا۔“  
 ”جی دن میں دوبار اور کبھی بھی تو نہیں کرتا تھا کئی دنوں تک۔“  
 ”تم نے اسے دیکھا ہے۔“

”نہیں لیپ ٹاپ پر اس کا کیمرہ آف ہوتا تھا صرف اس کی آواز آتی تھی اس کی آواز بہت ڈراؤنی اور بھاری لگی تھی مجھے کسی دیوہی مخلوق کی طرح۔“  
 ”کہتا کیا تھا وہ تم سے۔“

”کچھ نہیں بس ڈانٹا رہتا تھا اپنا بہت خیال رکھنا بہت زیادہ فروٹس کھایا کرو جس پیا کرو اور غلطی سے بھی تمہارے جسم کے کسی بھی حصے پر میں داغ یا کھرچ کے نشان نہ دیکھوں۔ سچ مجھے اس کی ایسی باتیں زہر لگتی تھیں مجھے نہیں پتا وہ ایسی باتیں میرے ساتھ کیوں کرتا تھا۔“ بریزے کے لہجے میں سہد وڑاچ کے لیے ناپسندیدگی بول رہی تھی۔

”سینا بانی تمہیں کچھ دکھاتی تھی میرا مطلب ہے ٹی وی وغیرہ کوئی فلم وغیرہ۔“ سید اذکار علوی اس سے کھلے لفظوں میں کچھ نہیں پوچھنا چاہتا تھا کیونکہ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ سہد وڑاچ کے حکم پر سینا بانی نے بریزے کو بیس سال تک کسی سیپ میں چھپے بیعتی موتی کی طرح سنبھال کے رکھا تھا باہر کی گندگی باہر کی آلودگی ماحول کی آزادی سے اس کو کوسوں دور رکھا تھا۔

”کیسی فلم؟“ وہ نا اچھی کی کیفیت میں اس کو دیکھنے لگی۔  
 اس کا مطلب ہے جو وہ سوچ رہا ہے وہ بالکل درست ہے مگر سہد وڑاچ کی باتیں وہ بریزے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ تو کیا وہ بریزے کو منہ مانگی قیمت میں..... اف میرے خدا..... سید اذکار علوی کی روح کانپ اٹھی تھی اگر بروقت سحر بانو کی مدد سے وہ بریزے کو اس جہنم سے نہیں نکال لیتا تو بہت بڑا نقصان ہو جاتا.... ”سہد وڑاچ تجھے میں نہیں چھوڑوں گا تو چاہے پاتال میں بھی چلا جائے کتنے کی طرح کھینٹ کے لے آؤں گا میں تجھے وہاں سے۔“  
 ”آہ.....“ بریزے کی تکلیف سے جان نکلنے لگی۔

”درد ہو رہا ہے بہت!“

انجکشن کا اثر ختم ہوا تو تکلیف اور درد محسوس ہوا، سید اذکار علوی نے اس کا پاؤں دیکھا۔  
 ”ابھی ٹھیک ہو جائے گا تم کچھ کھاؤ گی تو میڈیسن کھانا درد میں فرق آئے گا۔“ سید اذکار علوی کو اس کا درد اپنے اندر محسوس ہوا تھا اور پھر اس کو کچن کا وہ منظر یاد آیا۔

”اور ایک بات اور مجھے تم بتاؤ۔ یہ جب تم کو کچن کا کوئی کام آتا نہیں ہے تو تم کچن میں گھسی کیوں تھیں اور تم ایسا کر کیا رہی تھیں جو آگ اس قدر بھڑکی اور گرم تیل تمہارے پیروں پر گرے۔“  
 ”وہ جی میں نے نوری کو پکاتے ہوئے دیکھا تو میں بھی برز پر ہانڈی چڑھا کے پکانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔“ ڈرتے بھجکتے وہ بتانے لگی۔

”اور محترمہ پکا کیا رہی تھیں۔“

”میں نے ہانڈی میں گلاس بھر کے تیل ڈالا جب وہ اچھی طرح گرم ہو گیا تو میں نے فرنج سے نکال کے ٹھنڈا پانی تیل میں ڈال دیا۔“

”واٹ! پاگل ہوئی ہو کیا کھانا اس طرح کون بناتا ہے کچھ عقل ہے تم میں۔“ سید اذکار علوی تادیر اپنے بھڑکتے غصے برتاؤ نہیں کر پایا تھا، بریزے تو اس کے غصے اور اس پر پیچنے پر بری طرح ڈری تھی اور سہمی سہمی نظروں سے تنکے لگی اپنی تکلیف و جلن کی پرواہ کیے بغیر اس کو سامنے بیٹھا سید اذکار علوی کی فکر لگ گئی وہ جو تھوڑی دیر کے لئے بھول گئی تھی کہ سامنے کون بیٹھا ہے یاد آنے پر اپنی جان سولی پر لٹکتی دکھائی دی۔ اب سید اذکار علوی کے غیض و غضب اس کے قہر سے کون بجائے گا۔

”اذکار!“ اسی وقت سید آغا شہباز علوی نے قدم دھرا تھا انہوں نے سید اذکار کا غصہ کرنا بریزے پر چیخنا سن بھی لیا تھا اور دیکھ بھی لیا تھا۔

”دادو!“ بریزے نے دونوں ہاتھ پھیلائے مدد کے لئے ان کو پکارا۔

”میری جان میری بچی!“ وہ اس کے پاس آئے اور اس کو اپنے سینے میں چھپالیا۔

”ہوئیہاں سے میں نے تمہیں منع کیا تھا نا کہ میری معصوم بچی کو ڈانٹا نہیں۔“ انہوں نے سید اذکار علوی کو گھور کر دیکھا۔

”اپنی معصوم بچی سے پوچھئے کچن میں کیا کارنامہ انجام دے رہی تھی۔“ چھپی ہوئی بریزے کو وہ غصے سے دیکھنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی اتنی فکر اتنی پرواہ کر رہا تھا اور اب اس کی کی ذرا سی لاپرواہی پروہ بریزے پر غصہ کر رہا تھا۔

”اچھا بس تم جاؤ یہاں سے میں دیکھ لوں گا سمجھا دوں گا اپنی بچی کو کبھی کام نہیں کیا نا تو اس لیے کچھ پیہ نہیں ہے مگر تم نے اس پر غصہ کر کے اس کو ہراساں کر دیا ہے۔“ وہ خاموش ہو گیا، سید آغا شہباز علوی نے اس کو اشارے سے جانے کو کہا۔

”دادو آپ نے میری کیوں کردی ان سے شادی اب وہ مجھے اور ڈانٹتے رہیں گے۔“ بریزے منمنانے لگی تھی، سید آغا شہباز علوی کی دبی دبی مسکراہٹ اور نظروں کے ارتکاز میں اس نے سر تھوڑا اور اٹھا کے دروازے کے سائیڈ دیکھا تو جیسے جان مزید خشک ہو گئی سانس حلق میں آ گیا ہو کیونکہ سید اذکار علوی ابھی تک گیا نہیں تھا وہیں کھڑا تھا۔

”دادو!“ وہ پھر سے بولتی سید آغا شہباز کے سینے میں چھپ گئی۔ اس بار سید اذکار علوی بھی ہولے سے مسکرا دیا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

”میری بچی۔“ انہوں نے اپنے سینے میں چھپی بریزے کے بالوں میں بر شفقت بوسہ لیا تھا۔

☆.....☆

”کیا کر رہی ہو؟“ شبنم ہاتھ میں ڈرائی فردوس کی پلیٹ تھا سے سیتا بائی کے پاس آ گئی۔ سیتا بائی نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر سے اپنا پاندان کھول کے بیٹھ گئی۔

”خیریت کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ اس نے ایک بادام اپنے منہ میں ڈالا۔

”ہاں پریشان تو ہوں اتنے دن ہو گئے جانے یہ از ایلا اور ایتق کہاں جا کر مر گئے ہیں۔“

”ٹھیک تھمتی ہو میں بھی نوٹ کر رہی ہوں کافی دن ہو گئے از ایلا نظر نہیں آئی اور نہ ہی اس طوائف خانے کی زینت جتنے ایتق واحدی آیا۔ کیا پیہنی مومن کے لیے نور پر کسی باہر ممالک نکل گئے ہوں۔“ شبنم کا انداز اور لب و لہجہ نہایت عام سا تھا، سیتا بائی کو شک نہیں ہوتا تھا اس پر اور جب وہ شبنم کے خلاف کچھ کرنے کا سوچنے کی

کوشش بھی کرتی تو شبنم پیسوں سے اس کا منہ بند کر دیتی۔  
 ”نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے اگر ان دونوں کا ایسا کوئی پلان ہوتا تو از ایلا ضرور مجھ سے تذکرہ کرتی مگر تشویش کی بات پھر بھی ہے کہ آخردونوں اتنے دنوں سے کہاں غائب ہیں۔“ وہ پرسوج نظروں سے شبنم کو دیکھنے لگی۔  
 ”اور اس چارمنگ کی کیا خبر ہے کافی دن سے وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔“  
 ”کون؟ کس کی بات کر رہی ہے۔“

”ارے وہی از ایلا کا نام کروڑ کیا ڈینٹنگ پر سنائی ہے ظالم کی۔“  
 ”ڈینٹنگ پر سنائی تو تیرے اس ہیرو کی بھی ہے جو آج کل کی وی ہر چینل میں چھایا ہوا ہے۔“  
 ”تم بھینا ندیم بلوچ کی بات کر رہی ہو؟“ شبنم نے ڈرائی فروٹس کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔  
 ”ہاں میں ندیم بلوچ کی ہی بات کر رہی ہوں کافی ٹائم لے لیا اس نے تیرا، کہیں شادی وادی کا ارادہ تو نہیں ہے اس کا؟“ سیتا بانی ٹیکنکی سے ہنسی تھی، اس کے مکروہ چہرے پر ہر وقت خباثت ہی خباثت رہتی تھی اس کی سوچ اس کا دل گندہ تھا تو یہ گندگی یہ کروت چہرے پر بھی رہتے تھے۔

”سیتا بانی ہم جیسی کال گرل ان امیر بڑے رئیس زادوں کی راتیں رنگین تو بنا سکتی ہیں مگر ان کا گھر بسانے کی اجازت نہیں ہے، یہ پیسے روپے تو ہم پر لٹا سکتے ہیں مگر اپنی زندگی کا ہمسفر بنانے میں یہ بے عزتی محسوس کرتے ہیں، اس کا روبرو زندگی میں نقصان تو ہم جیسی کال گرل کا ہی ہوتا ہے جو اپنا نفس، نسوانیت، عزت و آبرو، اپنا جسم تک ان درندوں، جانوروں کے سپرد کر دیتی ہیں اور یہ کیا کرتے ہیں، نوچنا کھوڑنا، درندگی، وحشانہ طریقے سے استعمال کرنا ہمارا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں ہمارے جسم میں دل نہیں پتھر ہے، ہونہہ!“ شبنم طنزیہ ہنسی ہنسی تھی۔

”وہ تو شکر ہے کہ روح پران درندوں جانوروں کا بس نہیں چٹا ورنہ یہ تو اس کو بھی نہ چھوڑیں۔“  
 ”تو کچھ بھی کہہ لے، سوچ لے مگر ان سب میں فائدہ تو ہمارا ہے تو مجھے پیسے دیتی ہے، میں خوش ہوں تجھ سے، باقی سب میں کچھ نہیں جانتی۔“ سیتا بانی نے دونوں ہاتھ اٹھا کے خود کو ان بچاری لڑکیوں کے زخموں سے خود کو بری الذمہ کر دیا تھا۔

”ٹھیک کہتی ہے، تجھ جیسی عورت جب اپنی سگی بیٹی کا سودا کر سکتی ہے تو اس کے لئے اور لڑکیوں کا سودا کرنا کیا بڑی بات ہے۔“ شبنم کی سوچ زہریلی ہونے لگی تھی۔

”اچھا تو ان سب کو چھوڑ، کل تو نے مجھے پیسے نہیں دیے، کیا ندیم بلوچ کی جیب خالی تھی کل یارات تو نے اس کو صحیح سے چھایا نہیں۔“

”ہاں! وہ کہہ رہا تھا آج دے گا۔“  
 ”ویسے ایک بات تو اتنی پڑے گی، تجھ میں از ایلا سے زیادہ خوبصورتی ہے، از ایلا جو کام نہیں کر سکی وہ تو نے کر دکھایا، ندیم بلوچ فلم انڈسٹری کا مغرور ترین ایکٹر ہے، کچھ تو بات ہے تجھ میں جو وہ تجھ پر تیری اداؤں کے جال میں پھنسا ہے، تیرے حسن پر پھنسا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کچھ ان کم بختوں کو بھی سکھا کہ کیسے ان امیر زادوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنساتے ہیں، ان کی جیبیں خالی کرتے ہیں۔“

وہیں اس طوائف خانے کی ایک اور لڑکی روٹی لٹکی مٹتی آئی اور شبنم کے برابر میں آ بیٹھی۔ سیتا بانی نے اس کو بری طرح گھورا تھا۔

”بھئی اب میں کیا کر سکتی ہوں جب شاہ صاحب مجھ پر پھسلے ہیں۔“ روٹی بے ہنگم طریقے سے ہنستی ہوئی سیتا



ہائی کو ایک آنکھ مار کے ٹیبل پر رکھی ڈرائی فروٹس کی پلیٹ اٹھا کے بولی۔  
 ”ہاں یہ بول تجھ میں وہ بات ہی نہیں، وہ ادا ہی نہیں جو اپنی شبنم میں ہے۔“ سنیتا بانی نے شبنم کو جانتا نظر وں سے دیکھا اور ہاتھوں سے بلا لیں۔

”بھئی اپنی شبنم کی تو بات ہی الگ ہے، جب یہ ندیم بلوچ کو عاشق بنا سکتی ہے تو سہد وڑائچ کو اپنے حسن کے جال میں پھنسانا کون سا مشکل ہے، وہ تو دانی میں ہاتھ کا کھیل ہے اپنی شبنم کے لئے۔“ سہد وڑائچ کے نام پر شبنم نے نہایت چومک کر ڈرائی فروٹس کھاتی روٹی کو دیکھا تھا۔  
 ”ہاں کیوں نہیں، بشرطیکہ وہ سامنے تو آئے، ویسے سنیتا بانی کہاں ہے سہد وڑائچ، کوئی فون وغیرہ نہیں آتا؟“ شبنم نے ایک پستہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ارے کل ہی تو آیا تھا سہد وڑائچ کا فون، وہ کراچی آیا ہوا ہے۔“

”بکو اس مت کر، تجھے کیسے پتہ سہد وڑائچ کراچی میں ہے۔“

”کیوں تو کل فون پر سہد وڑائچ سے بات نہیں کر رہی تھی۔“ روٹی نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو مزید چھوٹا کر کے سنیتا بانی کو دیکھا تھا۔

”ہاں بس اپنی کن سونیوں میں گھسی رہا کر، ادھر ادھر کان لگا کر کبھی اس کی سن لے، کبھی اس کی.... کام تو تجھ سے ہوتا نہیں ہے۔“ سنیتا بانی نے بری طرح جھڑکا تھا اس کو۔

”چھوڑو نا سنیتا بانی، بتاؤ نا کہاں ہے سہد وڑائچ، میری بھی ملاقات کراؤ، میں ملنا چاہتی ہوں سہد وڑائچ سے۔“ شبنم سنیتا بانی سے اگلوٹا چاہتی تھی مگر وہ بھی ٹھس تھی بول کے نہیں دے رہی تھی۔

”تجھے بڑی بے چینی ہے سہد وڑائچ سے ملنے کی۔“ اچانک ہی سلیمان کی بھاری آواز پر تینوں نے دروازے کی جانب دیکھا تھا۔ سلیمان چلتا ہوا سنیتا بانی کے پاس رہ گئی پر بیٹھ گیا، وہ اس قدر بھدا مونا تھا کہ بشکل اس کرسی پر آیا تھا۔ اس کی رنگت اس قدر گہری تھی اس پر مونے ہوٹ، مونا ناک اور ہونٹوں کے اوپر یہ گولڈن ٹھنی ٹھنی موچھیں بڑی بڑی لال آنکھیں اور تو اور بال بھی گولڈن ہی ڈائی کرائے ہوئے تھے، وہ کوئی افریقہ کا حبشی جن ہی معلوم ہو رہا تھا، روٹی کو تو جیسے ابا کی آگئی اس کو دیکھ کر۔

”اور سلیمان تجھے کس نے کہا ہے یا مشورہ دیا ہے کہ تو اپنے بال رنگ لے، اوپر سے تیری رنگت اس قدر سیاہ، اوپر سے تو نے بال اور موچھیں بھی گولڈن کلر میں ڈائی کرائیں۔ میرا تو خیال ہے رات میں لڑکی کو تو کلوروفارم سے کیا بے ہوش کرتا ہوگا، وہ تو اندھیرے میں تجھے دیکھ کر ہی خود ہی بے ہوش ہو جاتی ہوں گی۔“ روٹی نے ایک منٹ میں اس کے جسم، اس کی شکل کا پورا جغرافیہ سمجھ لیا تھا۔

”سنیتا بانی ایک کام کر، آج رات اس روٹی کی بچی کو میرے پاس بھیج دے پھر اس کو بتاؤں گا کہ کون ہوش میں رہتا ہے کون بے ہوش۔ ویسے بھی اس سے کوئی کام ڈھنگ سے تو ہوتا نہیں ہے۔“ سلیمان نے نہایت گھور کے روٹی کو دیکھا تھا۔

”نا بابا نا، تو تو مجھے معاف ہی کر، تو تو ویسے بھی دیکھنے میں جنگل سے بھاگا کوئی جانور لگتا ہے۔ تیرے ساتھ کوئی لڑکی کیا رات گزارے گی۔“ روٹی تو جھٹ کھڑی ہو گئی کہ کہیں سنیتا بانی اس کا ہاتھ پکڑے اس کے درندے کے ہاتھ میں ہی نہ پکڑا دے۔ وہ ٹھہری دہلی پٹلی کمزوری، اس ساٹھ کا مقابلہ کہاں کر پائے گی۔

”روٹی چل دفع ہو جا یہاں سے ورنہ ایک جھانپڑ ماروں گی، دنوں بستر پر مری پڑی رہے گی۔“ سنیتا بانی نے

غصے سے کہار و بی نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

”ہاں سلیمان بول، کیسے آتا ہوا؟“

”لڑکیاں لایا ہوں، سوز و کی میں بے ہوش پڑی ہیں۔ اپنے لوگوں سے بول نکال لیں۔“

”زیادہ عمر کی تو نہیں ہیں نا؟“

”ارے سنیتا بانی تو جانتی تو ہے جو مزہ کلی کو سننے میں ہے وہ مزہ پھول کی پتی توڑنے میں کہاں۔“

”چل ٹھیک ہے۔ تجھے تیرے پیسل جا میں گے۔“

”اور شبنم تو سنا، بڑے چرچے ہو رہے ہیں تیرے بیوی پر اس ندیم بلوچ کے ساتھ۔ بڑی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے تو نے تو۔ تو تو از ایلا میڈم سے بھی نمبر لے گئی۔“ سلیمان نے نہایت گندی اور گھٹیا نظروں سے اس کے جسم کے ہر حصے کا پوسٹ مارٹم کر لیا تھا۔ شبنم کا دل شدت سے چاہا اس کی آنکھوں میں تیزاب ڈال دے، اس کے مونٹے بھدے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوڑوں کو کھلا دے، اس کا چہرہ نوچ لے مگر وہ یہ سب سوچ سکتی تھی، کرنا اس کے بس میں نہیں تھا، اس لئے زہر کا گھونٹ پی گئی۔

شبنم نے اس کی طرف سے منہ ہی پھیر لیا تھا، وہ اس خبیثت کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔

”ہائے شبنم! تیری تو ہر ادا پر میں جاننا جاؤں، تیری یہ نزاکت، یہ حسن بھی ہمیں بھی موقع دے اپنی ناز برداریاں اٹھانے کا، سچ پلکوں پر بٹھاؤں گا، کاچ کی گڑیا کی طرح تجھے سنبھال سنبھال کے پیار کروں گا۔“ سلیمان کا بس نہیں چل رہا تھا اور نہ ایک ہاتھ بڑھا کر شبنم کو پیچنے کے اپنی گود میں بٹھا لیتا۔

”میں کتوں کے منہ نہیں لگتی، ان کا کام بھولنا ہوتا ہے جو اس وقت تو گریہ رہا ہے۔“ شبنم کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا، وہ سختی ہوئی کھڑی ہو گئی، اس کی شکل دیکھ کر ہی شبنم کو گھن آتی تھی، یہ سب سنیتا بانی چپ چاپ دیکھ رہی تھی اور مسکرائے جا رہی تھی۔

”مجھے تیری باتوں کا طعنی برا نہیں لگتا، وہ کہتے ہیں نا کہ محبوبہ کی تو گالی بھی تالی لگتی ہے، تیرا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“

”ہونہر۔“ شبنم نفرت سے دیکھتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی اور سلیمان شبنم کو لپٹائی نظروں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

”ہائے مر جاواں۔“ وہ شیطانوں جیسی ہنسی ہنستے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کے جھکا تھا۔

”تو بھی نا ایک نمبر کمبند ہے۔“ قہقہہ تو سنیتا بانی نے بھی لگایا تھا۔

”جب وہ تجھے منہ ہی نہیں لگاتی تو کیوں اسے پھیڑتا ہے۔“

”سچ بولوں تو سنیتا بانی بڑا مزہ آتا ہے اس کو چھیڑنے میں۔ بارہ سال کی تھی جب میں اس کو اٹھا کے لایا تھا، آج دیکھو کیا جوانی نکالی ہے سال نے، بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے جو میں نے اس کو تیرے حوالے کر دیا۔ اس کو تو مجھے ہی اپنی ساتھ اڈے پر رکھنا چاہئے تھا، میری تو ہر رات ہر دن رنگین گزرتا۔“ سلیمان کی نظروں میں ابھی بھی شبنم کا سراپا گھوم رہا تھا۔

”اچھا اچھا، تو فکر مت کر، یہ ذرا ندیم بلوچ کو چھوڑ دے تو اٹھا لے جانا اس کو زبردستی، منالینا ایک ہفتے تک اس کے ساتھ بنی مولن۔“

”سچ! سنیتا بانی تو مکرے گی تو نہیں؟“ سلیمان کی تو باغچیں کھل گئیں۔ وہ بڑی مشکل سے کرسی سے اٹھا اور سنیتا

ہائی کے پاس جا بیٹھا۔

”ہاں ہاں، یہ سنیتا ہائی کا وعدہ ہے۔ چل اب اس کو چھوڑ یہ بتا ائینق کا کچھ پتہ چلا؟“ اس نے پاندان سے ایک پان نکال کر اپنے منہ میں ڈالا اور دوسرا سلیمان کے لئے بنایا۔

”ہاں پتہ چل گیا ہے، وہ دہئی میں ہے اور بڑے مزے میں ہے۔ اب اس سے آگے انہوں نے کچھ بھی بتانے کو سختی سے منع کر دیا ہے، اس لئے نہ میں نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا۔ ہاں ازا ایلا کا بس اتنا بتایا ہے کہ وہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔“ سنیتا ہائی کے ہاتھ سے پان لیتے ہوئے منہ میں ڈالا اور انگلی اپنے گولڈن بالوں میں صاف کر دی۔

”ائینق واحدی دہئی میں ہے اور اگر ازا ایلا اس کے ساتھ نہیں ہے تو ازا ایلا کہاں ہے؟ سلیمان اپنی ازا ایلا کہاں ہے؟ مجھے تو اب فکر ہو رہی ہے۔“

”یہی بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ ازا ایلا میڈم کہاں ہیں۔“ سلیمان ایک ٹک دیوار پر دیکھ رہا تھا۔

”یہ مجھے کیا ہوا، تو کیوں بت بن گیا ہے۔“ سنیتا ہائی نے سوچتے ہوئے سلیمان کے ایک ہتھو مارا۔

”سنیتا ہائی کہیں ازا ایلا میڈم اس آفیسر کے ساتھ تو نہیں چڑھ گئیں؟“

”کون آفیسر؟“

”ارے وہی سید اذکار علوی۔“

”او، پاگل تو نہیں ہو گیا ہے، اللہ نہ کرے جو اس جلا دآفیسر کے ہتھے چڑھ جائے، تجھے پتہ ہے بہت خطرناک اور ظالم آفیسر ہے وہ... تو... جا... جا... جا... جا کر پتہ کر۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہو گیا تو بہت برا ہوگا۔ مجھے تو عابد جوفا کا بھی اسی پر شک ہے، دیکھ لے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا اس کا بھی۔ سلیمان تو جا جلدی سے پتہ کر۔ وہ سید آغا

شہباز علوی کا پوتا ہے، کوئی عام بات نہیں ہے۔“ سنیتا ہائی کو اپنی جان نسولی پر لگتی دکھائی دی تھی۔

”ٹھیک ہے میں نکلتا ہوں پھر۔“ سلیمان وہاں پھر بل بھر کے لئے نہیں رکھا تھا، سنیتا ہائی نے آئی جی، گورنر کو

فون ملانا شروع کر دیا تھا۔

☆.....☆

”یہ تو ضرور صاحب آپ پر منحصر ہے کہ آپ کو ہماری مشنری کا کام کیسا لگتا ہے، ہم لوکل تو کچھ نہیں بناتے،

ہمارا سارا کام ایپورنڈ ہی ہوتا ہے، ہمارا میٹرل بھی باہر سے منگوایا جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ کو اپنا میٹرل لگوانا

ہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، کیڑا ہمارا ہوگا، میٹرل آپ کا اور کام ہمارا۔ آپ دیکھ لیجئے گا آپ کو کوئی شکایت نہیں

ہوگی۔ ویسے ہماری کمپنی کی پروگریس کے بارے میں تو آپ جان ہی چکے ہیں۔“ عفان ترندی نے تفصیل سے

اپنی کمپنی کے بارے میں سب بتایا تھا۔

”جی مسٹر عفان ترندی، ہم ایسے ہی کسی کمپنی کو کنٹریکٹ نہیں دے دیتے، پوری چھان بین کرتے ہیں،

جانتے ہیں، پہچانتے ہیں، پرکھتے ہیں، پھر ہم ڈیل کرتے ہیں۔ مجھے پاکستان آنے ابھی کچھ ہی ماہ ہوئے ہیں۔

پاکستان کے ہر شہر کے بارے میں جانتا ہوں، ہر کمپنی کی معلومات ہے مجھے مگر فی الحال کراچی میں مجھے آپ اور

عسکری کمپنی زیادہ بہتر لگے۔ یوں کہنا زیادہ اچھا ہے کہ میرے مزاج جیسی ہے۔ ایک کمپنی سے ڈیل کرنا صرف

اس کے اوپر یا اس سے ڈیل کرنا ہی مقصد نہیں ہے، ہمیری لاجبک بہت الگ ہے مسٹر عفان! آپ کو عجیب لگے گا

مگر میرے لئے کمپنی کے ورکرز کی بھی بہت اہمیت ہے۔ میں ان کے بارے میں بھی معلومات رکھتا ہوں چاہے

وہ نیچر ہے یا پھر چوکیدار، بیون.... میرے لئے یہ سب ضروری ہے۔ جب کمپنی کا کنٹریکٹ دینا ہی مقصود ہے، ان سے ذیل کرنا ہی ہے تو ہر چیز کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔“

”میں نے اب تک بہت کنٹریکٹ لیے ہیں، ڈیلی کیشن پاس کئے ہیں مسٹر ضورف سنگھانیا! مگر واقعی آپ ان سب ڈیلی کیشن اور کمپنی سے بہت الگ ہیں، بڑا مزہ آئے گا اور بہت اچھا بھی لگے گا آپ کے ساتھ کام کرنا۔“ عفان ترندی نے دل سے ضورف سنگھانیا کی تعریف کی تھی۔

”تو پھر آپ کو ہماری کمپنی سے کوئی شکایت نہیں ملی؟“ ضورف سنگھانیا نے خوش دلی سے کہا۔

”آل رائٹ، ایسا ہے کہ کل رات کا ڈز مینٹنگ سمیت ہم ”لال قلعہ ہوٹل“ میں رکھ لیتے ہیں۔ اس طرح میں، آپ اور چوہدری قصیر عسکری وہیں مزید مینٹنگ کر لیں گے، آپ کا کیا خیال ہے؟“

”بہت نیک خیال ہے، آپ لوگ وہاں پہنچ جائیے گا، میں یہاں سے پہنچ جاؤں گا۔“ ضورف سنگھانیا نے عفان ترندی کی بات کی تائید کی تھی۔

”اچھا عفان ترندی، آپ کے بیٹے بھی اگر اس مینٹنگ میں شامل ہو جائیں تو اچھی بات ہوگی۔“

”جی بہت اچھی بات ہوگی۔“ حیدر کمپنی کے اور حیدر ترندی سے آپ کی ملاقات ہو جائے، اچھی بات ہے۔ ایکٹو کی انہوں نے ماڈلنگ کے شعبے کو جوائن کر لیا ہے تو وہ آج کل اسی میں مصروف ہیں اس لئے آج کل آفس کو ذرا کم ٹائم دے رہے ہیں۔“

”ہوں... تو ماڈلنگ ٹی وی کے پروفیشن میں بھی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں۔“ ضورف سنگھانیا ہولے سے مسکرا دیا تھا۔

”یہی سمجھ لیجئے۔“

”گڈ! یہ بھی بہت اچھی بات ہے۔ بہت نام سنا ہے حیدر ترندی کا، کمپنی اور بزنس کے حوالے سے بے تاج بادشاہ مانے جاتے ہیں وہ بزنس کی دنیا میں۔ ایسے لوگوں سے بلکہ یوں کہیے کامیاب لوگوں سے ملنے کا مجھے بہت شوق ہے، بہت پسند کرتا ہوں میں کامیاب، ذہین لوگوں سے ملنا۔“

”ارے آج تو میرا بیٹا گھر میں ہی ہے۔ آپ یوں کریں بات کر لیجئے فون پر۔ پھر انشاء اللہ کل ملاقات کا شرف بھی مل جائے گا۔“

”لیس شیور!“

”جسٹ اے ون منٹ۔“ عفان ترندی اپنی چیئر سے کھڑے ہوئے اور سبکدین حیدر ترندی کے بیڈروم کی سمت جانے لگے تھے۔

انہوں نے سبکدین حیدر ترندی کے بیڈروم کا دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ سبکدین حیدر ترندی نے ہی کھولا تھا، بیڈر ہاتھ میں ریسمٹ لئے غنوی سلو آواز میں کوئی انگلش مووی دیکھ رہی تھی۔

”جی پایا کہیے، کوئی کام تھا؟ مجھے بلوالیا ہوتا۔“

”کچھ خاص کر رہے تھے؟“

”نہیں بس لیپ ٹاپ پر فائل چیک آؤٹ کر رہا تھا، آپ کو کوئی خاص کام؟“

”ہاں! ضورف سنگھانیا کا فون ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں اور کل رات مینٹنگ پلس ڈز بھی فائل ہوئی ہے۔ تم یوں کرو بات کر لو پہلے۔“ عفان ترندی نے اپنا فون اس کے آگے بڑھایا۔

”او کے“، سبکٹین حیدر ترمذی نے فون لے لیا۔

”اچھا آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر تو آئیے۔“ اس نے راستہ دیا۔

”نہیں، تم بات کرو، میں جب تک تمہاری ماما سے چائے کا کھہہ کراتا ہوں۔“ وہ حطے گئے تھے۔

”جی صوف سنگھانیا کیسے ہیں آپ؟ آپ کے بارے میں بہت سنا ہے۔“ سبکٹین حیدر ترمذی کان سے

بیل فون لگائے اندر داخل ہو گیا تھا۔

”سنا تو میں نے بھی آپ کے بارے میں بہت ہے، تو کیا میں امید رکھوں اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا

وقت نکال کر کل ”حیدر کمپنی“ کے اوپنسر حیدر ترمذی ہم سے میٹنگ میں مل رہے ہیں۔“

”ییس آف کورس.... ہم کل....“

ٹی وی کے فل والیوم نے سبکٹین حیدر ترمذی کی آواز اسی میں گم کر دی تھی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ ٹی

وی اسکرین پر نہایت ہی کوئی بے ہنگم ڈانس اوپر سے پنجابی گا نا۔ سبکٹین حیدر ترمذی نے ٹی وی کے ریموٹ کی

مالک غنوی کو دیکھا جو ہاتھ میں ریموٹ لئے مسکرا رہی تھی۔ عجیب سی تھی اس کی مسکراہٹ جیسے وہ یہ سب جان کر

کر رہی ہو اور اگر اس کا مقصد سبکٹین حیدر ترمذی کو زچ کرنا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ٹھہری تھی، سبکٹین

حیدر ترمذی نے کان سے بیل فون ہٹایا۔

”غنوی ٹی وی کا والیوم سلو کرو۔“

مگر غنوی ہی کیا جو سن لے۔ وہ ڈھیٹ بنی رہی، ایسا لگ رہا تھا دنیا میں جیسے وہ ایک اسی کام کے لئے ہی تو

آئی ہے جیسے زندگی میں اس سے اہم کوئی کام نہیں ہے۔

صوف سنگھانیا تک بھی اس نے ہنگام میوزک کی آواز جا رہی تھی، مگر اس میوزک کی وجہ سے وہ سبکٹین حیدر

ترمذی کی آواز سن نہیں پا رہا تھا، سبکٹین حیدر ترمذی جھنجھلاتا ہوا آگے بڑھا اور مصروف سی غنوی کے ہاتھ سے

ریموٹ چھین لیا تھا، غنوی نے لمحہ ضائع کئے بنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”سبکٹین، ریموٹ دیں مجھے۔“

مگر مقابل بھی سبکٹین حیدر ترمذی کھڑا تھا، پہاڑ جیسا وجود، بھلا وہ نازک سی کہاں اس تک پہنچتی، سبکٹین

حیدر ترمذی نے وہ ریموٹ والا ہاتھ اونچا کر لیا تھا۔ غنوی بیڑ پر ہی کھڑی ہو گئی تھی اور اپنا ہاتھ اس کے بلند ہاتھ

تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ وہ اس سے نفرت کی وجہ سے اس قدر سبکٹین حیدر ترمذی کے قریب ہو گئی

تھی کہ یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ ان کے بیچ لمحہ بھر تک کا فاصلہ مٹ چکا ہے، خوشبوؤں جیسا وجود مکمل سبکٹین حیدر

ترمذی کے قریب تھا، بہت پاس تھا اور اس خوشبوؤں جیسے وجود کے لئے تو وہ ایک دنیا، ایک جہاں تیاگ سکتا تھا،

ایک کائنات کو فراموش کر سکتا تھا، اس کا دل خوشنما انداز میں دھڑکا تھا، چہرے کی جھنجھلاہٹ پل بھر میں غائب

ہو گئی تھی۔ صوف سنگھانیا اس کے لئے اتنا اہم نہیں ہے، اس کی میٹنگ، اس سے بات کرنا اتنا ضروری نہیں ہے

جتنا اس وقت اپنی محبت و چاہت، اپنی عشق و جنون کا ساتھ ہے۔ یہ پل بھر کا دلکش لمحہ ضروری ہے۔ سبکٹین حیدر

ترمذی نے فون آف کر کے سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔ غنوی کی نفرت شدید ترین نفرت اس قدر شدت پر تھی کہ وہ ہر

احساس سے عاری تھی۔ اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ غنوی کی اس قدر زردی کی سبکٹین حیدر ترمذی کو کس قدر زبردل

رہا تھا۔ وہ ان پلوں اور دلکش لمحوں کو اپنے دل میں قید کر رہا تھا۔ غنوی نے بہت دیر بعد اس کے چہرے پر نظری تو

اس کو اپنی سنگین غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ وہاں جھنجھلاہٹ کی جگہ ایک شرارت سی بھری پر شوخ

مسکراہٹ تھی، گلاسز کے پیچھے چھپی ان ذہن آنکھوں میں چمک سی دوڑ رہی تھی جیسے وہ غنویٰ کی اس حالت سے جی بھر کے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

غنویٰ نے اب اپنی پوزیشن پر غور کیا، اس کا ایک ہاتھ سبکٹین حیدر ترمذی کے کسرتی شانے پر رکھا تھا تو دوسرا ہاتھ ہوا میں اوپر کی جانب معلق تھا۔ وہ سبکٹین حیدر ترمذی کے بے حد نزدیک تھی۔ غنویٰ بری طرح جھنجھلائی تھی اور اسی جھنجھلاہٹ میں آکر وہ جلد بازی سے سبکٹین حیدر ترمذی سے الگ ہو کر بیڈ سے نیچے اترا ناچا ہتی تھی۔ وہ شاید بیڈ سے منہ کے بل گر رہی جاتی گر بروقت سبکٹین حیدر ترمذی نے اس کی اس نازک مرمیں کمر سے پڑ کے نیچے نہ اتارا ہوتا۔

”ہاؤڈیز یو! تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی۔“ غنویٰ صحیح معنوں میں بری طرح بد کی تھی۔ اس کا خون لاواہن کر شریانوں میں دوڑنے لگا تھا۔ غصے نے تو جیسے اس کے اندر مضبوط گھر ہی بنالیا تھا۔

”میرا تو خیال ہے پچھلے پندرہ منٹ سے آپ یہ کام کر رہی ہیں۔“ اس دوران سبکٹین حیدر ترمذی نے ٹی وی کا والیوم قدرے کم کر دیا تھا۔ سبکٹین حیدر ترمذی کا جملہ اور اشارہ وہ اچھی طرح سمجھ لیتی تھی مگر اس کے آگے ہتھیار ڈالنے کا مطلب تھا بار جانا اور وہ سبکٹین حیدر ترمذی سے قطعی طور پر ہار ماننے والی نہیں تھی۔

”مجھ سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مسٹر سبکٹین!“

”مگر جان سبکٹین، ہم کو تو یہ برمت قانون اور شرع کی طرف سے مل چکا ہے۔“

سبکٹین حیدر ترمذی اس سچویشن کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہا تھا۔ اس کو غنویٰ سے بات کرنا، غنویٰ کی تنکار، بحث کرنا سب اچھا لگ رہا تھا، وہ اس وقت اس طرح کھڑا اس کی انجمن اور جھنجھلاہٹ کو انجوائے کر رہا تھا جیسے بہت فرصت ہی فرصت ہے۔ غنویٰ صرف گھور کے رہ گئی۔ وہ تو اس کو چڑاتا چاہتی تھی اس کو جان کر غصہ دلانا چاہتی تھی مگر اس بار بھی بازی ہلت گئی۔ سبکٹین حیدر ترمذی کے مطمئن اور پرسکون انداز نے نہ صرف بلکہ اس کی باتوں نے بھی غنویٰ کو سرتاپا سلا کے رکھ دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دیکھتے انکارے پر برہنہ پاکھڑی ہے۔ اس کے عزائم پست کیوں ہو رہے ہیں۔ کیوں وہ اس سے ہار رہی ہے۔

”نہیں.... ہر بار اس طرح نہیں ہوگا۔“

”کچھ اور پلاننگ سوچ رہی ہو میرے خلاف؟“

پر سوچ سی غنویٰ کے کانوں میں دھیمی سی سرگوشی ابھری تھی۔ وہ جو سبکٹین حیدر ترمذی کے خلاف سوچ رہی تھی، اس کی دھیمی سرگوشی نے اس کو چونکا دیا تھا۔ ان مغرور آنکھوں میں سبکٹین حیدر ترمذی نے اپنا عکس دیکھا تھا۔

”چلو جو بھی ہے مگر میں مطمئن ہوں کہ تم میرے بارے میں تو سوچ رہی ہو۔ آج نفرت بھری سوچ ہے کل محبت سے سوچو گی۔“

”اور وہ کل زندگی بھر نہیں آئے گا۔ آپ کی یہ خوش فہمی، خوش فہمی ہی رہ جائے گی۔“ بہت تنکٹا ہوا جواب اس کے منہ پر مارا تھا۔

”اور اگر آگیا تو؟“

”چیلنج کرتی ہوں۔“

”سوچ لو، ہار جاؤ گی۔“

”غنویٰ خاقان ترمذی نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وہ ہمیشہ ہر میدان میں جیتی ہے پھر تو یہ زندگی کی بازی ہے، اس



کی نفرت کی بازی ہے اور غنویٰ خاقان ترمذی مٹ سکتی ہے، ٹوٹ سکتی ہے مگر جھک نہیں سکتی۔ یہ میرا آپ نے وعدہ ہے۔“ سبکتگین حیدر ترمذی نے براہ راست اس کی مغرور آنکھوں میں دیکھا تھا جہاں چٹانوں جیسی تختی تھی۔ اپنا وعدہ پورا کرنے کا یکا غزم۔ سبکتگین حیدر ترمذی تادیران مغرور آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بڑی سہولت سے اس نے غنویٰ کا نازک بازو پکڑ کر خود سے قریب تر کیا اور جھک کر اپنی ذہین آنکھیں ان مغرور آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ”اور میرا بھی وعدہ ہے کہ سبکتگین حیدر ترمذی نہ تو اپنے پیار کو ٹوٹنے دے گا نہ مٹنے اور نہ ہی جھکنے دے گا۔ دوسری صورت میں صرف یہ ہوگا کہ تمہارا رخِ شوخ جیسا نازک وجود میری مضبوط بانہوں میں ہی مہکے گا۔ بہت جلد انشاء اللہ تمہیں میرے پیار، میرے جنون، میرے عشق کا ادراک ہو جائے گا، احساس ہو جائے گا۔ ابھی بھلے ہی ہمارے دل دو الگ الگ ستوں کی طرف سانس لے رہے ہیں مگر بہت جلد یہ دو دل ایک ہی کشتی کے مسافر ہوں گے۔“

”ہونہہ۔“ غنویٰ نے نفرت سے خود کو اس کے مضبوط پے شکنجے سے چھڑایا تھا اور نہایت طنزیہ مسکراہٹ طنزیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی وہ اس سے فاصلے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔

”ہمارے بیچ نہایت مضبوط اور طاقتور فیصل دیوار کھڑی ہے مسٹر سبکتگین، جو کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ آپ کی ساری فلاسفی دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

سبکتگین حیدر ترمذی نے ایک گہرا سانس لیا اور ہولے سے مسکرا دیا۔ وہ کچھ جواب میں کہتا کہ دروازے پر ناک ہوا۔ سبکتگین حیدر ترمذی کے ”نیں“ کہنے پر ملازم اندر داخل ہوا تھا۔

”سبکتگین صاحب! آپ سے رجاء بی بی اور ندیم صاحب ملنے آئے ہیں۔“ ملازم نے نہایت ادب و احترام سے سر کو جھکائے بتایا تھا۔

”اوکے! میں آتا ہوں۔“ ملازم چلا گیا تھا۔

”اوکے ڈیر، بانی کی بحث بعد کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ ویسے ایک بات اور کہوں گا کہ تم غصے میں بہت خوب صورت لگتی ہو، بالکل اپنی اپنی سی۔“ سبکتگین حیدر ترمذی آگے بڑھا اور بنا اس کے غصے کی پرواہ کئے اس کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھا کہ اس کی کھری مغرور ناک آہستہ سے دبا تا وہاں سے نکلنا چلا گیا تھا کیونکہ وہ

جانتا تھا اگر وہ رکا تو ایک نئی جنگ شروع ہو جائے گی۔

”یو فو!“ سبکتگین حیدر ترمذی کے تیزی سے نکلنے اور اچانک سے اس کی ناک دبانے پر غنویٰ بری طرح سلگی تھی اور غصے کے عالم میں کشن اٹھا کے دروازے پر دے مارے تھے۔

”السلام علیکم!“ نہایت بشتا بشت بھرا لب و لہجہ، فریٹس سا انداز تھا سبکتگین حیدر ترمذی کا۔ رجاء صدیقی اور ندیم بلوچ ہال میں بیٹھے اسی کا ویٹ کر رہے تھے۔

”علیکم السلام! شکر ورنہ میں تو کبھی تھی کہ آج تم میرے سر پر اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے، شو پیسر وغیرہ توڑ دو گے۔“ رجاء صدیقی نے اس کے بشتا بشت بھرے لب و لہجے کو نوٹ کر لیا تھا۔

ندیم بلوچ سے مصافحہ کرتے ہوئے وہ وہیں بیٹھ چکا تھا۔

”وہ کس لئے؟“

غنویٰ سے پیار بھری، غصے بھری تکرار کر کے وہ بہت پرسکون تھا اور یہ بحث و تکرار اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ ٹائم کا پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ گھڑی میں اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔

”کیوں ہم رات کے ساڑھے گیارہ بجے تمہارے گھر آدھکے ہیں۔“  
 ”اچھا“، بکنگٹین حیدر ترمذی نے اپنے موبائل میں ٹائم دیکھا جہاں ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔  
 ”اتنا ٹائم ہو گیا ہے اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔“ وہ سوچ کر رہ گیا۔

”اگنی دیز، اتنی رات میں۔ سب خیریت تو ہے نا؟“  
 ”بالکل خیریت ہے، اکیچو کلی ہمیں صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد کے لئے نکلنا ہے اس لئے میں نے تمہارا بھی ٹکٹ کنفرم کرا دیا ہے۔ میں اور ندیم تمہیں یہیں سے پک کر لے لیں گے۔“  
 ”شاباش! تم کو تو ایوارڈ دینے کا دل کر رہا ہے اس وقت۔“ بکنگٹین حیدر ترمذی کے چہرے کے زاویے بکڑے تھے۔

”تم اس کی فکر مت پالو، وہ مجھے پہلے ہی مل چکے ہیں۔“ رجا نے مسکراتے ہوئے کہا اور نہایت ہی ایزی ہو کر اپنے مخصوص انداز میں صوفے پر دونوں پیر پڑھا کے بیٹھ گئی۔  
 ”یاراب میرا پیچھا چھوڑ بھی دو۔ تم نے ایک شو کے لئے آفر دی تھی مگر اب تو گلے کا ہار ہی بن گئی ہو۔“  
 ”شرم کرو بے قدرے۔ جاؤ ان ماڈل، ایکٹر، ایکٹریز سے جا کر میری قدر پوچھو جو مرنے جا رہے ہیں میرے ساتھ کام کرنے کے لئے اور ایک تم ہو جس کو کامیابی اور چانس وہ بھی گولڈن چانس طشتری میں مل رہا ہے تو ٹھکرا رہے ہو، مزاج ہی نہیں مل رہے۔“ رجا صدیقی نے اپنی آنکھوں کو چھونٹا کر اس کو دیکھا تھا۔  
 ”بس بکواس کرا لو۔ تو انہی کو آفر دونا جو تمہارے پیچھے مرے جا رہے ہیں، مجھ بزنس ٹائیکون کو کیوں اس دلدل میں پھنسا رہی ہو۔“

”بیٹا اب تو تم بھنسن چکے ہو اور یہ ایڈ تو تمہارے بغیر مکمل ہی نہیں ہوگا۔“  
 وہاں بیٹا ندیم بلوچ ان دونوں کی نوک جھانک پر مسلسل مسکرائے ہی جا رہا تھا۔ بکنگٹین حیدر ترمذی کی حالت وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اس فیلڈ اور اس پروفیشن میں کام کرنا آسان نہیں تھا، بہت محنت اور جدوجہد کے بعد ایک مقام ملتا ہے، اپنا سب کچھ اپنا سارا ٹائم اس پروفیشن کو دینا پڑتا ہے جب جا کر کامیابی آپ کے قدموں کی غلام بنتی ہے۔“

”یار ندیم، تم ہی سمجھا لو اس چھٹکی کو، بس بیٹھے مسکرائے ہی جا رہے ہو۔“ بکنگٹین حیدر ترمذی نے آخری کوشش مدد طلب نظروں سے ندیم بلوچ کو دیکھا۔

”ایم سوری! مجھے بھی رجانے ارجنٹ میرے گھر سے اٹھایا بنا کوئی سوال کئے۔“ اس نے بے بسی سے بکنگٹین حیدر ترمذی کو دیکھا تھا۔

”سارے غنڈوں والے کام ہیں اس کے.... اور ایک بات تو بتاؤ تم کینیڈا کب جا رہی ہو؟“

رجا صدیقی بکنگٹین حیدر ترمذی کی حالت پر ہنس دی۔

”اب یہ دانت کیوں نکال رہی ہو۔“

”کیوں کہ جب تم اپنے بیڈروم سے باہر آئے تھے بڑے فریٹش اور بٹاش انداز میں آئے تھے مگر اب پتہ نہیں! وہ آگ بگولا ہو گئے ہو۔“

”ظاہری بات ہے مجھے بتاتے تم نے صبح آٹھ بجے کی اسلام آباد کی ٹکٹ کنفرم کر دی، جشن تو منانے سے لے کر کچھ راضی سا انداز تھا۔“

”چلو بھئی اب ہم چلتے ہیں، پھر صبح ملاقات ہوتی ہے۔“ رجا صدیقی نے دونوں پاؤں نیچے کئے جوتے پہنے اور کھڑی ہو گئی۔

”اتنی جلدی یار! کچھ کھانی تو لو۔“

”بھئی تم تو جانتے ہو میں بہت سادہ خوراک لیتی ہوں، ڈنر میں بواکل رائس کے ساتھ پاستا سلا دکھالیا تھا۔ اس لئے کچھ کھانے کی گنجائش نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں تمہارے بارے میں مگر ندیم تو پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں۔“ سبکگین حیدر ترمدی اور ندیم بلوچ بھی ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔

”تو پھر تم ندیم سے ہی پوچھو۔“

”فارکانہ انفارمیشن میں نے تم سے پوچھا بھی نہیں تھا۔“ سبکگین حیدر ترمدی نے تپتے ہوئے کہا۔

”نہیں حیدر اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ مجھے شدید شرمندگی ہو رہی ہے اس وقت تمہارے گھر آنے پر۔“

”مگر رجا صدیقی تو ڈھیئوں کی سردار ہے، وہ تو شکر ہے کہ تم ساتھ ہو ورنہ یہ تو ڈائریکٹ بیڈروم پر دھاوا بول دیتی۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ تم تو منہ پھاڑ کے کچھ بھی بول دو۔“ رجا صدیقی خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی۔

ندیم بلوچ کو وہ پیاری سی لڑکی اپنے دل میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بغور رجا صدیقی کے چمکتے چہرے کو دیکھا تھا اور یہ نظر سبکگین حیدر ترمدی کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ پسندیدگی کے رنگ ندیم بلوچ کی آنکھوں میں صاف نمایاں تھے۔ اس نے پھر رجا صدیقی کو دیکھا، وہ ندیم بلوچ کے خوبصورت احساس اور پسندیدگی کے رنگوں سے بے خبر بے پروا تھی۔ سبکگین حیدر ترمدی بہت خوش ہوا تھا یہ جان کر کہ کوئی ہے جو رجا صدیقی کو دل سے چاہنے لگا ہے۔ رجا صدیقی اس کی بہت اچھی دوست تھی وہ اس سے بات کرے گا اس سلسلے میں۔

”رات کے دو بجنے والے ہیں، تم جب تک غنوی کو بائے بائے الوداع کہہ دو، صبح آٹھ بجے پھر کلنا بھی ہے۔“ رجا صدیقی ذومنی انداز میں کہتی مسکرا دی۔

”کیوں ندیم! میں نے کہا تھا اس نے ڈھٹائی اور بے شرمی میں ریکارڈ توڑے ہوئے ہیں۔“ سبکگین حیدر ترمدی نے مسکراتے ہوئے کھور کے رجا صدیقی کو دیکھا تھا۔

”پتہ نہیں یار حیدر ابھی میرا رجا سے صحیح طرح واسطہ نہیں بڑا جو میں رائے دوں۔“

ندیم بلوچ نے پر شوخ نظروں سے اس پیاری سی لڑکی کو آنکھوں میں بھرا تھا۔

”کوئی بات نہیں، اب تو واسطہ پڑنے ہی والا ہے، زندگی بھر رائے دیتے رہنا۔“

رجا صدیقی نے بالکل بے دھڑک کہا تھا اور جو کہا تھا اس کے معنی وہ خود نہیں سمجھتی تھی جو سبکگین حیدر ترمدی اور ندیم بلوچ نے اپنے انداز میں لئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر قہقہہ لگا کر دیکھنے لگے تھے۔ رجا صدیقی نے بہت عجیب نظروں سے دونوں کو دیکھا تھا اور کندھے اچکا کے آگے بڑھ گئی۔

”میں بھی چلتا ہوں۔“

”بیٹ آف لک۔“ دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔

(جاری ہے)

عائشہ مری

# میری زندگی تو

متحدہ عرب امارات کا پندرہ روزہ بزنس ٹور اور اس کا ایکسپریٹینس اس کے لیے بے حد شاندار رہا تھا انٹرنیٹ صاحب کے توسط سے ملنے والا یہ کانٹریکٹ ان کی کمپنی کے لیے کافی فائدہ مند ثابت ہونے والا تھا اپنی کمپنی



ترقی اس کے لیے پہلے بھی اہمیت سی، حامل تھی۔ اب تو یہ کمپنی فقط چند سال کے عرصے میں انٹرنیشنل لیول پر اپنا مقام بنانے جا رہی تھی۔ وہی میں ان کے بزنس پارٹنرانس صاحب تھے وہ صدیقی اینڈ کمپنی کے اوپر عزیز صدیقی لے ساتھ اس میننگ میں بطور ان کے پرسنل اسٹنٹ شریک رہا پارموشن کے بعد یہ اس کا پہلا ایکسپریمنٹس تھا اپنی ذہانت اور قابلیت کے بل بوتے پر وہ اتنے کم وقت میں صدیقی صاحب کی کمپنی میں اس عہدے پر پہنچ پایا تھا۔ وہ MBA تھا آنکھوں سے چمکتی ذہانت اور قابلیت کسی تعریف کی مرہون منت نہ تھی جیسی تو اتنے سارے ورکرز ٹیم کے باوجود اس اہم میننگ کو اینڈ کرنے صدیقی صاحب نے خاص طور پر زکریا جیسے قابل بندے کا انتخاب کیا تھا۔ کانٹریکٹ اپنے نام کروا کے صدیقی صاحب اس کے گلے گلے مبارک باد دینے لگے بھی اس کا ذہن بلنک کرنے لگا۔ مام کی ایمر جیسی کال اور بلاوے پر وہ تو ایک دم چکرا کر رہ گیا ابھی تک تو وہ اپنے ٹیم کی

## مکمل ناول



کامیابی کو انجوائے نہ کر پایا تھا کہ اچانک یہ کیا آفت آن پڑی وہ شاید کوئی بہانا مصروفیت کا بنائے کہ انہیں ٹال بھی دیتا۔ اگر معاملہ ان کی صحت سے ریلیٹ نہ ہوتا وہ سارے کام چھوڑ چھاڑا گلے دن کی فلائیٹ لے کر فوراً پاکستان آن پہنچا مہما کی صحت قدرے بہتر دیکھ کر اس کے دل کو سکون ملا مگر مہما کی خواہش جان کر تو وہ بھونچکا کر رہ گیا۔

”وہاٹ مام! نووے اسٹ از اسپاٹل۔“ اس نے فوراً سے پینتھر ان کی بات رد کر دی مگر وہ مہما ہی کیا جو بوہنی ہار مان لیں۔ اپنی تسمیوں دے دلا کر انہوں نے بڑی مشکل سے سہی زکریا کو کنوینس کر لیا معاملہ اگر اس قدر سنگین نہ ہوتا مہما کی صحت کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید بھی آدہ نہ ہوتا اس کا سب کچھ تو اس کی مہما ہی تھیں مجبوراً اسے مہما کی ضد پر حامی بھری پڑی جس کا پچھتاوا اچھو بن کر کتنے دنوں اسے تنگ کرتا رہا، صدیقی صاحب کی کالز پر کالز آتیں رہیں لیکن اس کا سارا جوش جیسے ماند پڑنے لگا اپنا بزنس، کامیابیاں، روشن مستقبل اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے ابھی تو ٹھیک نے وہ اپنی کامیابی کا جشن تک منانہ پایا تھا مخالف کو شکست دے کر خود ایک مقام بنانا کوئی اتنا آسان تو نہ تھا یہاں رہنا تو اپنے خواب اور خواہشات سے دستبردار ہونے کے مترادف تھا۔ یہ بات اسے قطعی منظور نہ تھی جس جس ذوہ ماحول سے شروع سے وہ کتر اتار ہا اب تمام عمر اسے مٹھن خطہ ماحول میں رہنے کا تصور بھی اس کے اعصاب پر بھاری پڑنے لگا مگر مہما نے اپنی خواہش پوری کر کے ہی دم لی ایجنٹ کے اگلے روز ہی وہ واپس چلا گیا مگر اب پہلے والی گرم جوشی اور اشتیاق بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

☆☆☆☆

زرق برق آنچل، گیندے کے پھولوں سے سجی سیڑھیاں، امین، ہلدی اور پھولوں کی مہک سے رچا بسا ماحول جابجا بکھرے پھولوں کی پیتاں اور بے فکری سے گونجتے قہقہے۔

”قصر عثمانیہ“ کی سب سے چھوٹی لاڈلی مروت کی مایوں کی تقریب اپنے زور شور پر تھی۔ مروت پانچ بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی اپنے گھر کی ہولے جاری تھی گو کے گھر ایک ہی تھا صرف پورشن تبدیل ہوتا تھا مگر مروت کی رخصتی کا تصور بھی قصر عثمانیہ کے افراد کے لیے سوہان روح تھا اس بھی چیز میں تو پورے گھر کی جان تھی سب سے بڑے عمیر تو ابھی سے بچھے بچھے سے لگ رہے تھے حالانکہ شادی میں ابھی چار دن باقی تھے جازی، احد، سعدی بھی منہ پھلائے ہر کام انجام دے رہے تھے صرف زیب بھائی خاصے مطمئن لگ رہے تھے اور ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے زمر (تایا کی بیٹی) کو خاص عمیر بھائی کی طرف سے آڈر ملا تھا کہ انہیں ایک پل کے لیے بھی مروت کو تنہا اداس رہنے نہیں دینا سو وہ پوری تقریب میں سائے کی مانند اس نے چمٹی رہی دونوں کی آپس میں دیے بھی بہت جتنی تھی پایا بھی پوری تقریب کمرے سے باہر نہ نکلے الٹا مروت کو بھی جا کر انہیں باہر لانا پڑا، مروت کے جانے سے اداس تو وہ بھی بہت تھے مروت کی خوشی ان کے لیے ہر شے سے مقدم تھی سفید گونے کناری لگے لباس میں سفید پھولوں کے زیور بالوں اور کلائیوں میں لپٹے وہ چاند سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی اس کے شفاف بے فکری لیے قہقہے زکریا کو مرامر اپنی بے بسی کا مذاق اڑاتے محسوس ہو رہے تھے جبکہ پچھو اس کی بلا میں اتارتے نہ تھک رہی تھیں جیسے تیسے کر کے مایوں کی رسم اختتام کو پہنچی ذکی تقریب ختم ہونے سے قبل ہی کمرے میں بند ہو گیا مگر مروت کی آواز اور قہقہے جیسے اب بھی اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

☆☆☆☆

عثمان ضیاء پیشے کے اعتبار سے مقامی کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے، شہرین بیگم ان کی چچا زاد ہونے کے ساتھ ان کی منکوحہ بھی تھی انہیں اس رشتے خاص سے کوئی برخاش تو نہ تھی مگر کتاب نقد پر کو کچھ اور ہی منظور تھا جب ان کا



دل اپنی کو لیک ہا بیگ پر آ گیا تب واپس جانے کی تمام راہیں جیسے مسدود ہو کر رہ گئیں ہا بھی عثمان صاحب کی شخصیت سے خاصی مرعوب تھیں یوں بات شادی تک جا پہنچی، بابا کو جب پتا چلا تو انہوں نے جیسے آسمان سر پر اٹھالیا یا تو عثمان اس لڑکی کو چھوڑ دے جواب ان کی دوسری بیگم تھیں یا ان کا مراہوا منہ دیکھے شرمین بھی عثمان صاحب کی بے رخی سے دل برداشتہ ہو گئیں تھیں عثمان بیگ نے کسی کی بھی پروا نہ کرتے ہا کا ساتھ دینے کو ترجیح دی پایا یہ غم برداشت نہ کر سکے اور بستر سے لگ کر رہ گئے جوان بیٹے کی بے رخی کا غم کسی طور نہ ہو پا رہا تھا اس لیے شاید قدرت کو ان پر رحم آ گیا اور گھر سے جانے کے محض گیارہ ماہ بعد وہ بھی روح کو لے کر واپس آ گئے ہا ڈیور میں یوں پیچیدگی کے سبب موقع پر ہی دم توڑ گئیں تھیں روح کو دو ماہ تک خالہ نے پالا جب تک عثمان میاں اس سوگ میں پڑے رہے زخم وقت کے ساتھ مندمل ہونے لگے تو آپا بیگم نے ہی مشورہ دیا کہ انہیں دوبارہ گھر جا کر اپنوں سے معافی مانگ لیتی چاہیے اس طرح ان کی تکلیفوں کا بار کچھ کم ہوگا۔ آپا کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے آپا کے ہی کہنے پر وہ بھی روح کو لے کر بابا کے قدموں میں جا گرے وہ باپ تھے بیٹے کی جدائی نے ان کے ناتواں کندھوں کو مزید کمزور کر دیا تھا اب اتنے دنوں بعد اسے سامنے پا کر وہ گویا ساری ناراضی بھول بھال گئے اور یوں شرمین نے بھی تھیں روح کو گلے سے لگالیا ان کے گھر کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں تھیں شرمین کے ہاں یکے بعد دیگر دو بیٹوں کی آمد سے ان کے قدم سرال میں کیا تھے اور عثمان صاحب کے سامنے ان کی قدروا میت بڑھ گئی ان ماہ سال میں بابا بھی چل بسے سارے قصر عثمانیہ پر اب عثمان صاحب کا راج تھا اور انہیں اپنی جیتی روح سے بے حد لگاؤ تھا وقت کے ساتھ ان کا لگاؤ مزید بڑھنے لگا تھیں روح میں جیسے ان کی جان تھی بابا کی ساری جائیداد تائیں فیصد حصہ اور گھر انہوں نے روح کے نام کر دیا شرمین بیگم کو ان کے فیصلے سے زیادہ خوشی تو نہ تھی مگر شوہر کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی وقت بیتتے گئے وقت کا سکہ پلٹ گیا ان کے تینوں بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے روح کی شادی بابا نے اس کی پسند کے مطابق خالہ زہرا آذر یزدانی سے کر دی حمزہ جو کے آوارہ مزاج کا شخص تھا پتا نہیں روح کو اس آوارہ بد معاش شخص میں کیا نظر آ گیا شرمین بیگم کو یہ کر رہ گئیں روح کی جلد بازی اور بے سوچے سمجھے فیصلے اور عثمان صاحب کی بے جا حمایت سے اب وہ عاجز آ چکی تھیں یا پھر انہیں حمزہ کی فطرت کا علم ہو چکا تھا بہر حال جو بھی تھا وہ روح کے اس فیصلے سے زیادہ خوش نہیں ان کے اپنے دونوں بیٹے واجد اور اسد کا نکاح انہوں نے خاندان میں ہی کر دیا اپنے ڈگر پر رواں زندگی جیسے تھم گئی عثمان صاحب ایک روز رات کو یونہی چپکے سے دارفانی سے کوچ کر گئے اور فقط چھ ماہ بعد شرمین بیگم بھی چند دن علیل رہ کر چل بسیں۔ وقت رک سا گیا قصر عثمانیہ پر جیسے سناٹوں کا راج چھانے لگا وقت کے ساتھ زخم تو مندمل ہونے لگے تھیں شام شام میں راتوں میں بدلنے لگیں وقت مرہم بننے لگا زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی اب حمزہ کے رنگ کھل کر سامنے آنے لگے روح سے رقم کا مطالبہ اور حق وصولی کے متعلق زچ کرنا اس کی طبیعت میں خاص اور لالچ بڑھنے لگا محبت کا نشا اثر اتوا تھا میں سوائے پچھتاؤں کے کچھ نہ رہا وہ کم ظرف انسان پیسے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھانے تک سے دریغ نہ کرتا پہلے پہل وہ اس کی زیادتیوں کو خاموشی سے سہہ لیتی پر جب اس کی زیادتیاں اور تقاضے بڑھنے لگے تو اس کی ہمت جواب دینے لگی روز لڑائی جھگڑا مار کٹائی اس کے پاگل پن میں بجائے کمی کے اور اضافہ ہونے لگا ان کی شادی کو 3 سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور اتنے عرصے میں وہ اس شخص کی فطرت سے بخوبی آشنا ہو چکی تھی اس نے روح سے شادی صرف پیسوں کے لیے کی تھی اور اس دن تو حد ہو گئی اس ذلیل شخص نے روح کو مار کر آدمی رات کو گھر سے نکال دیا کے جب تک وہ اپنے بھائیوں سے اپنے حق کا

مطالبہ نہ کرے تب تک اس کے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ زکریا اس وقت فقط ڈیڑھ برس کا تھا اسے یہ شرط قطعی منظور نہ تھی اتنے مہربان شفیق بھائیوں سے وہ کس منہ سے مطالبہ کرتی جنہوں نے اس کی ہر ضرورت بنا کچھ کہے پوری کی اس مطلبی شخص اور اپنے سنگے رشتوں میں کسی ایک کو چننا تھا بس فیصلہ ہو چکا وہ خاموشی سے بنا کچھ کہے میٹکے آکر بیٹھ گئی بھائیوں کے اصرار پر بھی وہ سچ بیان نہ کر سکی۔

☆☆☆☆

”حزہ آذر نے مجھے گھر سے نکال دیا اور میں اب نہیں جا ہتی کے زکریا پر اس کے حزیص باپ کا سایہ تک پڑے۔“ بھائی اس کے گھریلو حالات سے باخوبی واقف تھے پہلے بھی فیصلہ روح کا اپنا تھا اب بھی انہیں روح کے کسی فیصلے پر اعتراض نہ تھا ان کے لیے روح کی اپنی خوشی و رضا مقدم تھی اس لیے انہوں نے کریدنے کی کوشش نہ کی روح اپنے بیٹے کے ساتھ اوپر والے پورشن میں رہنے لگی چار کمروں پر مشتمل ہوا دار کھلے پورشن میں ان کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی حزہ نے تو زکریا کی ذمہ داری اٹھانے سے بھی انکار کر دیا ان کے باقی اخراجات تو بھائی خوش اسلوبی سے اٹھا رہے تھے پر زکریا کو اعلیٰ تعلیم دلانے عمیر کے پاس ابرو ڈھیچنے کے لیے روح بیگم نے بینک میں رکھے اپنے زیورات بیچ ڈالے جب بھائیوں نے سنا تو بہت خفا ہوئے۔

”تم نے تو کبھی ہمیں نہ سنا سچا ہی نہیں ورنہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے قبل ایک مرتبہ مشورہ تو ضرور کرتیں زکریا بھی میرے لیے عمیر اور زیب کی طرح ہے تم نے ایسا کیسے سوچ لیا کہ میں اس کی ذمہ داری سے یوں چشم پوشی سے کام لوں گا۔“ واجد سخت برہم لگ رہے تھے روح بیگم اپنی جگہ چوری بن گئیں۔

”ایک پل میں ہمیں یوں غیر کر دیا۔“ اسد کے اندر کبھی ٹھکی نمایاں تھی حزہ نے جو کیا اس کے بعد تو لگا جیسے وہ تپتی دھوپ تلے آن کھڑی ہو پر آج ان دونوں بھائیوں کے الفاظ نے جیسے اس کا مان بڑھا دیا حزہ سے اس کے تمام تعلق جیسے ختم ہو کر رہ گئے تھے وہ گھر بیچ کر نجابے کہاں بیرون ملک چلا گیا اسے یوں بے سہارا چھوڑ کر پر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ بھائیوں کے شفیق وجود اس کے لئے کسی گھٹے سائے کی طرح تھے اس کی پلمپیں شکر سے بھگنے لگیں زکریا اب دس سال کا ہو چکا تھا تنھیل میں اپنے ہم عمر زیب اور چھوٹے ماموں کی بیٹی زمر سے اس کی بالکل نہ بنتی وہ بیچیدہ اور کم گو تو پہلے سے ہی تھا وقت کے ساتھ اس کی سنجیدگی متانت طبیعت میں ناگواری بیزاریت عود کر آنے لگی تھی وہ خود کو اس ماحول میں ایک قیدی کی طرح محسوس کرنے لگا، ایک ایسا طائر جس کے دونوں پر کاٹ کر پتھر سے میں بند کر دیا گیا ہو، ماما کو پل پل ماموں ممانیوں کے احسان تلے دبے دیکھ کر وہ خود کو دنیا کا بے بس ترین انسان تصور کرنے لگا تھا۔ کم عمری ہی سے اس کے دل و دماغ میں نجابے کیا خناس سکنے لگا، ماما کے ساتھ ماموں کے دو بھائیوں کے احسانات کو فقط ڈھونگ دکھلاوا گردانے لگا اس کے نزدیک ان سب کی کوئی وقعت نہ تھی، وہ اپنے ساتھ زیب عمیر کا موازنہ نہ کرتا تو عجب احساس میں گھر جاتا وہ اپنی اس محرومیوں بھری زندگی کا اصل تصور وارانہیں ہی قرار دیتا ممانے اس کی حالت کہ پیش نظر اسے عمیر کے پاس ابرو ڈھیچ دیا، وہ نہیں چاہتی تھیں کے ذکی اس ماحول میں رہ کر کسی خود ترسی کا شکار ہو یا کہیں ان کے بھیا تک ماضی کا آسیب ان کے بیٹے کے مستقبل کو نگل نہ لے وہ زکریا کو حزہ کے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کی غلطیوں سے سبق سیکھ چکی تھیں اب زکریا کو وہ آئیڈیل لائف دینا چاہتی تھیں آزادی اسے راں آئی تھی اب وہ اس ماحول زدہ ماحول میں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا عمیر ہائر ایجوکیشن کے بعد اب بزنس میں ڈیڈ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ جبکہ زکریا MBA کرنے کے بعد وہیں پر صدیقی صاحب کی کمپنی میں جاب کرنے لگا، ممانے اس کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہ کیا اسے اور کیا

چاہیے تھا اس کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان میں اس کا اپنا گھر ہو۔ وہ اپنا ایک الگ مقام بنانے کا خواہشمند تھا اس لیے اس نے تہیہ کر لیا کہ جب تک وہ اسٹیبلس نہیں ہو جاتا وہ پاکستان واپس نہیں لوٹے گا اس کے دن رات اسی کوشش میں لگے تھے کہ وہ اپنی پوزیشن کلیئر کر کے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنی الگ پہچان بنائے وہ اپنے عہد پر قائم ہی رہتا اگر اچانک ممّا کی کال نہ آ جاتی اسے خود سے کیے عہد کو توڑنا پڑا، اس کا سب کچھ ممّا ہی تھیں اور اتنی تک دود اور محنت اس نے ممّا کے لیے ہی کی تھی اس لیے فقط ممّا کی ایک کال پر وہ سب کچھ چھوڑ چھا کر واپس آ گیا پر ممّا کی خواہش کم ضد پر وہ تھتھے سے اکھڑ گیا ممّا کو اس سے ایسی بے مروتی اور انکار کی توقع نہ تھی۔ زکریا نے کبھی ان کی بات رد نہیں کی تھی انہوں نے زکریا کی رائے لیے بغیر ہی مروتہ سے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ انہیں اپنی تربیت پر پورا بھروسہ تھا کہ ذکی ان کا مان ہرگز نہ توڑے گا، زکریا کے انکار سے ان کا مان کرجی کرجی ہو گیا وہ جیسے ڈھے سی کین پانی اب سر سے اوپر ہو چکا تھا واپسی کی تمام راہیں مسدود تھیں انہیں جیسے بھی کر کے زکریا کو مٹانا تھا انہوں نے کھانا پینا یہاں تک ذکی سے بول چال تک ترک کر دی ممّا کی ناراضی نے اسے عجیب دورا ہے پر لا کر کھڑا کر دیا نا چاہتے ممّا کی بات مانتے اسے یہ کڑوا گھونٹ بھرتا پڑا ممّا اس کے اقرار سے جیسے جی انھیں زکریا نے انہیں اپنوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچایا اور ممّا کی خوشی سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ اہم نہ تھا دوسری طرف قصر عثمانیہ میں بھی ایک نئی لہر دوڑ گئی زکریا کے اقرار نے سب کو رسکون کر دیا تھا زکریا جیسا سمجھ لڑکا انہیں مروتہ کے لیے اور کہاں مل سکتا تھا، تو جھپٹ مگنی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، مگنی کے اگلے دن زکریا کسی سے بتا کچھ کہے واپس چلا گیا تھا مگر اب اس کا سارا جوش ساری دلچسپی مانند پڑ چکی تھی جہاں ممّا نے خود گھٹ گھٹ کر ساری عمر گزار دی اب اسے بھی ساری عمر انہی کے احسان تلے دب کر رہنا تھا۔ جو اسے قطعی منظور نہ تھا پر انی الحال ممّا کو سمجھانا اسے دنیا کا مشکل ترین کام لگا تھا اور ممّا نے بھی اس کی فحاشی کا خاطر خواہ اثر نہ لیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور انہیں اس وقت کا شدت سے انتظار تھا۔

☆☆☆☆

رات کو تقریب سے تھکی باری پکڑے چیخ کیے بنا ہی بستر پر ڈھے گئی صبح اچلی اچلی روشن سورج کی کرنیں پردوں سے چھن کر آنے لگیں فریش ہو کر جوجی کو کافی کا کہہ کر وہ باہر لان میں چلی آئی ارادہ تھوڑی دیر تازہ ہوا میں چہل قدمی کا تھا سورج اور بادلوں کی آنکھ پھولی جاری تھی، لان کی طرف بے زینوں پر منہ پھلائے عادی اور گوشہ بیٹھے تھے، آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر کے وہ ان کی جانب بڑھی۔

”کیاں ہو گوشہ؟ کیا پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے تم دونوں کا؟“ اس کی پوچھنے اس نے چڑایا۔

”آپ جھوٹی ہوفیک ہو آپ نے کہا تھا کہ ہمیں چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گی“۔ ننھے عادی نے منہ بسور کر کہا۔

”ہاں انکل کہہ رہے تھے آپ کی شادی ہو جائے گی اور آپ ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں گی تو ہمیں اسٹوریز

کون سنائے گا ہمارے ساتھ کھیلے گا کون؟“ گوشہ رونی صورت بنا کر بولی۔

”اچھا کوئی بھی آکر تم سے کچھ بھی کہہ دے یقین کر لو گے۔ اچھا بتاؤ مثلاً کون سے انکل؟“

”ذکی انکل“۔ گوشہ کے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی کڑی گولی نگل لی ہو تو عادی نے ٹیس پر کھڑے فون

پر کسی سے بات کرتے زکریا کی جانب اشارہ کر کے اس کی مشکل آسان کر دی زکریا کی بھی سرسری نظر ان پر پڑ

چکی تھی۔ ان کی باتوں سے وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

”وہ تو یہاں کھڑے ہیں موصوف، پاگل ہیں وہ آئی مین پاگل ہے وہ جو ایسا کہتا ہے آپ کی موی آپ کو

چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔“ اس نے بات جان بوجھ کر تیز آواز میں کہی تھی۔

”سر سلی موی آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گی پر اس کرو۔“ عادی تو جیسے اس کے سر ہو گیا۔

”اچھا بابا پر اس اب خوش۔“ اس کے گال پر پیار کرتے کہتے اس کی نظریں بے ساختہ میسر کی جانب اٹھیں جہاں اب بھی زکریا موجود تھا ایک شرارتی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

☆☆☆☆

ڈاننگ ٹیبل پر آج خلاف معمول زکریا موجود تھا جب سے وہ آیا تھا آج پہلی مرتبہ وہ ان سب کے ساتھ مل کر کھانا کھا رہا تھا انشین بیگم اور روحہ بیگم تو جیسے اس کے آگے پیچھے ہو رہی تھیں ورنہ جب سے وہ آیا تھا شاذ و نادر وہ گھر پر ملتا دیکھ ہی باہر کر لیتا اکثر لیٹ تاٹ تک باہر ہی رہتا تب تک افراد خانہ کھانا کھا چکے ہوتے مگر واجد صاحب نے اسے ذبردستی روک لیا وہ بروقت بہانہ تک نہ بنا سکا کھانے کے دوران مروہ کی نظریں کسی قدر دیدہ دلیری ڈھٹائی اور بے باکی سے اس پر جھمی تھیں سب لوگ اپنے کھانے میں مگن تھے شاید اس لیے کسی نے نوٹس نہ کیا پر اس کی نظروں سے اسے کوفت سی ہونے لگی دانت پیستے دل ہی دل اس کی بے باکی پر کڑھتے وہ دوبارہ پلیٹ پر جھک گیا نجانے کیا سوچتے اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر چاول کی ٹرے اٹھانی چاہی مگر یہ کیا دوسری جانب سے مروہ نظر اہڑے کو پکڑے شریری مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کے ضبط کو آزمانے لگی صبر کا گھونٹ بھرتے اس نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا حتیٰ المقدور وہ اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریز کرتے لگا اسے دیکھتے ہی اس کا پارہ ہالی ہونے لگتا۔ مئی کے سامنے خود کو نارمل پوز کر رہا تھا جو فیصلہ ہونا تھا سو ہو چکا اب وہ اپنی کسی غلطی کے سبب مئی کے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا چاہے اس کے لیے اسے یہ کڑوا گھونٹ (مروہ) ہی کیوں نہ پینا پڑے وہ خیالوں کی دنیا میں کھویا تھا کہ اچانک پاؤں پر کسی کے پیر کے عجیب احساس پر کرنٹ کھا کر وہ پیچھے ہٹا سب کھانے کے ساتھ اپنی باتوں میں لگے تھے صرف مروہ کی بے باک نگاہیں اس پر مرکوز تھیں اس کے یوں اچھلنے پر مسکراہٹ چھپانے کے لیے اس نے گھاس لبوں سے لگا لیا اور اس کے شک کی تائید ہو گئی اب وہ ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے اس کی حالت کو دیکھ کر محظوظ ہونے لگی۔

”ہونہ بے حیائی ڈھٹائی کی حد ہے۔“ باپ بھائیوں کی موجودگی میں کیسی دلیری بے باکی سے اسے تک رہی تھی اسے شاید ان سب چیزوں سے فرق نہ ہو پر زکریا کی طبیعت کو یہ سخت ناگوار گزرا اس لیے فوراً مزید کچھ کہے بنا معذرت کرنا وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆☆

”لو کی نہیں آفت ہے آفت، اس نے تو میری لائف ہیل بنا کے رکھ دی اس گھر میں رہنا تو اب ناممکن ہے مگر مام کو پتا نہیں کیا اپنوں سے محبت کا بھوت چڑھا ہے اور وہ محترمہ نجانے اس کو اس کے گھر والے کیسے جھیل لیتے ہیں تم ایک بار ملو اس سے عدیل تو آئی ایم شیور دوبارہ بھی پاکستان آنے کا نام نہ لو گے پوری کی پوری چڑیل ہے نام نجانے کیوں اسے میرے سر منڈھنا چاہتی ہیں۔“ اسموگ کرتے اس کا ٹپ پر اپنے کو لیگ کم دوست سے بات کرتے وہ دل کی بھڑاس نکال رہا تھا دوسری جانب عدیل کا ذور دار تھقبہ نکل پڑا۔

”بھئی ماننا پڑے گا ضرور محترمہ کو کوئی پیچی ہوئی توپ چیز ہیں جس نے زکریا عثمانی کو ناکو اپنے چبوا دیے میری تو شدت سے بھابھی صلحہ سے ملنے کی خواہش ہے آخر انہیں سلوٹ کرنا تو بنتا ہے آخر انہوں نے مگر کر سے لی ہے۔“ عدیل کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”یو آر رائٹ، کم از کم اسے یہ بتانا چاہیے آخر اس نے ٹکر کس سے لی ہے۔“ چند ایک ادھر ادھر کی باتیں کر کے بدل آف لائن ہو گیا لیکن اس کے گرد بے شمار سوچوں کے انبار جمع ہونے لگے بلا آخر کو فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں سلی اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا دوسری جانب پہلی ہی بیل پر فون ریسیو کر لی گئی۔

”ہیلو، زکریا عثمانی بات کر رہا ہوں پاکستان سے۔“

☆☆☆☆

نکاح کی تقریب زکریا کی خواہش پر نہایت سادگی سے رکھی گئی تقریب کی ارنجمنٹ باہر لان میں رکھی گئی مروہ کے نکاح کو ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے جبکہ گھر کے کبھی بڑے لاؤنچ میں موجود اہم ڈسکشن کر رہے تھے زکریا کی بات پر ہال میں موجود تمام نفوس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

”یہ سب کیا ہے ذکی! یہ کیا بچپنا ہے؟“ ماما آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے سوال کرنے لگیں۔

”ہاں بیٹا یہ بھی تو تمہارا گھر ہے تو کہیں اور جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“ تایا بابا بھی آگے بڑھے۔

”یہ میرا آخری فیصلہ ہے اس لیے پلیز مجھے فورس نہ کریں اور ویسے بھی اب میں اپنا گھر لے چکا تو میں نے سوچا تو کیوں آپ لوگوں پر بوجھ بنوں۔“ انداز میں سرد مہری نمایاں تھی۔

”اور ویسے بھی کہیں نہ کہیں ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو آئی ایم شیور مروہ بھی ایسا ہی سوچتی ہوگی اس لیے اگر اسے کوئی اعتراض نہیں تو مجھے نہیں لگتا آپ لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض ہونا چاہیے۔“

ماما بے یقینی سے اسے دیکھنے لگیں جس کے انداز تیز بالکل بدلے بدلے لگ رہے تھے یہ وہ زکریا تو قطعی نہ تھا جس کے لیے ماما کی بات اور حکم ہر چیز پر مقدم تھی وہی زکریا جس نے ان کا سر ہمیشہ اونچا کیا تھا آج وہی ان کے ایٹوں کے سامنے ان کا سر جھکانے کا سبب بن رہا تھا وہ حیرت سے اور دکھ کی ملی جلی کیفیت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”اپنا گھر، یہ بھی تو تمہارا اپنا گھر ہے اور پھر ہم نے ایسا سوچا تک نہیں شروع سے یہی طے ہوا تھا مروہ یہیں رہے گی پہلے تو تمہیں کوئی اعتراض نہ تھا اب اچانک یہ خیال تمہارے دماغ میں آیا کہاں سے، وہ بھی آج کے دن، جبکہ باہر مہمان موجود ہیں باہر سارا خاندان موجود ہے ایسا نہ ہو کوئی بات نکلے تماشہ ہو یا پھر اس گھر کی بدنامی ہو سمجھنے کی کوشش کرو ذکی۔“ افشین بیگم آگے بڑھ کر اسے سمجھانے لگیں۔

”اور پھر مروہ وہ ہم سب کے بغیر کیسے رہے گی۔“ ان کے انداز میں فکر مند تھی۔

”ایکریٹلٹی آئی تمنا تو تب ہوگا جب بات بڑھے گی، آپ لوگ سیدھے سے مان کیوں نہیں جاتے میں نے کوئی انوکھی خواہش تو کی نہیں، اور رہی بات مروہ کی اگر وہ کوئی دودھ پیتی بچی ہے تو یہ بات آپ لوگوں کو شادی سے پہلے سوچنی چاہیے تھی خیر میں اب فیصلہ کر چکا اس لیے اچھا ہوگا آپ لوگ ضد ترک کر دیں۔“ اس کی بات پر خاموش کھڑے عمیر کو جیسے تاؤ آ گیا۔

”بکواس بند کرو اپنی فضول ضد ہم کر رہے ہیں یا تم۔“ عمیر کا دل جا ہا اس کا گریبان پکڑ کر دو چار گھونے مار کر اسے اس کی اوقات یاد دلادے اپنے اس ارادے سے جارحانہ آگے بڑھتا ماما جد پچانے آگے بڑھ کر اسے اس کے اقدام سے روکا جب چوہین کشنول سے باہر ہونے لگی تو خاموش کھڑے تماشہ دیکھتے واجد عثمانی کو گلا صاف کر کے کہنے لگے۔

”ٹھیک ہے بیٹا! جب تم فیصلہ کر ہی چکے تو اب کیا کہا جاسکتا ہے۔“ روح بیگم، افشین، عمیر چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

”برائے ضرور کہوں گا میری مردہ ابھی نادان ہے دنیا کی کوچ نچ سے نا آشنا، لہذا اگر اس سے کوئی بھول یا نادانی ہوگئی تو درگزر کر دینا، وہ ابھی نا سمجھ ہے شاید وقت کے ساتھ اسے عقل آجائے۔“ وہ بیٹی کے باپ تھے اس لیے سبھل سبھل کرنی سے گویا ہوئے۔

”بٹ ڈیڈ.....“ عیمر نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے اشارے سے اسے مزید کچھ کہنے سے روکا، عیمر کا دل چاہا اس شخص کی گردن دبوچ لے جس شخص کی وجہ سے آج ڈیڈا تھے بس ہو گئے تھے ان کی حالت بھی کم و بیش عیمر جیسی ہی تھی پر وہ اپنے تاثرات اور جذبات پر قابو پانے کے ہنر سے آشنا تھے اور اس وقت کچھ کہہ کر مردہ کی زندگی کے لیے مزید پریشانیاں پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”میں باہر گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں ماما! جلدی کیجئے گا۔“ ان سب کو بے بس دیکھ کر نا جانے کیوں اسے کمینہ سی خوش محسوس ہوئی مگر چہرے کو سپاٹ کئے فقط اتنا کہہ کر وہاں سے نکل آیا پیچھے سے روحہ بیگم شرمندہ شرمندہ سی سب کو وضاحتیں دینے لگیں بھی واحد صاحب نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بس میری مردہ خوش رہے مجھے اور کیا چاہیے گھر چاہے کوئی بھی ہو مجھے تم پر اور تمہاری تربیت پر پورا بھروسہ ہے، مردہ اینٹوں میں جا رہی ہے تم اس کے لیے ناں سے بڑھ کر ہو مجھے اور کیا چاہیے۔“ واحد صاحب کی تسلی پر جیسے وہ پرسکون ہو گئیں۔



زمر بھابھی سے پوری بات جان کے پہلے پہل تو اسے بھی تاؤ ہی آ گیا، ازلی ہٹ دھرمی اور ضد عود کر آئی پر پھر عیمر بھائی اور باقی سب کے ری ایکشن کا سوچ کر وہ مدہم پڑ گئی، جلد بازی میں کی گئی کوئی حماقت کہیں بنی بنائی بات ہی نہ بگڑ جائے تو وہ چپ چاپ ماما کے کہنے پر پھپھو کے ہمراہ چلی آئی پھپھو تو اس کی سعادت مندی پر جیسے نہال ہی ہو گئیں گھر پہنچنے تک نجانے کیسے اس نے خود پر جبر کیا، کمرے میں آتے ہی وہ ادھر ادھر ٹہلنے لگی ان گنت سوچیں، دماغ باؤف سا ہونے لگا، غصے کے سبب وہ چلے پیر کی بی کے مانند چکر کاٹنے لگی وہاں تو وہ مہمانوں کی وجہ سے چپ کر گئی اس کی حرکت ایسی نہ تھی جو اتنی آسانی سے نظر انداز کی جاسکے، عین بارات والے دن اس کا یہ شوشا، اسے تو حیرت پایا اور عیمر بھائی کے یوں اتنی آسانی سے وضاحت مندی پر بھی کچا کے وہ ایک پورشن تبدیل ہونے پر افسردہ تھے اب چونکہ معاملے کی نوعیت ہی بدل چکی تھی اس کا دماغ چکرانے لگا گھر میں ان تینوں کے علاوہ ایک ملازمہ بھی جو اس کا سامان رکھ کر جا چکی تھی پھپھو اور زکریا کے مابین کیا باتیں ہو رہی تھیں ان سب سے یکسر بے نیاز وہ زور سے بڑبڑا کر اپنا غبار نکالنے لگی۔

”ایڈیٹ، سمجھتا کیا ہے خود کو طرم خان کہیں کا ہو جیسے۔“ ڈرینگ ٹیبل کے پاس کھڑے چوڑیاں اتارتے اس کی بڑبڑاہٹ مسلسل جاری تھی جیسی کمرے میں زکریا کے داخل ہونے کا اندازہ ہی اسے نہ ہوا بے دردی سے چوڑیاں اتارتے نہ جانے وہ کس جرم کا بدلہ لے رہی تھی خیف سی مسکان کے ساتھ آگے بڑھ کر اس نے مردہ کی کلائی تھام لی اس کی تو جیسے سانس انک کر رہ گئی۔

”اتنی پیاری چوڑیاں اتنی نازک کلائی اور اتنی بے رحمی، چہ چہ افسوس۔“ اس کے ہاتھ کو بل دے کر اس کی کمر کے پیچھے کرتے اس کی ٹون بدل گئی آنکھوں میں برف جیسے تاثرات اور چہرے پر سرد مہمی، سفاکی، کالنج کی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی کلائی میں پیوست ہو گئیں سب کچھ اتنا چاٹک تھا کہ وہ سبھل ہی نہ سکی اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔

”بہت کھمند ہے ناں تمہیں خود پر بہت ناز ہے نا تمہیں اپنے بھائیوں کی نام نہاد محبت پر اب کہو ان سے آکر

بچالیں اپنی لاڈلی کو“۔ اس کا لفظ لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

”سب صرف دکھا دے یہ محبت کا ڈھونگ کسی کو تم سے کوئی سروکار نہیں کسی کو تمہاری پروا نہیں اور مجھے تو بالکل بھی نہیں۔“ کلائی پر گرفت سخت کرتے وہ زبان سے انگارے اگلنے لگے اختیارات کے لبوں سے سسکی نکلی۔

”ہاتھ چھوڑیں میرا پاگل ہو گئے ہیں کیا“۔ الفاظ بمشکل ادا ہو سکے۔  
”یہ تو ناممکن ہے ایک پاگل کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر جرم کی توقع کر رہی ہو“۔ اس کے رویے میں نرمی اور پلک کی رمق تک نہ تھی مردہ نے شدت سے آنکھیں میچ لیں۔

”ہاں جرم کی دعا کرو اب کیونکہ ساری عمر اب تمہیں یہی تو کرنا ہے“۔ اس کا ہاتھ جھٹکے سے چھوڑ کر کہنے لگا مردہ بھرائی آنکھوں سے اپنی زخمی کلائی کو دیکھنے لگی جس سے خون رس رہا تھا آنسو رخسار کو بھگونے لگے۔

”جاہل، جنگلی، پاگل انسان ہو تم“۔ آنسو صاف کرتے وہ چیخیں جوا با اس کا ہاتھ اٹھ گیا اور وہ منہ کے بل بیڈ پر جا گری۔  
”خبردار جو آئندہ اونچی آواز میں بات کی تو مجھے سخت زہر لگتی ہیں شوہر کے سامنے زبان چلانے والی عورتیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لو یہی تمہارے لئے بہتر ہے“۔ غیض و غضب میں کہتا وہ مڑا۔

”اور ہاں ایک اور بات اگر ماما کو اس سب کی بھبھک بھی پڑی تو آئی سویر“۔ تنبیہ کر کے واش روم میں بند ہو گیا، مردہ کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا، تقدیر نے یہ اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا تھا، اپنا سب کچھ گنوا کر بھی اس کے حصے میں مات ہی آئی تھی وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆☆

صبح ناشتہ لے کر اس کے گھر سے کوئی نہ آیا تھا صرف جو جی (ملازمہ) کے ہمراہ ناشتہ بھجوا گیا اپنی اس بے قدری پر اسے بے تحاشہ رونا آیا، اچھا ہوا زکریا اٹھ بچے ہی گھر سے نکل گیا تھا وگرنہ اس کے سامنے اسے مزید سبکی ہوئی فریش ہو کر اس نے آف وائٹ کلر کا ٹیفیس فرانک زیب تن کیا بالوں کی ڈھیلی چٹیا بنائی اور لائٹ میک اپ کا سچ دے کر وہ نیچے چلی آئی پھپھو ناشتے کی ٹیبل پر اس کی منتظر تھیں وہ سلام کر کے ان کے برابر آ بیٹھی، پسند کا ناشتہ ہونے کے باوجود اس نے برائے نام ہی لیا تھا، روح پیگم بار بار اس کی سانس چینی اور عدم توجہی نوٹ کر رہی تھیں جس کی نظریں وقتاً فوقتاً دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں اور وہ پوچھے بٹانہ نہ سکیں۔

”کیا ہوا مردہ بیٹا! کسی نے آنا تھا کیا؟“ تو جواب نفی میں سر ہلا کر وہ انگلیاں مروڑنے لگی یہ گھر ماحول سب اسے اجنبی اجنبی لگ رہے تھے وہ یہاں خود کو ان سیکورٹیل کرنے لگی تھی روح پیگم کی نگاہ اس کی سونی کلائیوں پر جا پڑی ضروری کام کا کہہ کر اندر گئیں واپسی میں ان کے ہاتھ میں چمکی ڈبیا موجود تھی۔

”یہ ذکی بھی کتنا لا پرواہ ہے میں نے یہ نگہن کل اسے تمہیں پہنانے کے لئے دیئے تھے یہ دیکھو شاید وہ دینا بھول گیا“۔ باکس میں سے نگہن نکالتے وہ سادگی سے کہنے لگیں۔

”لاؤ میں پہنا دوں“۔ کہتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ تھامے نگہن پہنانے لگیں اس سے قبل وہ ہاتھ چھڑاتی۔

”پھپھو رہنے دیں“۔ ان کی نظر اس کی کلائی کے گھاؤ پر پڑ چکی تھی۔

”یہ سب کیسے“۔ الفاظ جیسے ساتھ چھوڑنے لگے۔

”یہ سب ذکی نے کیا ہے“۔ وہ بے یقین سی تھیں وہ جواباً فقط سر جھکا کر رہ گئی ایک مدہوم سی امید تھی کہ شاید وہ انکار کر دے یا کوئی اور وجہ ہی بتا دے پر اس کی خاموشی نے سارے ہجید کھول دیئے وہ اپنی ہی نظروں میں مجرم سی بن گئیں۔



”بھلے اس کی تربیت میں نے کی ہو پر ہے تو وہ اسی شخص کا خون ذکی نے آج مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا“ اپنے بھائی سے کئے وعدے کا پاس تک نہ رکھ پائی۔ یہ کہتے ان کی آواز رندھ گئی تو مردہ ٹرپ کر آگے بڑھی۔

”آپ نے کچھ نہیں کیا پھپھو! اور نہ ہی آپ کی تربیت کا کوئی تصور ہے تصور تو یہ سب ان توقعات ان امیدوں کا ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے وابستہ کر لیتا ہے پر حقیقت تو اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ چونک اسے دیکھنے لگیں۔

”مردہ“۔ ان کی آواز اسے گہرائی سے آتی محسوس ہوئی۔

”وعدہ کرو میرے بچے تم بھائی صاحب یا گھر میں کسی اور سے ان سب کے متعلق کچھ نہیں کہو گی وعدہ کرو“۔ وہ چونکی ان کا چہرہ بے تاثر سا تھا پر ان کی آنکھیں ان میں کچھ چھن جانے کچھ ہودینے کا احساس نمایاں تھا۔

پھپھو جس کرب سے گزری تھیں اس بات سے وہ بخوبی واقف تھی اب مزید وہ کسی نقصان کی تحمل نہیں ہو سکتی تھیں وہ خود کو کہنے سے نہ روک پائی۔

”آئی پراس پھپھو! ایسا ہی ہوگا“۔ پھپھو کے سامنے تو وہ اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھی پر اب حقائق کو کب تک چھپائے پھرنی، ایک نہ ایک دن تو تمام حقیقت کھل ہی جاتی تھی کیہ ذکی کے نزدیک اس کی کیا اہمیت ہے وہ کب تک ان سب پر پردہ ڈالے رہتی پر اب وہ پھپھو سے وعدہ کر چکی تھی اس لئے جب اگلے دن ماما اور زمر بھابھی اس سے ملنے آئیں تو اس نے گذشتہ روز کے حوالے سے ان سے ذکر تک نہ کیا حالانکہ اس کا چہرہ چیخ چیخ کر ساری داستان سنار تھا، ماما تو اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک سی گئیں ان کی پھول سی بچی دو دن میں مرجھا گئی تھی۔

”کیا ہوا سب خیر پت تو ہے ذکی سے تمہارا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا“۔ کتنے خدشے، اندیشے ان کے گرد منڈلا رہے تھے جو اب وہ کیا کہتی تھی میں سر ہلا کر رہ گئی کیونکس کھرچتے اس کا چہرہ روئیے کی چغلی کھانے لگا ماما کو ایک پل لگا ساری بات سمجھنے میں۔

”دیکھو بیٹا! جب ایک لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو وہ صرف اس لڑکی کا ہی امتحان نہیں بلکہ اس کی پوری فیملی کے لئے ایک شخص مرحلہ ہوتا ہے میکہ چاہے جتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو سہ سال میں قدم بجانے کے لئے عورت کو بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں عورت کا اصل گھر اس کا شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے ذکی جیسا بھی سہی پر اب تمہارا شوہر ہے اس سے ابھ کر ضد کر کے تم اپنے لئے پریشانیاں پیدا کر دو گی، عورت تو وہی ہوتی ہے جو پیامن بھائے ایک عورت اپنے گھر کو جنت بھی بناتی ہے اور جہنم بھی، تمہارا اصل گھر یہی ہے اس میں تمہیں رہنا ہے چاہے ہنسی خوشی چاہے دکھی فیصلہ تمہارا اپنا ہوگا، وہ گھر تمہارا رہے گا پر صرف تمہارا میکہ تمہارا اصل گھر یہی ہے اپنے بل بوتے پر اپنا گھر آباد رکھنا اپنے شوہر کا دل جیت کر تم جانتی ہونا تمہارے بھائی جن سے تمہاری معمولی سی تکلیف بھی برداشت نہیں ہوتی سوچو اگر بھی انہیں تمہارے اور ذکی کے مابین ہونے والی چپقلش کی بھٹک بھی پڑی تو کیا انجام ہوگا سوچا ہے تم نے کیا اپنے بھائیوں کو دکھ دے کر خوش رہ پاؤ گی یا پھر ذکر یا اس کے بغیر رہ پاؤ گی مسئلے مسائل سب کی زندگیوں میں آتے ہیں بس تم ہمت نہ ہارنا ثابت قدم رہنا، وہ گھر تمہارا میکہ ہے اپنے میکے کی لاج رکھنا“۔ کیسی حقیقت تھی جس سے آج می نے روشناس کر دیا تھا، می تو جا چکی تھیں اپنی نصیحتیں اس کے پلو سے باندھ کر پر اس کا بوجھ، اضطراب کم ہونے کی بجائے بڑھنے لگا، وہ کس مقام پر آن کھڑی تھی جہاں سے نہ واپسی کا راستہ تھا نہ آگے بڑھنے کی راہ، وہ خود کو کسی پنجرے میں قیدی محسوس کرنے لگی ماما کی دعا میں پھپھو کی محبت بھی اس کے اندر کی بے چینی کو کم نہ کر سکی بس ماما کے آنے سے یہ فرق پڑا وہ خود کو بد لنے لگی تھی وہ مسکرانے لگی تھی تکلیف

میں دکھ والی مسکراہٹ، کھوکھلی، بے جان، پھپھوکی تنبیہ کے بعد ذکر کیا کارویہ ٹھیک تو نہیں ہاں بدل ضرور گیا تھا وہ بہت کم ہی اسے مخاطب کرتا زیادہ تر کام خود کرتا اس کے نزدیک اس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی ذکر کیا کی بے اعتنائی دھتکار پر اور اپنی اس ہنک پر تنہائی میں وہ گھنٹوں روٹی پر سب کے سامنے وہ ایسی ہو جاتی جیسے اس کی لائف میں سب کچھ پرفیکٹ ہو، مہما کی باتوں کا اثر تھا یا پھر پھپھوکی لائف سے لیا گیا سبق بہر حال جو بھی تھا وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا آشیانہ بکھرتا نہیں چاہتی تھی پھپھو اکثر اسے اپنے ماضی کے قصے سنایا کرتیں پھپھو کے ساتھ جو ہوا پر وہ دوسری پھپھو نہیں بننا چاہتی تھی ذکر کیا کارویہ اب اس کے گھر والوں کے ساتھ پہلے سے قدرے بہتر تھا انہوں نے بھی مردہ کی خوشی کی خاطر جیسے سب کچھ بھلا دیا جازبی سعدی وغیرہ اکثر اس سے ملنے آ جاتے تو اس کا دھیان بٹ جاتا، وہ لاڈوں پٹی بھی اب محبتوں کو ترس گئی تھی شادی کے ایک ہفتے بعد ہی ذکر کیا اپنے ملازمہ کو فارغ کر دیا یہ کہہ کر کہ اب گھر کے سارے کام مردہ ہی دیکھے گی مردہ جس نے بھی اپنے لئے چاہے تک نہ بنائی اب اسے یہ سب بہت مشکل لگ رہا تھا وہ تو ڈھنگ سے آلیٹ تک نہ بنایا رہی تھی ایک کپ کافی بنانے میں کتنے پیچ کانڈالنا ہے یہ بھی اسے زمر بھابھی سے پوچھنا پڑتا روٹیاں تو بازار سے بنی بنائی آ جاتیں مگر ذکر کیا کوڈنر کے بعد آج کل ٹیٹھا کھانے کا شوق چڑھا تھا تو گھر ہی میں ٹرائفل، پڈنگ بنانے پڑ جاتے، ذکر کیا کوڈنر مردہ کے دیکھی کھانوں سے سخت پڑ تھی تو اس کے لئے امالین، چائینز اور تھائی کھانوں کی ترکیب نوٹ کر کے بناتی زیادہ تر چیزیں اس سے خراب ہی بنتی پھپھو تو خاموشی سے سب کچھ کھا لیتی مگر ذکر کیا کے بصرے، اف تو بے اس نے زمر کے کہنے پر کوکنگ کلاسز لینی شروع کر دیں اس کے دن رات بے حد مصروفیت میں گزرنے لگے۔

☆☆☆☆

”شادی کے بعد لائف اتنی مشکل ہو گئی مجھے بالکل آئیڈیا نہ تھا“۔ ہانیہ سے فون پر بات کرتے وہ اصرار کیا کرتی ہانیہ اس کی بہترین غم خوار اور اب مستقبل قریب میں ہونے والی بھابھی تھی جازبی اس کا جڑواں بھائی اور ہانیہ اس کی بیسٹ فرینڈ جب جازبی نے منگنی کے لئے ہانیہ کا انتخاب کیا تو وہ جو جیسے اسی کے سر ہو گئی۔ ”بھئی واہ تم تو بڑے چھپے رستم نکلے میری ہی آنکھوں کے سامنے تم میری فرینڈ کو تاڑتے رہے۔“ جازبی سر جھکا کر رہ گیا، وقت کتنی جلدی ہاتھوں سے سرک جاتا ہے بیتے وقت کو یاد کر کے اس کی پللیں نم ہونے لگیں اب وہ گھر میں خاصے رف حلے میں پائی جاتی مصروفیات کے سبب اسے اپنے لئے وقت ہی نہ ملتا اس لئے کبھی آنکھ بھابھی تو بھی زمر بھابھی اسے پیچ کر پار لیا بازار کا ہفتے میں ایک آدھ چکر ضرور لگاتیں ذکر کیا کواس کی اس قسم کی مصروفیات سخت ناپسند تھیں اس لئے سب کے سامنے نہ ہی پراکیلے میں اسے تنبیہ کرنا نہ ہوتا، اس کی شادی کو دو ماہ ہونے کو آئے تھے گھر میں جازبی کی ایجنٹ کا شوٹہ اٹھا دونوں طرف سے زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں بازار اور پارلر کے چکر بڑھنے لگے اور ذکر کیا کا غصہ بھی شادی کے بعد اس کے میکے میں پہلی تقریب تھی ان کا ویسہ تو ذکر کیا نے نجمانے کیا سوچ کر کینسل کر دیا پر اس بار وہ ذکر کیا کے غصے کی پرواہ نہ کر کے خاصی ایکسیائیڈ تھی ذکر کیا تو قطعی تقریب میں شرکت کے لئے حامی نہ بھرتا پرتایا ابا اور پاپا کے اصرار پر وہ منع نہ کر سکا ذکی کو یہاں ایک ملٹی پیشنل فرم میں جاب مل گئی تھی اس لئے اس نے وہاں ریزائن کر دیا تھا اس کا سارا دن اب مصروف گزرتا، اس لئے انہیں شام کی تقریب کے لئے وقت پر تیار ہونے کا کہہ کر وہ آٹس چلا گیا، تقریب آٹھ بجے اس کی واپسی ہوئی تھی کمرے میں داخل ہو کر وہ جیسے ٹھک گیا، بلیک کلر کی پیارسی ڈیزائنز ساڑھی پہنے بالوں کو نفیس جوڑے کی شکل میں باندھے لائٹ میک اپ اور جیولری وہ آئینے میں اپنا تفصیلی جائزہ لینے لگی، یہ ڈیزائنز ساڑھی

عمیر بھائی سے فرمائش کر کے لی تھی شادی سے پہلے تو می نے پہننے نہ دی اور آج سے بہتر موقع اسے زیب تن کرنے میں اس کی نظر میں اور کوئی نہ تھا قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنا پلوسٹ کرتی اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ کب ذکر کیا اس کے عین پیچھے آکھڑا ہوا مصروف انداز میں سر اٹھا کر دیکھا کر یا کو اپنے اتنے لباس دیکھ کر اس کے اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں نظریں پھیر کر دوبارہ وہ اپنے کام میں مگن ہو گئی پر ہاتھوں کی گپکپی واضح تھی اسے سامنے پا کر اس کی ہمت جیسے جواب دینے لگی اس شخص سے نجانے کیوں اب اسے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔

”بہت خوبصورت ساڑھی ہے مگر فوس‘ خوبصورت چیزوں کا اکثر ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔“ اس کی نظریں بے ساختہ آئینے میں اس کے عکس کی جانب انھیں جس کی نظریں اس کے وجود کے آ رہا ہو رہی تھیں ذکی نے ہاتھ میں دے سگریٹ کو ایک پل کو دیکھا مگر اگلے ہی پل وہ سگریٹ اس کے بازو میں گاڑھ چکا تھا اس سے قبل مردہ اس سفاک شخص سے اپنا بازو چھڑا پاتی سگریٹ اس کے بازو پر کئی نشان چھوڑ چکا تھا‘ تکلیف بے بسی کے سبب اس کی آنکھیں چھلک پڑیں پر اسے پرواہی کب تھی۔

”بہت گھمنڈ ہے نا تمہیں اپنی خوبصورتی پر اس ساڑھی سے بھی بدتر حشر کروں گا سمجھیں۔“ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر وہ فرمایا۔

”اور خبردار آج تو ایسا بے ہودہ لباس پہننے کی غلطی کر لی مگر آئندہ ایسا سوچا بھی تو، تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔“ اس کے دھاڑ پر وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

”فوراً بدلو کپڑوں کو اور جلدی ریڈی ہو کر آ جانا میں نیچے ویٹ کر رہا ہوں۔“ کہتا ہوا وہ چلا گیا اور وہ زخمی دل اور بے جاں ہوتے وجود کے ساتھ صوفے پر ڈھسے گئی‘ ساڑھی کا پلو جگہ جگہ سے جل کر کتنا بدنام لگ رہا تھا اور اس کے سفید بازو پر نیل تک پڑ چکے تھے پر اس کے الفاظ کے دیئے گھاؤ کے سامنے یہ کچھ بھی نہ تھا‘ دل چاہا زور سے دھاڑ کر روئے پوری دنیا کو اٹکھا کر کے اس شخص کی اصلیت دکھا دے پر وہ اپنی بے بسی کا تماشہ نہیں بنانا چاہتی تھی اس شخص سے شادی کرنے کا فیصلے سزا اس کا اپنا تھا اور اب اسے ساری عمر اپنی اس غلطی کا بوجھ اٹھانا تھا گال پر آتے آنسوختی سے صاف کر کے وہ الماری کی جانب بڑھی ریڈنگ کراول سلور والا کراٹا سلیکٹ کر کے وہ واش روم میں جا بھی چہرے پر پھنڈے پانی کے چھپا کے مارے کپڑے بدل کر وہ باہر نکلی آنکھوں کے کنارے ریڈ ہو رہے تھے جنہیں مہارت سے میک اپ میں چھپا کے اس نے جیسے خود پر خول ساڑھالیا تقریب میں سب نے ہی تقریباً ان کے جوڑے کی تعریف کی‘ ذکر یا بھی اسے بازوؤں کے حصار میں لئے ہر ایک سے خوش اخلاقی سے ملتا رہا‘ جیسے کچھ دیر قبل ان کے مابین کچھ ہوا ہی نہ ہو مردہ اس کی اداکاری پر عرش عرش کر اٹھی وہ تھکن کا بہانہ کر کے وہاں سے فوراً چلی آئی انی سب کا سامنا کرنے کی اس میں مزید سکت نہ تھی۔

☆☆☆☆

”کتنی زبردست لگ رہی تھی نا تم یہاں سب تمہارے اور ذکر یا کے کپل کی تعریف کر رہے تھے کتنی لگی ہونا تم مردہ اتنا پیار کرنے والا شوہر‘ امیزنگ لائف نہ کوئی روک ٹوک‘ ذکی بھائی کیسے تمہارے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔“ آج ہانیہ اس کے ہاں آئی تھی اور اس کی تمام باتیں ذکر یا کی تعریفوں سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتیں مردہ کا بند کرے میں جیسے دم گھٹنے لگا اس نے اٹھ کر کھڑکی کے پٹ وا کر دیئے سرد ہوا کے جھونکے نے اسے اندر تک پرسکون کر دیا۔

”جازی کالا سٹ سیمپل چل رہا ہے اس کے بعد کیا پلان ہے تم دونوں کا؟“ وہ بات کا رخ بدل کر بولی ذکر یا نامہ سن سن کر جیسے وہ اگتا گئی تھی۔

”ارے جازی صاحب کے بہت اونچے اونچے خواب میں وہ یو ایس اے جانا چاہتا ہے ہائر اسٹیڈیز کے لئے نجانے اس کے دماغ میں کیا خناس ساگئی۔“

”تم اسے منع کیوں نہیں کرتیں۔“

”اب ہر کوئی زکریا بھائی کی طرح تھوڑی تابن سکتا ہے۔“ وہ اور بھی نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی پرمردہ کا دماغ اسی ایک جملے میں انک کر رہ گیا۔

”ہاں اب ہر کوئی زکریا کی طرح تھوڑی تابن سکتا ہے۔“

☆☆☆☆

آج ویک اینڈ تھا زمر بھابھی بچوں کو لئے ادھر ہی چلی آئیں زکریا کسی کام سے صبح سویرے ہی نکل گیا بچوں نے شورا اور ہنگامے سے پورا گھر سر پر اٹھالیا زمر منع کرنے لگی تو اس نے روک دیا۔

”کھیلنے دو نا اس گھر کی دیواروں کو بھی ان معصوم قہقہوں سے مانوس ہونے دو۔“ اس نے تو بات یونہی کہی تھی پر زمر تو جیسے اس کے سر ہوئی۔

”آں ہاں دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں مگر جب تمہارے اپنے بچے ہوں گے تب تمہیں پتا چلے گا۔“

”تم تو ہو ہی زمر سدا کی ناشکری پر جب میرے بچے ہوں گے تو تم دیکھنا انفیکٹ ہم نے تو بچوں کے نام تک سوچ لئے۔“ فروٹ باسکٹ میں پھل سجاتے وہ مڑی تو زبان کو جیسے تالا لگ گیا زکریا کی نظریں اف سامنے زکریا کو پا کر وہ اپنی جگہ شرم سے پانی پانی ہو کر رہ گئی۔

☆☆☆☆

موسم نے کروٹ کیا بدلی وہ ٹیرس پر کھڑی ننھی ننھی بوندوں سے کتنی دیر بھٹکتی رہی وہ کبھی دیوانی ہوا کرتی تھی اس موسم کی کتنی دیر آنکھیں موندھے وہ اس احساس کو محسوس کرتی رہی آنکھیں موندھے اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب زکریا اس کے عقب میں آن کھڑا ہوا۔

”دیے ماننا پڑے گا ڈرامے باز مکار ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹ بولنے میں بھی خاصی ایسپرٹ ہو۔“ اس سے قبل کہ وہ اس سے پہلو بچا کر نکلتی وہ اس کی راہ میں حائل ہو کر کھڑا ہوا۔ الفاظ کے نشتر برسانے لگا۔

”پر کسی خوش فہمی میں ہرگز مبتلا نہ ہونا کیونکہ میں تمہارے ان ڈرامے بازیوں سے انپائر ہونے والا نہیں۔“ اس وقت اسے یہ باور کرانے کا مقصد وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

”آپ کی نظر میں اپنی وقعت و اہمیت سے بخوبی واقف ہوں اس لئے خواہ مخواہ آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ خود کو گھٹنے سے روک نہ سکی تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا سیاہ کمر کے لباس میں اس کی گوری رنگت کھڑی گئی تھی چہرے پر بارش کے ننھے قطرے گیلے بالوں کی لٹیں بلاشبہ وہ حسن کی مالک تھی خوبصورتی کبھی اس کی ترجیح نہ تھی اور نہ کبھی وہ اس کے حسن سے متاثر ہوا تھا پر نجانے کیوں وہ خود کو اسے دیکھنے سے روک نہ پایا اس کی جانب اپنے قدم بڑھنے سے روک نہ سکا۔

”یہ زندگی بھی کتنی عجیب ہوتی ہے جس چیز کے پیچھے انسان اپنی تمام عمر لگا دے وہ اس کا ہو کر بھی نہیں ہوتا اور جس سے وہ تمام عمر نفرت کرتا رہے قسمت اسے ہی اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے تقدیر شاید اسے ہی کہتے ہیں سارے ارادے اور فیصلے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں بس تقدیر اپنا فیصلہ بنا دیتی ہے جس کے سامنے انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔“

”ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اس رشتے کو نبھانے میں نہ تمہیں کوئی سروکار ہے نہ مجھے کوئی غرض تم سب کچھ چھوڑ کر چلی کیوں نہیں جاتیں یوں خود ترسی کا شکار ہو کر زندگی گزارنے سے اچھا ہے انسان بردقت کوئی تدبیر ہی کر لے۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی اس کا بدلا انداز اسے تو لگا تھا اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا وقت بدلنے لگے گا۔

”آپ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی کیوں چلانا چاہتے ہیں اپنے فیصلوں میں اتنے خود مختار تو ہیں آپ اور رہی بات میری تو اس گھر میں میں اپنی مرضی سے چل کر آئی تھی نہ کہ زبردستی اور مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا یا انیسوس نہیں ہے۔“ نچانے اس شخص کے دماغ میں کیا خناس بھرا پڑا تھا اس کے نزدیک اس کی وفا اور قربانیوں کی قطعی کوئی اہمیت نہ تھی۔

☆☆☆☆

ہلکی ہوا اور بارش کے بعد اجلی نکھری صبح کا آغاز باہر لان میں چائے پیتے ہوئے زیب اور عمیر کے درمیان کرنٹ الیٹوز پر زور و شور سے بحث جاری تھی زمر چائے بنا کر سرو کرنے لگی دونوں کی بحث کو طوالت اختیار کرنا دیکھ کر اسے بخونچا اندازہ ہو چکا تھا کہ آج دونوں کا آؤس جانے کا قطعی موڈ نہ تھا می بھی چیئر پر بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مگن تھیں زمر انہیں چائے دے کر ان کے برابر آ بیٹھی آئلہ بھابھی دودن سے مٹکے لگی تھیں جازی صبح ہی یونیورسٹی کے لئے نکل گئی کم و بیش حدی اور سعدی کا بھی یہی حال تھا ان کے ایگزامز قریب تھے اس لئے زیادہ وقت ان کا دوستوں کی طرف کھانن اسڈی میں گزر جاتا۔

”مردہ کے بغیر گھر کتنا خالی خالی سا ہو گیا ہے پہلے اس سے گھر میں کتنی رونق تھی۔“ چائے پیتے عمیر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میری کل رات مردہ سے بات ہوئی تھی پتا نہیں کیوں بہت ڈسٹرب سی لگی وہ مجھے شاید ایسا کچھ ہے جو وہ ہم سے شیر نہیں کر پار ہی یا پھر بتانا ہی نہیں چاہتی۔“ زمر کی بات پر می ٹھک سی گئیں کہیں ان کے خدشے سچ تو ثابت نہیں ہو رہے۔

”کیا کچھ کہا اس نے تم سے؟“ می کا اندازہ تفتیشی تھا تو جواباً وہ فی میں سر ہلا گئی۔

”نہیں اس نے کچھ کہا تو نہیں پر مجھے ایسا لگا۔“ وہ فوراً کہنے لگی۔

”کیا پتا یہ تمہارا وہم ہو۔“ عمیر پر سوچ انداز سے گویا ہوا جبکہ زیب چائے لگ کوختی سے تھامے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”پر میرا خیال ہے بھابھی درست کہہ رہی ہیں شاید کچھ تو ایسا ہے جو ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہو اس دن زکر یا کالی ہیویر نہیں دیکھا آپ لوگوں نے کیا پتا وہ مردہ کے ساتھ بھی ایسا۔“ کہتے کہتے زیب خاموش سا ہو گیا جبکہ عمیر کے تاثرات میں تناؤ سا آ گیا اس کے تیور خطرناک حد تک بگڑنے لگے اس کی مردہ کے لئے جو نیت اور جذباتی پن سے ہر کوئی واقف تھا وہ جو مردہ کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا اب اتنی بڑی بات کیسے اگور کرتا اس سے قبل وہ کچھ کہتا یا کرتا ممانے فوراً بات سنبھال لی۔

”ایسا نہیں ہے وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو سب سے پہلے وہ مجھ سے شیر کرتی اور شیر تو کیا وہ تو پورا گھر ہی سر پر اٹھاتی وہ خاموش رہنے والوں میں سے نہیں ہے اپنی ذرا سی تکلیف پر کیسے ہنگامہ کر کے سب کو اٹھا کر لیتی تھی خیر اب وہ گھر بار میلی والی ہے اگر اسے کوئی مسئلہ ہوگا تو وہ خود سلجھالے گی یہ

رشتے اعتبار سے جڑتے اور قائم رہتے ہیں کہیں تمہاری معمولی سی غلطی یا جذباتی پن سے سب کے کرائے پر پانی نہ پھر جائے وہ بچی نہیں ہے، نئے ماحول اور گھر میں ایڈجسٹ ہونے میں وقت تو لگے گا، اس کا ساتھ دینے کو تم لوگ اس کے لئے کہیں مشکلیں نہ کھڑی کر دینا۔“ ماما کی بات تو درست تھی عیسر کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔  
 “آئی ڈونٹ نو ماما پر ہاں اگر اس گھر میں میری مردہ کو ذرا سی بھی تکلیف ہوئی تو آئی سویٹر میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔“ عیسر کے انداز پر وہ سہم سی کہیں اب اور نجانے کتنے امتحان باقی تھے وہ فقط سوچ کر رہ گئیں۔



کل کا دن اس کی توقع کے خلاف شاندار رہا تھا وہ زکریا کے دوست کی طرف ڈنر پر مدعو تھے اور خلاف معمول زکریا نے اسے کسی بات پر ٹوکا بھی نہ تھا بلکہ اس کا موڈ بھی خوشگوار تھا پہلی بار زکریا کے ساتھ اسے خوف کی بجائے اطمینان ہوا تھا سب کے سامنے اپنی تعریف پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی گھر آ کر پھپھوسے بھی اس کی خوشی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

”خوش رہو کسی کی نظر نہ لگے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھا سے سامنے بٹھا کر محبت سے بولیں۔  
 ”ہنستی مسکراتی رہو بیٹا تم بہت بدل سی گئی ہو پہلے جیسی بن جاؤ ہنستی مسکراتی۔“ وہ نرمی سے گویا ہوئیں۔  
 ”جب وقت حالات بدل جائیں تو انسان کو بدلنے دیر تھوڑی لگتی ہے۔“ پھپھو اس کے سنجیدگی سے کہے الفاظ پر چونکی۔  
 ”پھپھو ایک بات پوچھوں؟ زکریا کو کیا ہوا ہے وہ پہلے تو بھی ایسے نہ تھے میرا مطلب ہے کیا وہ اس شادی سے خوش نہیں تھے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا خدشہ بیان کیا۔

”کیوں کیا ہوا کچھ کہا ہے کیا تم سے زکریا نے؟“ پھپھو کوئی تشویش لاحق نہ ہو گئی۔  
 ”دیکھو تم زکریا کی باتوں کو دل پر نہ لیا کرو وہ تو ہے ہی ایسا۔“ ان کی بات ابھی جاری تھی کہ دروازہ کھلا دروازے پر کھڑے زکریا کے تاثرات کو یا ان کی باتیں سن لی ہوں وہ اپنی جگہ سچو سی بن گئی ان دونوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے وہ بیڑھیاں چڑھتے اوپر چلا گیا۔

”زکریا بظاہر جتنا سخت دکھتا ہے پر اصل میں وہ ایسا ہے نہیں وہ جن فیئر سے گزرا ہے ان سب کے بعد کہ اب بھر وہ کرنا اس کے لئے ذرا مشکل ہے وہ ساری عمر فیملی سے دور رہا ہے اسے ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا، اگر کبھی وہ نا سمجھی کا مظاہرہ کر بھی لے تو تم عقل مندی کا ثبوت دے کر اس کی باتوں کو انور کر دینا اور ان سب باتوں کا تعلق اس شادی سے قطعی نہیں ہے اس لئے اب تم وہم پالنا بند کرو۔“ وہ ہولے سے اس کا گال تھپتھا کر کہنے لگیں۔ پھپھو کی باتیں اس کے لئے وقتی دلاسا ہی ثابت ہوئیں وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو صوفے پر بیٹھا وہ اسی کا منتظر تھا ہاتھ میں دبی سگریٹ آدھی سے زیادہ جل کر راکھ ہو چکی تھی پر وہ اپنی ہی سوچوں میں گم بوٹ کی نوک سے فرش رگڑتا اس کی گہری خاموشی سے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا سنگل صوفے پر دھرا اس کا کوٹ اٹھا کر وہ ہینگ کرنے لگی۔

”مجھے نہیں پتا تم نے ماما سے کیا کہا، میری ماما بہت سیدھی اور بھولی ہیں اس لئے اپنے دماغ کا فتور اور خناس اپنے تک محدود رکھو میری فیملی کو ان سب سے دور رکھو تمہیں۔“

”آپ کی فیملی اور میں؟ میں کون ہوں کیا حیثیت ہے میری؟“ وہ شدت سے پوچھنا چاہتی تھی پر الفاظ جیسے زبان تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئے کتنی آسانی سے اسے اس کی اوقات یاد دلادی گئی تھی کچھ دیر قبل وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی ایک دم اسے زمین پر پڑ دیا گیا تھا کہ یہی تمہاری حیثیت ہے اور یہی تمہاری اوقات وہ

فقط لب کھلنے آنسو پی کر رہ گئی۔

☆☆☆☆

آفس سے واپسی پر رات وہ دوستوں کی طرف نکل گیا گھر آتے آتے ڈیڑھ بج گئے مروہ دودن سے میکے گئی ہوئی تھی ماما بھی تقریباً دس بجے تک سو جاتیں تھیں اس کے پاس گھر کی ایک شراباچی ہر وقت موجود رہتی تھی اس لئے بیل دینے کے بجائے وہ ڈور کھول کر اندر آ یا نیم اندھیرے لاؤنج میں کاؤچ پر بلاشبہ ماما تھیں۔

”مام آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“ وہ سیدھا انہی کی طرف آیا۔

”سب ٹھیک تو ہے ماما؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ وہ ان کے پاس بیٹھے فکر مندی سے گویا ہوا۔

”تم حمزہ آزر سے ملے تھے؟“ ماما کے منہ سے نکلے الفاظ ذکر کیا کو ان سے اس سوال کی توقع نہ تھی جواباً وہ

اقرار کر سکا نہ انکار بس خاموشی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

”کیا تم ملے تھے ان سے؟“ اب کی بار زور دے کر کہا گیا۔

”آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟“ عاتقی سے اعتراف کیا گیا حالانکہ وہ ماما کو تکلیف دینے کے متعلق سوچ

بھی نہیں سکتا تھا جانے ان جانے میں وہ ان کی تکلیف کا سبب بن گیا۔

”تم حمزہ سے ملتے رہے ہو ذکی یہاں تک کہ تم اس کے علاج میں بھی مدد کروا رہے ہو اور یہ سب تم نے مجھ

سے چھپا کر رکھا جس شخص کے سائے سے بھی میں نے نہیں چھپا کر رکھا جس شخص نے مجھ سے میری پرچھائی

تک چھین ڈالی اب وہ مجھ سے میری اولاد میری کل کائنات۔“

”ایسا نہیں ہے ماما آپ غلط سوچ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ ان کی بات درمیان میں کاٹ کر تیزی سے بولا۔

”تو پھر سچ کیا ہے ذکی؟“ ان کی سماعت نجانے کیا سننے کی منتظر تھی۔

”ہاں ماما یہ سچ ہے میں چھ ماہ پہلے ان سے ملا وہ شخص جیسا بھی ہو مگر اب انہیں میری ضرورت ہے وہ

ہاسپٹل انریز ہیں اور دونوں ناگوں سے پیرالائز آپ خود سوچیں کیا اب بھی میں وہاں نہ جاتا؟“ وہ سوالیہ انہیں دیکھنے

لگا جبکہ روحہ بیگم کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا۔

☆☆☆☆

”اتنا سب کچھ ہو چکا اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟“ مروہ کے منہ سے ساری روداد سننے کے بعد ہانیہ جیسے شکا کڈ رہ

گئی اسے مروہ سے قطعی اتنی سمجھداری کی توقع نہ تھی۔

”کیا تم نے آنٹی سے کچھ کہا ان سب کے متعلق؟“ آئی مین تمہیں انہیں تو بتانا چاہئے تھا وہ تمہاری ماما ہیں

انہیں یہ سب پتا ہونا چاہئے۔“ اس کے مشورے پر وہ اپنا سر پکڑ کر رہ گئی۔

”اگر مجھے ماما سے کہنا ہوتا تو میں تمہیں آ کر خوں بتاتی اور ویسے بھی میں انہیں کیا کہتی کہ اس شخص نے میری

لائف برباد کر دی جس سے شادی سراسر میری اپنی چوٹیں اور ویسے بھی بے لطف پاپا اور زیب بھائی کے علاوہ

اور کوئی خاص انٹرنسڈ نہ تھا اور ماما تو میرے اس فیصلے پر بہت غم صدمی رہنے لگی تھیں آئی ڈونٹ نو دائے پر اب میں

انہیں یہ سب بتا کر مزید دکھی نہیں کرنا چاہتی انہیں ذکر کیا سے بہت توقعات ہیں میں ان کا بھرم نہیں توڑنا چاہتی

مردہ کی باتیں۔“

”آر یومینڈ تمہیں کیا لگتا ہے سارے مسئلے تم یوں سلجھا لو گی یا پھر کہیں تم خود۔“ فقط ایک لمحہ لگا تھا اسے بات کی

تہہ تک پہنچنے کے لئے۔



”آئی ڈونٹ ٹوہنی پر میں اتنا جانتی ہوں کہ اب میں ذکی کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تم اسے میری خود غرضی سمجھ لو یا کچھ بھی میں یہ بھی نہیں جانتی کہ ذکر یا کبھی بدلتے ہیں یا نہیں مگر میں اتنا ضرور جانتی ہوں اس کی محبت میں ایک نہ ایک دن میں ضرور بدل جاؤں گی، پلیر ہنی تم پر اس کر دتم کسی سے یہ سب شیئر نہیں کروں گی۔“  
مردہ کی جنونیت سے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا مردہ سے وہ پر اس تو کر چکی پر اس کا اضطراب جیسے بڑھنے لگا تنے میں جازی کا فون آ گیا۔

”کیا ہوا ہے مردہ تم اتنی اپ سیٹ اتنی گم صم ہو کیا تم دونوں کا بھگڑا ہوا ہے یا پھر کہیں تم نے اس سے کچھ الٹا سیدھا تو نہیں کہہ دیا۔“ اس کی بات پر وہ حیران رہ گئی یعنی بے تصور ہوتے وہ تصور وار بن گئی۔  
”ہاں اچھو کلی ذرا سی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی بٹ ڈونٹ یووری میں ہینڈل کر لوں گی۔“ اس نے فوراً بات سنبھال لی۔

”you should“ چتا نہیں کیوں وہ بہت حساس ہو گئی ہے بہت بدل گئی ہے اس نے کچھ کہا تو نہیں پر مجھے اندازہ ہو گیا کسی بات کو لے کر وہ بہت اپ سیٹ ہے دھکی ہے۔

”لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں مسٹر جاذب واجد عثمان اس پچھی کی مانند جسے اپنے آشیانے کو تنکا تنکا جوڑنے میں جتنا وقت لگتا ہے ویسے ہی اپنے آشیانے سے انسیت بھی اتنی ہی ہوتی ہے مردہ دھکی نہیں ہے بس ذرا اداس ہے۔“  
”انہوں سے دور پہلے بھلا وہ کب رہی ہے شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو پھی پر میں کیا کروں مجھ سے اس کی اداسی برداشت نہیں ہوتی سمجھ نہیں آتا کروں تو کیا۔“ عمیر سے لے کر مزید جازی تک سب کو اس کی کتنی فکر تھی۔ کتنے واہمات تھے جو اگر انہیں مردہ کی حالات کی ذرا سی جھنک بھی پڑ جاتی تو بیچنا قیامت ہی آ جانی، شاید یہی وجہ تھی جو مردہ کو لب سینے پر مجبور کئے تھے اور اس نے گھر والوں کو ان سب کی بھلائی تک بڑے نہ دی بہر حال جو بھی تھا اسے اس بار انسوں ہو رہا تھا سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ مردہ کے لئے کچھ کر سکتی تھی۔



”کیا ان کا قصور اتنا بڑا تھا کہ انہیں معافی نہیں مل سکتی حالانکہ آپ نے ماموں کو بھی معاف کر دیا۔“ ذکر یا کے الفاظ ان کے دماغ پر تھوڑا بن کر رہنے لگے۔  
”ان سب میں تمہارے ماموں کہاں سے آ گئے۔“

”یہ تو آپ ہی بہتر جانتی ہیں آپ جتنا بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کریں پر سچ یہی ہے آپ کی لائف برباد کرنے میں جتنا ہاتھ ڈیڈ کا ہے اتنا ہی تصور ماموں کا بھی ہے آپ یہ بات ہر بار کیوں بھول.....“  
”بس ذکی بس۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”کیا یہ سچ نہیں ہے مام جو گھر آپ کے نام تھا وہ واجد ماموں کے نام آپ نے کر دیا اور خود اس گھر میں ترستی زندگی گزارتی رہیں حالانکہ بڑس میں بھی آپ برابر کی شریک تھیں ان فیکٹ اپنے مفاد اور مطلب کے لئے انہوں نے مردہ تک کو ہم پر مسلط کر دیا کیا یہ سچ نہیں۔“ ذکر یا کے الفاظ یہ کم از کم ان کے ذکر یا کے الفاظ نہیں ہو سکتے تھے وہ نا آشنائی سے اسے دیکھ کر سنیں۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم بھی اس شخص کی زبان بولنے لگو گے۔“ ان کا لہجہ شکرتہ مگر آواز پست تھی، ذکر یا کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا اسے ماما سے اس ٹاپک پر اس وقت بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔  
”کیا پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے کیا پیسوں کی اہمیت تمہارے لئے رشتوں سے بڑھ کر ہے ہاں میں مانتی

ہوں واجد نے وہ گھر بیچ دیا اور یہ سب میری مرضی سے ہوا نہ کہ زبردستی یا مجبوراً اور رہی بات مروہ کی تو انہوں نے مروہ کو ہم پر مسلط نہیں کیا بلکہ میں نے خود اس کا ہاتھ مانگا تھا شاید تم سے میں نے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لیں تھیں اور آج تو تم نے میرا رہا سہا بھرم بھی توڑ دیا بالآخر تم بھی اسی شخص کے بنے ہو جس کی رگوں میں لالچ لہو کی طرح دوڑتی ہے افشین وہ تو کبھی قطعی اس رشتے پر آمادہ نہ تھی بلکہ اس نے مروہ کی شادی زویب سے۔ ان کی بات پر ذی ٹھنک کر انہیں دیکھنے لگا تو انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کیا بول چلی ہیں ان کے چہرے سے جیسے کسی نے لہو نچوڑ دیا ہو ان کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ گیا کم و بیش زکریا کی حالت بھی ایسی تھی اسے اپنی سماعت پر اس بل یقین نہ آیا جیسے اسے لگا مہما سے کوئی غلطی ہوئی ہو پر ان کے چہرے کے تاثرات تو کوئی اور ہی کہانی منار سے تھے۔

”کیا ہوا مام آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔“ فطری تجسس عود کر آیا۔ روح بیگم کا چہرہ گویا تاریک پڑ گیا مگر اب سچ کہنے کے سوا کوئی چارہ جو نہ تھا۔

”ہاں ذی زویب سے زویب مروہ کا سگ بھائی نہیں ہے۔“ الفاظ کی ادائیگی کرتے انہیں دشواری ہوئی ان کے انکشاف پر زکریا تو جیسے شذر رہ گیا۔ زویب اور مروہ یہ کیسی حقیقت تھی یہ کیا انکشاف تھا تو کیا مروہ جانتی تھی کہ زویب اس کا سگ بھائی نہیں محض اسے ہی دھوکے میں رکھا گیا بدگمانیاں بڑ پکڑنے لگیں اس کے اندر جیسے لاوا سا دھنسنے لگا روح بیگم اسے کسی مشکل سے دوچار ہیں کرنا چاہتی تھیں پر اب وہ اس حقیقت کو کب تک چھپا تیں وہ اب اس مزید اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی تھیں شاید اسی طرح اس کی بدگمانیوں کا کچھ مداوا ہو جاتا یہ محض ان کا خیال تھا اس بات سے بے خبر انہوں نے اپنے ایک رشتے کو بچانے کے لئے دوسرے رشتے کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

”آئی ایم سوری مام میرے سر میں درد ہو رہا ہے میں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔“ سپاٹ سے کہتے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اور چلا گیا جبکہ روح بیگم اپنی جگہ بت بنی بیٹھی رہ گئیں۔

☆☆☆☆

آج صبح سے اس کی طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی اوپر سے کام والی ملازمہ آج چھٹی پر تھی اسد تیا اور تائی عمرے کی سعادت حاصل کرنے جا رہی تھیں تو پچھو دو دن قبل سے وہیں تھیں زکریا بھی نوپے ہی آفس کے لئے نکل گیا تھا، تھوڑی دیر بیڈ پر سنانے کے لئے لیٹ کر وہ بچن کی جانب چلی آئی سارا بچن بھرا پڑا تھا برتن الگ منہ چڑا رہے تھے اتنے دنوں سے بچن ملازمہ کے رحم و کرم پر تھا یہ حشر تو ہونا ہی تھا ضبط سے کام لیتے اسے کمر کس کر میدان میں آنا ہی پڑا صفائی اور ڈسٹنگ کے بعد وہ بچ کے لئے بریانی دم پر لگنے لگی راستہ بنا کر فریج میں رکھتے ایک دم اس کا سر زور سے چکرایا ساری دنیا جیسے اس کی نظروں کے سامنے ٹھوم کر رہ گئی اسٹول کا سہارا لینے کے باوجود وہ توازن پر قائم نہ رہ سکی بے سدھ ہوتے وجود کو دو مضبوط بازوؤں نے سہارا دیا نیم بند ہوئیں آنکھوں سے شناسا چہرہ دیکھتے اس کے لب بمشکل ہل سکے زویب۔

☆☆☆☆

آفس سے واپسی پر اس کا رخ مروہ کے گھر کی طرف تھا راستے سے اس نے پھل وغیرہ بھی لئے یہ بھی آئندہ کا ہی مشورہ تھا ورنہ اسے ایسی باتوں کی خاص پرواہ نہ تھی گھر کا مین ڈور کھلا تھا پورے گھر پر جیسے سنائوں کا راج تھا ایک پل کو وہ پچھتا یا اسے اطلاع دے کر آنا چاہئے تھا پر بچن سے کھٹ پٹ کی آواز سے اس کے قدم خود بخود اس جانب اٹھ گئے پرسا سننے کا منظر اس کا ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا غش کھا کر گرتی مروہ کو آگے بڑھ کر تھامتے گرنے سے بچایا۔ بخار سے اس کا جسم تپ رہا تھا بازوؤں کے سہارے اٹھا کر باہر نکلا سامنے سے گھر میں داخل

ہوتا زکریا ٹھک سا گیا۔

”زکریا جلدی سے ڈاکٹر کو فون کر مروتہ ازاٹ اوکے۔“ صوفی پر اسے لٹا کر اس کی ہتھیلیوں کو گرڑتے وہ پریشانی سے بولا اس کے تاثرات سے یکسر انجان اپنی پریشانی میں اس کے بدلتے تاثرات کی جانب اس کا دھیان ہی نہ گیا جن سے ناگواری عیاں تھی۔

”رہنے دوزیب میں آ گیا ہوں۔“ مگر زیب نے جیسے سنا ہی نہ ہو وہ آگے بڑھ کر جگ سے گلاس بھر کر لانے لگا تو زکریا کی برداشت کی حد جیسے جواب دے گئی۔

”میں نے کہا میں آ گیا ہوں اب تم جا سکتے ہو۔“ اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے زکریا کا بی ہویہ ہر قسم کی بناوٹ سے عاری تھا زیب اس کے رویے پر چونک سا گیا جیسے اس وقت بھی مروتہ کی کنڈیشن سے زیادہ اپنے ایٹی ٹیوڈ کی فکر تھی اس وقت وہ الجھ کر کوئی نئی پرابلم نہیں کر بیٹھ کرنا چاہتا تھا حتیٰ سے مٹھی جکڑ کر ایک سرسری نگاہ بے ہوش پڑی مروتہ پڑا لے وہ لمبے لمبے ڈاگ بھرتا وہاں سے نکل آیا اور زکریا کو تو جیسے اس کے چاہنے سے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو تے عضلات کے ساتھ ایک نظر اس کے بے سدھ وجود پر ڈالتے وہ کوئی نمبر ڈال کر نے لگا اگلے آدھے گھنٹے میں روح بیگم اور انشین زمر وہاں موجود تھیں ڈاکٹر اس کا چیک اپ کرنے لگا۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں، موکی بخار کمزوری ہے اور بی پی لو ہو گیا ہے میں نے دوا دے دی ہے تھوڑی دیر ریٹ کریں گی تو بخار اترے گا تو ہوش بھی آ جائے گا۔“ زکریا ڈاکٹر کو دروازے تک پہنچانے گیا پھر وہاں کے سرہانے بیٹھی لیج پڑتے اس پر دم کرنے لگیں دوسری جانب انشین بیگم کم مٹھی تھیں زمر ٹرے میں چائے لئے چلی آئی۔

”یہ لیس چائے پھو اور تھوڑی دیر آرام کریں ڈاکٹر نے کہا نا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ چائے کا کپ انہیں تھماتے وہ گھبنے لگی اتنے میں زکریا اندر داخل ہوا۔

”خیریت بیٹا یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔“ انشین بیگم اب زکریا سے مخاطب تھیں۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا آئی ہاں زیب کو ضرور پتا ہوگا انفیکٹ جب میں آیا تھا تو زیب پہلے سے ہی مروتہ کے پاس موجود تھا۔ کیا اس نے آپ لوگوں کو نہیں بتایا حیرت ہے۔“ زکریا کے الفاظ اور اس کا انداز انشین بیگم نے کسی خوف کے تحت چونک کر روح بیگم کو دیکھا کسی بھد کے آشکار ہونے کا خوف ایک ایسا راز جس پر پردہ اٹھ جانے کا مطلب قیامت ایک ایسی قیامت کا خوف روح بیگم نظر چرا کر رہ گئیں جبکہ انشین بیگم کی رہی سہی ہمت جیسے جواب دے گئی۔

☆☆☆☆

”کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی جب سے مروتہ کے گھر سے آئے ہیں کافی ڈسٹرب لگ رہے ہیں۔“ ہاتھوں میں نائٹ کریم مساج کرتی کب سے زیب کی خاموشی اسے ٹھک رہی تھی بالآخر پوچھ بیٹھی۔

”ہوں کچھ خاص نہیں۔“ مصنوعی کھنکھار بھر کر کہا گیا۔ اس نے زیادہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا آئلکے مزاج میں زمر بھابھی کے برعکس تھیں کافی ریزور ہنے والی جی تو شادی کو دو سال گزرنے کے باوجود اپنی اکلونی نندا اور تین سال سے مثالی تعلقات قائم نہ کر سکیں سب سے اس کا تعلق لئے دیئے ہوتا گھر کے معاملوں میں اس کی عدم شمولیت کی عادت سے وہ واقف تھا پر اب آج معاملہ اس کی اپنی ذات تک پہنچ گیا اس لئے خاموش رہنا ناگزیر ہو گیا۔

”کیا ہم نے مردہ کی زکریا سے شادی کر کے کوئی بہت بڑی غلطی تو نہیں کر لی“۔ زیب کی گہری چپ کے پیچھے کی وجہ جان کر وہ مرد سانس کھینچ کر رہ گئی۔

”کیا ہو گیا ہے زیب“ آپ بھی ایسا سوچ سکتے ہیں“۔ حیرت ہوئی جان کر۔

”یہ بات جانتے ہوئے کہ یہ سب تقدیر میں لکھا تھا اور قسمت کے لکھے کو کوئی بدل سکا ہے“۔ وہ پوچھنے

لگی۔ زیب لا جواب سا ہو گیا۔

”دیکھیں مسئلے پر ابھر کس کی لائف میں نہیں ہوتے اور پھر مردہ کے ساتھ تو ایسا کوئی سین ہی نہیں انفلکٹ وہ بہت لگی ہے وہ اس کی پھپھو کا گھر ہے وہ اپنوں میں بیاہی ہے میری طرح غیروں میں نہیں“۔ وہ بات بے بات جتنا نہ بھولتی، زیب اور اس کی لومیرج بھی اور اسی بات کا اسے قلعہ تھا وہ زمر کی طرح سرسرا میں اپنا وہ مقام نہ بنا سکی جس کی وہ حقدار بھی زیب کا دماغ اب بھی وہیں اٹکا ہوا تھا شاید تمہاری بات درست ہو پر زکریا کا رو بہ وہ یہ سب کر کے کیا پروف کرنا چاہتا ہے کہ ہم نے زبردستی مردہ کو جیسے اس پر مسلط کر دیا یا پھر وہ کہیں اور انو الو تو نہیں اس کے دماغ میں ایک دم دھماکا سا ہوا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے“۔ وہ جیسا بھی ہو پر وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے جس پر اپنی مرضی یا زبردستی مسلط کی جائے اور پھپھو نے یہ پر پوزل اس کے رضا مندی کے بعد ہی دیا ہوگا ورنہ یہ سب کچھ پاسیبل نہ تھا ساری عمر وہ بیرون ملک پلا بڑھا ہے ان ڈپینڈ زندگی گزار رہی ہے بھلا کہاں وہ ایسی زبردستی کا عادی ہوگا آئی ایم شیور یہ سب صرف تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں جہاں محبتیں ہوتی ہیں وہاں ایسی معمولی باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں کیونکہ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ زکریا ہمارے مردہ سے کتنی محبت کرتا ہے ایک دن کے لئے بھی یہاں آئے تو اس کے فونز پر فون آتے رہتے ہیں جازی کی ایجنٹ پر بھی آپ نے دیکھا تاہم کیسے مردہ کے آگے پیچھے تھا مثالی جوڑی ہے دونوں کی اس قسم کے واہیات پالنا بند کریں کیونکہ ایسے واہیات اور اندیشے محض کڑواہٹ کا سبب بنتے ہیں اس وقت تم ٹینشن میں ہو پر جب تسلی سے سوچو گے تو میری باتیں درست لگیں گی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے رساں سے کہنے لگی اس کی باتیں لاکھ درست سہی مگر ان سب کے باوجود وہ زکریا کی باتوں اور رویے کو انکور نہ کر پاتا تھا۔

☆☆☆☆

مردہ کو ہوش آ گیا تھا پھپھو کے بے جان ہوتے وجود میں جیسے جان سی پڑ گئی مابھی قدرے ریلیکس سی ہو گئیں مردہ کو پہلے سے قدرے بہتر دیکھ کر خاصی ریلیکس سی ہو گئیں عمیر بزنس میٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا جبکہ جازی اُحد اور سعدی اس سے آ کر مل لئے تھے می اور زمر بھی کھانے کے فوراً بعد چلی گئیں پھپھو بھی دوا لے کر دس بجے ہی سو جاتیں تھیں بخار تو جا چکا تھا بس نقاہٹ سی تھی پھپھو نے اسے جلنے پھرنے اور کام کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا وہ بیڈ پر بیٹھی چینل سرج کرنے لگی اور کوئی کام جو کرنے کو تھا ہی نہیں، زکریا سامنے سبگل صوفے پر بیٹھا اسوگنگ کر رہا تھا مردہ کے لئے ذکی جیسے انسان کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ کب اسے کوئی بات بری لگ جائے اب بھی پھپھو کی سخت تاکید پر وہ بیٹھی رہی ورنہ زکریا کے سامنے اس کی موجودگی میں فارغ بیٹھنا محال تھا ہاتھ میں دبی سگریٹ آدھے سے زیادہ راکھ ہو چلی تھی پر اس کی پوزیشن میں ذرا برابر فرق نہ آیا وہ گاہے بگاہے چینل پر سرج پھر اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال لیتی اس کی خاموشی نبھانے کیوں اسے بے چین کئے دے رہی تھی۔

”زیب آتا تھا“ کیا کہہ رہا تھا؟“ سگریٹ کی راکھ کو بوٹ کی نوک سے مسلتے اس کا انداز بر ملا تھا۔  
 ”زیب بھائی آئے تھے مجھے تو کچھ یاد نہیں کیوں کچھ کہا انہوں نے آپ سے“ اس نے پوچھا۔  
 ”ہونہ! اسے تم سے فرصت ملتی تو کچھ کہتا“۔ استہزاء سے کہا گیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بھائی ہے وہ میرا مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ پریشان نہ ہوتا تو کیا کرتا“۔  
 اسے ذکر یا کی حق کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

”بھائی مائی فٹ ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہو تم لوگ پر مجھے نہیں تم اپنے سارے داؤ بیچ لگا دو پر اب میں تمہارے کسی چکر میں پھنسنے والا نہیں کتنا زہر اس آدمی کے اندر بھرا تھا مردہ کو اس پل اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا مگر اب خاموش رہنا ناممکن تھا۔

”پاگل ہو گئے ہیں کیا دماغ تو خراب نہیں یہ کس قسم کی فضول باتیں کر رہے ہیں کونسا چکر چلایا ہے میں نے کتنی خراب سوچ ہے آپ کی“۔ غصے سے اس کا برا حال تھا ذکر یا کے الزام پر وہ تڑپ سی گئی۔  
 ”فضول پاگل آدمی خراب سوچ میں جیسا بھی ہوں پر کم از کم تمہاری طرح ذلیل پرسن اور کریکٹر لیس تو نہیں“۔  
 ”ذکر یا کے الفاظ نے جیسے اس کے کانوں میں پکھلا سیسہ انڈیل دیا ہو۔

”کریکٹر لیس جانتے کیا ہیں آپ میرے کریکٹر کے بارے میں جو اتنی جلدی رائے تک قائم کر لی میرا کردار جیسا بھی ہو اس کے لئے کم از کم میں آپ جیسے شخص کو صفائی دینا جو گز پسن نہیں کروں گی کیونکہ اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی، جب ہمارے درمیان اس رشتے کی ہی کوئی اہمیت نہیں تو پھر میں آپ کو صفائی دینا بھی ضروری نہیں سمجھتی“۔ اس نے غصے سے منہ تنک پھیر لیا۔

”تس آتا ہے مجھے آپ جیسے انسان پر جو نارمل ہو کر بھی اینارمل زندگی گزار رہے ہیں، افسوس ہوتا ہے اپنے آپ پر کہیں میں آپ جیسے شخص کی بیوی ہوں مگر اتنی ہی ہے مجھے اپنے آپ سے جو میں نے دل میں آپ جیسے انسان کو جگہ دی آپ جیسے شخص سے محبت کی، میں ہمیشہ یہ سوچتی رہی کہ ایک نہ ایک دن میری محبت آپ کا دل ضرور جیت لے گی میری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی ایک نہ ایک دن اس پتھر میں بھی شکاف پڑے گا پر میں غلط بھی جو آپ جیسے شخص سے اتنی توقعات وابستہ کر لیں ایک پتھر سے سر پھوٹتی رہی جو تمام احساسات اور جذبات سے عاری ہے، کھوکھلا اور ایک طرح سے اچھا ہی ہوا میں شاید یہی ڈیز رو کرتی تھی میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور آپ ابھی یہی ڈیز رو کرتے ہیں آپ سے نفرت کی جائے کیونکہ آپ کسی کی محبت اور خلوص کے لائق ہی نہیں“۔ بولتے بولتے جیسے رو پڑی اور تیزی سے اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی ذکر یا وہ تو جیسے اپنی جگہ سن سارہ گیا نجانے کیوں اسی اپنے کہے پر ندامت سی ہونے لگی اور افسوس بھی اس کا پہلی بار یوں لگا کہ اس کے اظہار نے تو ذکی کو درط حیرت میں مبتلا کر دیا یعنی جسے وہ اب تک اس کی مجبوری و بے بسی سمجھتا رہا دراصل وہ اس کی خاموش محبت بھی جو اس کے پیروں کی زنجیر بنے روکے ہوئے تھے دور نہ نجانے کب سے اس رشتے کا اینڈ ہو جاتا پہلی بار مردہ کا برا کہنا اسے برانہ لگا تھا پہلی بار اس کے آنسوؤں سے اسے تکلیف پہنچی تھی اور اس تکلیف کو وہ کوئی نام نہ دے پایا خاموشی سے بنا کچھ کہہ کر لے کر وہ باہر سڑکوں پر پھرتا رہا نجانے کیوں اب چاہ کر بھی اس کا سامنا کرنے کی ہمت جو تانہ پایا پہلی بار وہ اپنی ہی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

☆☆☆☆

رات کو جو گھر سے نکلا صبح ہی اس کی واپسی ہوئی حسب معمول مردہ ملازمہ کے ہمراہ لچ کی تیاری میں گئی

ہوئی تھی پھپھو کے لاکھ منع کرنے کے باوجود زکریا نے رات سے کچھ نہ کھایا تھا سو اس وقت پیٹ میں بھوک سے چوہے دوڑ رہے تھے ماکوٹا شتے کا کہہ کر وہ اخبار گئی شہ سرخیاں دیکھنے لگا خلاف توقع ہاشتہ لے کر وہ خود چلی آئی نرے رکھ کر وہ چائے بنانے لگی گر مگر م پر اٹھے چیز آلیٹ اتنی بکلت میں بھی وہ اہتمام کرنا نہ بھولی ذکی کانٹے کی مدد سے چھوٹے چھوٹے باہیٹ لینے لگا چائے کا کپ اس کے سامنے بیچ کر گویا اپنی مٹکی کا اظہار کیا گیا، حالانکہ اس سب میں گر مگر م چائے چھلک کر پرج کو داغ دار کر گئی گر مگر م چھینے اس کے ہاتھوں پر گر پڑے، ناراضی کا اظہار کرنے کا اچھا طریقہ ہے اس حرکت پر وہ ہولے سے مسکرایا "پانی" اسے دوبارہ بلانے کا وقت اور بہانہ مناسب لگا گلاس لئے وہ دوبارہ چلی آئی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سارے کام اسے ہی کرنے پڑتے پانی کا گلاس نکھاتے وہ پلٹنے لگی تو زکریا نے اس کی کلائی تھام لی وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی پر ناکام اس کی مضبوط تھپی قدرے فاصلے پر ان کے جانب پیچھ گیا، ممابیسھی تسبیح پڑھنے میں مشغول تھیں، اس لئے مردہ کچھ کہہ نہ سکی کے کہیں وہ متوجہ نہ ہو، اس سے قبل وہ کچھ کہتی زکریا نے اس کی کلائی جو دو تین جگہ سے چائے گرنے کے سبب ریڈ ہو رہی تھی اس پر اسے لب رکھ دینے اس کی حرکت پر وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی اپنا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے وہ اندر گم ہو گئی جبکہ اس کے گریز پر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

☆☆☆☆

زیب بھائی کے بیٹے صارم کی پہلی سالگرہ تھی اس کا جانے کا قطعی موڈ نہ تھا، لیکن پھپھو کے بے حد اصرار پر اسے حامی بھرنی پڑی اسے لینے جازب آیا تھا آف وائٹ مگر کے لباس میں نفاست سے کرلڈ کئے گئے بال میک اپ آئینے میں وہ اپنا تنقیدی جائزہ لگنے لگی جازب جیسے ہارن پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا۔ تیزی سے گفٹ پیک اٹھاتے پھپھو سے ملتے دوٹکی اسی وقت زکریا کی کار پورچ میں آن رکی پھپھو نے گھٹنوں کے درد کے سبب جانے سے منع کر دیا تھا، زکریا ان کے برابر صوفے پر بیٹھا، اس کا انداز اور خاموشی ماما کو لگا اسے شاید مردہ کا یوں جانا ناگوار گزرا نہ اس لئے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر سے بال پٹاتے نرمی سے گویا ہوئیں۔

"کیا ہوا ذی؟" مردہ کو میں نے ہی پریشن دی تھی وہ مجھ سے پوچھ کر گئی ہے اور کیا ہو گیا ہے تمہیں تم پہلے کبھی ایسے نہ تھے یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا اور ری ایکٹ کیوں کرنے لگے ہو، ان کی بات پر وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"مام آپ ہمیشہ دوسروں کی پرواہ کرتی رہیں اور افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ بھی مجھے سمجھ ہی نہ سکیں۔" اس کا انداز شگفتہ تھا۔

"آپ آج بھی وہی کر رہی ہیں جو برسوں قبل کیا تھا پرایوں کو اپنوں پر فوقیت دے کر برسوں پہلے بھی آپ نے ایسا کیا تھا ماموں کو ڈیڈ پر فوقیت دے کر۔" روحہ بیگم نے اس کی بات پر چونک کر دیکھا۔

"میں ماں ہوں تمہاری مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے بھلا اور رہی بات تمہارے ڈیڈ کی تو اس شخص کا اتنا ہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کی سزا مجھے اب تک مل رہی ہے۔" زکریا کے الفاظ سے جیسے ٹپس بجتی تھی۔

"ضروری تو نہیں مام جیسا آپ سمجھ رہی ہوں سچ وہی ہو آئی میں آپ کو ماموں کی اصلیت کیوں نظر نہیں آرہی، ان کی بے حس، خود غرضی، ضروری تو نہیں ڈیڈا کیلے ہی قصور وار ہوں کیا پتا ماموں بھی اس سب میں برابر کے شریک ہوں۔" اس کی بات پر روحہ بیگم نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”آخر تم بھی اس شخص کی زبان بولنے لگ گئے میری اتنے سالوں کی محنت کو اس شخص نے ایک ہی بار میں مٹی میں ملا دیا بہت شاطر کھلاڑی نکلا وہ میری زندگی کی بساط الٹ کر بھی اسے سکون نہ ملا اب میری بچی کبھی زندگی میں بھی زہر گھولنے سے بعض نہ آیا چلو اس کی تو فطرت ہی یہی تھی برتم سے مجھے فطری یہ امید نہ تھی زکر یا وہ بازی ہار کر بھی جیت گیا اور میرے حصے میں صرف مات ہی آئی۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”پلیز مام۔“ آپ تصویر کا دوسرا رخ کیوں نہیں دیکھ رہیں آخر ساری عمر ماموں نے آپ کو دیا ہی کیا ہے سوائے دکھ تکلیف کے کیا اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے زکر یا حد درجہ انے ننھیال سے نہ خوش لگ رہا تھا۔

”یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو ماموں ہیں وہ تمہارے۔“ روح بیگم نے سرزنش کرتے کہا۔

”ہاں مگر سوتیلے رعوت سے کہا۔“ روح بیگم تاسف سے اسے دیکھنے لگیں۔

”اور سگا کون ہے وہ باپ جس نے تمہاری ماں کو بے بس لا چار سمجھ کر آدھی رات کو گھر سے نکال کر در بدر کر دیا صرف چند نکلوں کی خاطر۔“ زر پرستی کی لالچ کی خاطر رشتوں کو بے مول کر دینے والے سکوں سے وہ سوتیلے بہتر ہیں جنہوں نے ساری عمر مجھ سے یہ تک چھپائے رکھا کہ آذر نے گلبرگ والا گھر بیچ دیا وہ تمہاری تعلیم کا خرچہ اٹھاتے رہے اور مجھے لگا کہ یہ سب اس بنگلے کے عوض آنے والی رقم تھی حالانکہ میں غلط تھی وہ تو مجھے عمیر سے باتوں باتوں میں پتا چلا وہ نہ میں ساری عمر اس کھوکھلے زعم میں مبتلا رہتی۔“

”ذکی چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔“

”مگر وہ گھر تو ماموں نے بیچا تھا۔“ وہ بے یقین سا تھا۔

”وہ گھرا بانے میرے نام کر دیا تھا کسی کی مجال بھی جو میری مرضی کے خلاف ایسا کرنے کا سوچ بھی سکے تمہاری اسٹڈیز کے لیے مجھے خاطر رقم کی ضرورت تھی زیور بچنے سے واجد بچے منع کر دیا وہ تو بخوشی تمہارے اخراجات برداشت کرنے کو تیار تھے مگر میں مزید کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی اس سے بے خبر کے ساری عمر ان کے احسانات کے بوجھ تلے دب کر رہنا ہوگا واجد نے مجھ سے وہ گھر خرید لیا مگر یہ اصلیت بعد میں کھلی کے واجد نے یہ گھر صرف اس لیے خریدا تھا کہ وہ یہ گھر حمزہ کو دے سکے، حمزہ نے مطالبہ کر دیا تھا تمہیں لینے کا واجد، اسد یہ بات بخوبی جانتے تھے میں تمہارے بغیر نہیں رہ پاؤں گی یہ سب انہوں نے صرف اس لیے کیا میرے علم میں لائے بغیر ان سوتیلے بھائیوں نے سکوں سے بڑھ کر اپنا حق ادا کر دیا۔“

”حمزہ اسے تو صرف پیسوں سے غرض تھی اسے فطری تم میں کوئی دلچسپی نہ تھی کروڑوں کی پراپرٹی کے لیے صرف اس نے یہ داؤ کھیلا بھلا اس سے وہ کیسے دستبردار ہوتا۔“

”کیا اب بھی تمہیں ان کے خلوص پر شک ہے جن کا احسان میں مرتے دم تک نہیں اتار پاؤں گی۔“

”یہ کیسا سچ تھا؟“ کتنا کرب ناک سچ تھا وہ تو ساری عمر اپنے باپ کو بے قصور سمجھتا رہا اس شخص کو جس نے اس کی ماں کو سوائے ذلت و تکلیف اور اذیت کے کچھ نہ دیا تھا اور جن ماموؤں کے خلوص پر وہ شک کرتا رہا اب وہ ان سے آنکھ ملانے کے بھی قابل نہ رہا تھا آگہی کا عذاب حقائق سے شناسائی اسے نظر چرانے پر مجبور کر گئے

مرودہ سے بھی ساری عمر اس کی فیملی کی وجہ سے نفرت کرتا رہا حالانکہ وہ اس کی شریک حیات تھی اپنے دل میں اس کی محبت کا پودا بننے سے قبل ہی اس نے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا اس کی ناپسندیدگی کب نفرت میں بدلی اسے پتہ ہی نہ چلا وہ شروع سے انہیں قصور وار سمجھتا رہا اپنی مام کی اجڑی زندگی کا مگر اصل قصور وار اپنے باپ سے چاہ کر بھی وہ



نفرت نہ کر پایا وہ عجب کشمکش میں گھرا تھا اس کے فیصلے کرنے کی قوت گویا ختم ہو گئی وہ مماسے ایک لفظ تک نہ کہہ پایا اب کچھ بھی کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی بس خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں بند ہو گیا اس وقت وہ صرف اکیلا رہتا چاہتا تھا۔

”کس دروازے پر وہ آن کھڑا ہوا تھا نہ آگے کوئی راہ تھی نہ پیچھے کوئی راستہ دل نہ مہم کی بات کو جھٹلا پایا اور نہ ڈیڈ کو الزام دینے پر آمادہ تھا خود کو وہ کسی کہنی شکنجے میں قید تصور کرنے لگا جس میں ہوا کا کوئی درزن نہ تھا وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆

اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا سب کچھ جیسے گڈنڈ ہو رہا تھا وہ چھ ماہ سے اس آذرنامی شخص سے ملتا رہا جو اس کا باپ تھا وہ باپ جس نے اولاد کی پروا نہ کرتے ہوئے صرف چند نکلوں کی خاطر اس کی ماں کو چھوڑ دیا تھا وہ باپ جس نے اپنے اندر کا ذہل پل اس کے اندر اتارا تھا اسے اپنوں سے متنفر کرتا رہا اپنا زہر اس کی نسوں میں بھرنے لگا اور وہ پھر بھی باز نہ آیا اس کے ماضی کے ساتھ ساتھ وہ اس کے حال کو بھی نگل لینا چاہتا تھا سب کچھ جانتے ہوئے بھی زکریا ان کے دل میں نفرت پیدا نہ کر سکا البتہ ماموؤں کے لیے اپنی سوچ پر اسے کافی شرمندگی تھی اور اب وہ اس سوچ کو بدل رہا تھا مماس کے لیے، اپنے لیے، سب کے لیے وہ خود کو بدل دینا چاہتا تھا شاید یہی آخری راستہ تھا سوچتے سوچتے کب اس کی آنکھ لگی آہٹ کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی ٹیبلٹ لینے کیونکہ درد کافی ہلکا ہو گیا تھا مگر بو جھل پن اور درد کی ٹیس ابھی بھی اٹھ رہی تھی صوفے پر بیٹھی مردہ سینڈل کے اسٹریپ کھولنے لگی لیریز میں کئے سکلی بال کندھے اور شانوں پر بکھرے تھے جبکہ اس کے چہرے پر چھلن بھی ذکی کی جانب اب بھی اس کا دھیان نہ تھا سینڈل ریگ پر سجا کر بالوں کی اچھی پونی باندھے چہرے پر چھپا کے مار کر واش روم سے نکلی نیوی بلیوسٹ پہنے اب وہ بالکل تازہ دم لگ رہی تھی اسے واش روم سے نکلتا دیکھ کر اس نے جھٹ سے آنکھیں بند کر لیں مبادا کہیں وہ دیکھ نہ لے وہ دھیرے سے چلتی اس کی جانب چلی آئی چادر برابر کر کے اس کے ماتھے کا نمپرچر چیک کیا جو کافی حد تک گرم تھا۔

”وہ پریشان ہی ہوگی“۔ سائینڈیل پر رکھے ٹیبلٹس دیکھ کر اسے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا اب یقین بھی ہو گیا اپنی لاعلمی پر غصہ آنے لگا اگر تھوڑی دیر قبل آجاتی تو قیامت نہ آجاتی وہ خود کو دل ہی دل میں ڈانٹنے لگی دوپٹہ نماز کے اسٹائل میں باندھے کچھ دیر اس کے سر ہانے بیٹھی وہ اس پر پڑھ کر دم کرتی رہی کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ پر آگئی اس کے اسٹائل میں باندھے انداز نے زکریا کے دل پر اٹھل پھل مچا دی جیسے وہ ہر پل ٹارچہ کرتا رہا وہ اس کی ذرا سی تکلیف پر کیسے پریشان ہو اٹھی اس کے وجود کا احساس نرم ہاتھوں کا لمس اس کا انداز اٹو کھا مگر بہت پیارا لگا تھا وہ خوش گوار حیرت میں گھیرا سوچے جا رہا تھا بلاشبہ اس کی خاموشی محبت نے اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا اعتراف کرنے میں اب عار نہ تھا۔

☆☆☆☆

ایک خوش گوار صبح کا آغاز لان میں چائے پیتے کیا گیا آج ویک اینڈ تھا تو خلاف معمول وہ گھر پر ہی تھا۔ ”تیس ہے اب طبیعت تمہاری“۔ روحہ بیگم ہر ماں سے چائے نکال کر اسے دیتی گویا ہو میں۔ ”فائن مام پہلے سے بہتر ہے“۔ ٹیکسٹ کرتے اس نے سر اٹھائے بغیر سرسری سا جواب دیا۔ ”چائے ذبردست بنی ہے دیئے“۔ مماسے آتا دیکھ کر محبت سے بولیں۔ وہ ہولے سے سکھائی۔

”کبھی ہماری کافی بھی اچھی بنا لیا ساری تعریفیں صرف ماسے بٹورنی ہیں۔“ وہ اس کے انداز پر چونک سی گئی اسے حیرت سی ہونے لگی۔

”میری مروہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے بس تم ہی ذرا تعریف میں کجوسی برتتے ہو۔“ آج مہما بھی کافی دنوں بعد کافی خوش لگ رہی تھیں۔ زکریا اب فون رکھے مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نظروں سے لکھنؤ ہوتی وہ پہلو بدل کر رہ گئی اتنے میں چاچا اور عمیر بھائی کی کارپوریج میں آن رکی سب کو باہر لان میں دیکھ کر وہ بھی وہیں چلے آئے صبح بخیر پھوپھو عمیر آگے بڑھ کر انہیں سلام کرنے لگا۔

”ایڈا السلام علیکم الیوری ون۔“  
 ”علیکم السلام جیتے رہو۔“ پھوپھو انہیں دیکھ نہال سی ہو گئیں وہ حمیر گھسیٹ کے پھوپھو کے پاس ہی بیٹھ گیا۔  
 ”خیر اتنی صبح کوئی خاص کام تھا کیا۔“

”مروہ ان کے لیے چائے بنانے اندر چل دی۔“ تو پھوپھو نے استفسار کیا۔  
 ”جی کام تو بہت امپورٹنٹ ہے کیوں نہ چائے پیٹے ڈسکس کی جائے۔“ مروہ کوڑے لاتے دیکھ کر کہا تھی  
 چاچا گلا کھکھار کے متوجہ ہوئے۔

”دراصل یہ پیپرز ہیں ان پر زکریا کے دستخط چاہئے تاکہ آگے کا پروس مکمل ہو۔“ ان کی بات پر ذکی چونک گیا البتہ مروہ خاصی ریلیکس تھی۔

”یہ کس چیز کے کاغذات ہیں ماموں؟“ ٹیبل پر دھرے کاغذات کی جانب اشارہ کرتے سوال کیا گیا۔  
 ”عثمان گروپ اینڈ کمپنی میں تمہارے شیئرز کے پیپرز ہیں جو روحہ نے تمہارے نام کر دیئے اب تم چاہو تو آفس جوآن کر کے پارٹنرشپ کر سکتے ہو چاہو تو شیرز الگ کر لو اب یہ سراسر تمہاری مرضی مگر آج سے تم اپنے شیرز کو خود سنبھالو گے۔“ اسد عثمان چائے کا سب لیتے ہوئے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگے جہاں انہیں کا ایک جال سا چمچ گیا تھا۔ وہ لوگ چائے کے فوراً بعد چلے گئے چائے کے دوران بھی ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی مگر ذکی کا ذہن کاغذات والی بات پر اٹکا ہوا تھا اضطراب تھا کہ کم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا اس کا صرف ایک ہی حل تھا بالآخر بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا گیا ممانے بھی ساری ذمے داری اس پر سونپ دی تھی۔  
 ”میں نے فیصلہ کر لیا مام میں اپنے حصے کے شیرز مروہ کے نام کرتا ہوں اب سے ان کی وہی مالک ہے۔“  
 ممانے خوشگوار حیرت سے دیکھا۔ ان کا بیٹا بدل رہا تھا حالات بدل رہے تھے یہ سب تو ہونا ہی تھا اب وہ خاصی مطمئن ہو گئیں تھیں زکریا کی یہ تبدیلی ان کے لئے خوش آئند تھی۔

☆☆☆☆

تیز ہوائیں گرج چمک کا سلسلہ کیا چل پڑا ساری رات ساون برس، صبح چرچ نکھری نکھری سی تھی آج زمر کے ہمراہ اسے مارکیٹ جانا تھا کچھ ضروری خریداری کے لئے موسم کی مناسبت سے اس نے دائٹ کرتے پر بلیک ٹال اوڈھی پرس لئے وہ سیدھی پھوپھو کے جانب چلی آئی۔

”میں زمر مارکیٹ جا رہی ہوں زمر کے ساتھ آپکو کچھ چاہئے تو نہیں واپسی پر شاید دیر ہو جائے سو چاہ آپ کو باتنی چلوں۔“ وہ صوفے پر ان کے مقابل آ بیٹھی جو بیچ پڑھنے میں مصروف تھیں۔

”کچھ خاص نہیں بس تم وقت پر آ جانا موسم کا کچھ ہمدرد نہیں۔“ وہ انہیں تاکید کرنا نہ بھولیں مارکیٹ سے نکلتے انہیں دیر ہو گئی ہلکی ہلکی بوند باندی جاری تھی اچانک زمر کو بوتیک پر ضروری کام پڑ گیا اسے بوتیک ڈراپ کر

کے وہ ٹیکسی لے کر گھر کے لئے روانہ ہوئی موسم کے تیور بگڑے سے لگ رہے تھے اسے پھپھوکی تاکید یاد آئی تو ان کے فکر مند انداز کو سوچ کر اس کے لب مسکرا دیئے مردہ ڈرائیونگ جانتی تھی پر ایک معمولی سے ایکسیڈنٹ کے بعد پاپانے اسے ڈرائیونگ کرنے سے سختی سے منع کر دیا کالج تک بھی وہ جازبی یا ڈرائیونر کے ہمراہ جاتی آج تو ڈرائیونر بھی چھٹی پر تھا ٹیکسی گھر کے سامنے رکی مینٹ کر کے پرس سنھالتی اسٹریپ بند کرنی تیزی سے وہ اندر چلی آئی اس دوران بھی وہ خاصی ہینگ چکی تھی کمرے سے بولنے کی آواز آ رہی تھی یقیناً زکریا بھی آفس سے غالباً پہلے ہی آگیا تھا۔

پرس نیبل پر رکھے پھپھو کے روم کی سمت چلی آئی ارادہ تھا ان کو اپنے آنے کے متعلق مطلع ہی کر دیے جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اس کا یہی معمول تھا کہیں آنے جانے کے لیے وہ پھپھو سے ہی پریشانی لیتی تھی زکریا سے تو خیر بات کرنا ہی فضول تھا اس کے نزدیک اس کا ہونا نا ہونا ایک برابر تھا نجاب نے کیوں اس کا اپنا رعبیت قربانی تک اس پتھر کے دل میں جگہ بنانے میں نا کام ٹھہری مایوسی سے سوچتے وہ دروازہ ناک کرنے ہی لگی تھی کہ اپنا مہن کر لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ پیچھے ہٹ گئے وہ یہ کیا کر رہی تھی اسے پتہ ہی نہ چلا نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی عادت کے خلاف وہ چھپ کر ان کی باتیں سننے سے خود کو روک نہ پائی۔

”مردہ میری بیٹی ہے میری بہو ہے یہی سچ ہے اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی اس لیے پلیز ذکی تم بھی مجھے درس مت کرو۔“ روح بیکہ تھاپا سی ہو کر سنبھل سنبھل کر بولیں۔

”نہیں مام یہ سچ نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے جو آپ جانتی ہیں مجھے سچ جانا ہے پلیز ٹیل می مام کو نہ ہے وہ ایسا کونسا راز ہے جو برسوں سے مدفون ہے بہت الجھن ہے سب سلجھانا چاہتا ہوں میں نے اس دن آپ کی اور آٹھ کی باتیں سن لیں تھیں ایسا کونسا راز ہے جو آپ برسوں سے آج تک چھپائے ہوئے ہیں مام پلیز آپ کو میرے سر کی قسم۔ ان کا ہاتھ لے کر اپنے سر پر رکھتے زکریا نے گویا انہیں ایک نئے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ دسمبر کی ایک رات تھی جب افشین نے دو جڑ والے بچوں کو جنم دیا تھا جن میں سے ایک مردہ تھی ہاں ذکی جازبی کے ساتھ پیدا ہونے والی بچی موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی واجد کا مارے غم کے برا حال تھا ان کی برسوں کی تمنا خواہش پوری ہوئی تھی مگر وہ بھی کیسے اپنی مردہ بیٹی کو ہاتھ میں لیے وہ کتنی دیر روتے رہے اس رات بھی ٹوٹ کر بارش برسی تھی شاید اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جانے آئی تھی اس دن اس پرائیویٹ کلینک میں صرف ایک موت واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ صبحی نامی اس عورت نے بھی دم توڑ دیا جو اس کلینک میں بطور ہیملپر کام کرتی رہی تھی ہاسپٹل والے اس کے شوہر یا فیملی کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے صبحی کلینک کے پاس ہی چھوٹے سے گھر میں کرائے پر رہتی تھی اس کا شوہر اسے چھوڑ کر جا چکا تھا بھی حالات سے مجبور وہ یہیں کام کرتی رہی تین دن وہ ہاسپٹل میں بڑی رہی اور ایک لاغر، کمزور سی بچی کو جنم دے کر موقع پر ہی دم توڑ گئی جس کا اب آگے پیچھے کوئی نہ تو بہت سوچ سمجھ کر اس ننھی فرشتے جیسی لڑکی کو یتیم خانے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ اب اس کا کوئی وارث نہ تو کوئی اس کی ذمے داری قبول کرنے کو تیار نہ تھا نجاب نے یہ لڑکی خبر کیسے واجد کے کانوں تک بھی پہنچ گئی شاید قسمت کو بھی یہی منظور تھا واجد نے ڈاکٹر جمینی سے بات کر کے اس لڑکی کی ذمے داری قبول کر لی وہ نیلی آنکھوں والا معصوم سی لڑکی حالات کی ستم ظریفی اس کے دنیا میں آنے سے قبل ہی اس کا سب کچھ چھن گیا تھا واجد نے لڑکی کا ذمے داری قبول کرتے وقت ایک بات ڈاکٹر سے اور عملے کے ذہن نشین کرادی کہ اب وہ ان کی ہی بیٹی ہے۔ قسمت کے لکھ کو تو بدل نہیں سکتے پر وہ اس لڑکی کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے اس بچی کو اڈاپ کرنا

کے بجائے اپنا نام دیا اور یہ بات اپنے خاندان والوں تک سے چھپائے رکھی کے مردہ ان کی بیٹی نہیں ہے ان کا خون نہیں ہے گھر میں یہ بات صرف واجد، اسد، افشین اور میں جانتے تھے میر اور زیب کے کانوں میں بھی سنی سنائی بات پڑ گئی مگر ان کے نزدیک یہ اہم نہ تھا کے مردہ کون ہے بلکہ انہوں نے ہمیشہ مردہ کو سگوں سے بڑھ کر چاہا ڈاکٹر جی نے بھی اس عورت کے کيس میں یہ لکھ دیا کے حالت زچگی میں ہی ماں پچی دم توڑ گئے اس طرح دنیا والوں کی نظر میں بھی اب وہی سچ ہے جو ہم نے بتایا اس کالی رات کے پردے نے سارے سچ چھپا دیے اب حقیقت یہی ہے کے مردہ واجد کی بیٹی ہے اور ہمارا خون۔۔۔ مردہ کو لگا کسی نے اس کے سارے جسم کا خون چوڑ دیا ہو وہ اپنی جگہ پھر کاہت بنی کھڑی رہی یہ کیسا سچ تھا کتنا بھیا یک سچ کہا سچ بھی اتنا بھیا یک ہوتا ہے اسے تو بھی حساس تک نہ ہونے دیا کے وہ پرانی ہے اور وہ کتنی بیوقوف تھی وہ جنہیں تمام عمر اپنا بھتیجی رہی ان سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ تھا کوئی رشتہ ہی نہ تھا اور اس کا اپنا کون تھا کوئی نہیں اس دنیا کی بھیڑ میں تنہا ہو کر رہ گئی تھی آنکھیں پھرانے لگیں اس کا وجود کاٹنے لگا، وہ باہر نکلی اسے نہ راستوں کا پتا تھا نہ منزل کی خبر بس وہ چلے گئی اپنے سارے تک سے چھپ جانا چاہتی تھی خود سے منسلک لوگوں سے جن سے اب اس کا کوئی تعلق نہ تھا وہ راستے منزل کا نین کئے بغیر چلنے لگی تھکنے لگی مگر رکنے کا اب سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا وہ بہت دور چلے جانا چاہتی تھی ان کھوکھلے بطنی رشتوں سے کوئی تعلق استوار نہیں رکھنا چاہتی تھی سب کچھ جانتے بوجھتے اسے دھوکے میں رکھا گیا کیوں پھپھو، پاپا، ماما، میر بھائی، زیب بھائی سب کچھ جانتے بوجھتے اسے اندھیرے میں رکھا گیا کیوں۔۔۔ سڑک کے کنارے بیٹھ کر وہ اپنی بے بسی پر رونے لگی اپنی قسمت پر بارش اب بھی برس رہی تھی مگر طوفان صرف اس کے در پر بار تھا۔

☆☆☆☆

سچ جان لینے کے بعد اس کی حالت بھی کم و بیش مردہ جیسی تھی وہ معصوم لڑکی تھی وہ ہر پل اذیت دیتا رہا جہ کر تار ہا اس کی نفرت بھی صرف ان لوگوں کی وجہ سے سہنا پڑی جن سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا ڈیل کی مام کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا موازنہ کیا تو ڈوب مر جانے کے قریب ہوتا اور مردہ جسے وہ ناحق سزا دیتا رہا اور وہ پچ چاہ سکتی رہی مگر کیوں؟

”کیا وہ اس کی معافی کے لائق تھا؟“

”کیا اب بھی وہ اس کی محبت کے لائق تھا؟“ اس کے اندر سنائے گھیرا کرنے لگے واجد جیسے انسان کی سب کو سوچ کر اپنے آپ سے ہی نفرت سی محسوس ہونے لگی جو ایک فرشتہ صفت انسان سے نفرت کرتا رہا مردہ تعلق سوچ کر اس کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی وہ اپنی ہی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

”مردہ آئی تھی مگر کب؟“ باہر نکلتے مردہ کے پرس پر نگاہ پڑتے ہی روحہ بیگم بڑبڑائیں زکریا بھی تیزی سے کل آیا ایک لمحے دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اگلے لمحے ہی دونوں کی سمجھ میں پوری کہانی آگئی یا نے فوراً زمر کا نمبر ڈائل کیا۔

”کیا مردہ ابھی تک نہیں آئی؟“ پردہ تو کب سے ٹیکسی لے کر نکلی تھی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ زمر کو بھی نئی پریشانی لاحق ہو گئی۔

”ہاں الٹو کی آگئی ہوگی یقیناً ٹیرس پر ہوگی میں دراصل ابھی ابھی گھر پہنچا تھا اس لیے مجھے آئیڈیا نہیں تھا گھر پر ہوگی اس لئے فوراً پریشانی میں نہیں ڈسٹرب کر دیا۔“

”اٹس اوکے انفیکٹ مجھے اچھا لگا“ آپ کو اس کی اتنی فکر ہے۔“ زمر کی جیسے جان میں جان آگئی تھی مگر فون بند کر کے بھی ذکی کا اضطراب کم نہ ہوا پریشانی میں سر تھا بے بیٹھ گیا۔

”اب کیا ہوگا مردہ نے سب کچھ نہ لیا اب میں اٹشین کو کیا جواب دوں گی کہ ایک راز تک نہیں رکھ پائی اور واجد وہ بھی مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا اور مردہ اس بچی کا میں کیسے سامنا کروں گی؟“ روح بیگم کو لاتعداد خدشے لاحق ہونے لگے۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا مام زسٹ می“ میں اسے واپس لاؤں گا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا آئی پراس۔“ ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے اسے اپنی ہی تسلی کھولی لگی۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا گھر کئی مرتبہ چھان ڈالا مگر نتیجہ صفران کے دل نے شدت سے یہ دعا کی تھی کہ کاش مردہ نے ان کی باتیں نہ سنی ہوں کاش سب کچھ پہلے جیسا ٹھیک ہو جائے۔

☆☆☆☆

گاڑی انجان سڑکوں پر دوڑتی رہی ان راستوں پر جہاں سے وہ کبھی گزر راجک نہ تھا کار سڑک پر دوڑاتے اسے اپنی تمام محنت رائیگاں محسوس ہونے لگی بارش کے سبب سڑکوں پر رش نہ ہونے کے برابر تھا اکا دکا لوگ ہی چہل قدمی کرتے نظر آتے کہیں سڑکیں تو سنسان پڑیں تھیں تھک ہار کر اس نے اسٹریٹ پر مکا دے مارا۔

”ڈیم اٹ۔“ مغرب کی اذانیں ہونے لگیں اس کی تمام توانائی جیسے جواب دے گئی اس وقت وہ خود کو دنیا کا بے بس ترین انسان تصور کرنے لگا، مردہ کے متعلق اس کے گھر والوں کو بھی کچھ پتا نہ تھا تو وہ کہاں جا سکتی تھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے ختم ہو کر رہ گئیں کہ جامع مسجد کے سامنے روکتے وہ اندر بڑھ گیا نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کئے تو اس کا دل کیا دھاڑیں مار مار کر روئے اتنا بے بس تو وہ کبھی نہ ہوا تھا اتنی تکلیف آج سے پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی مگر کیوں مردہ کی تکلیف اس کا درد ان سب کا تصور وار ہوئی تھا اور اب وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا نماز کی ادائیگی کے بعد وہ مسجد سے نکلا بارش کی رفتار پہلے سے کافی کم تھی کار کی سمت بڑھنے کی بجائے وہ سڑک پر پیدل چلنے لگا اس کے رواں رواں سے مایوسی چھلک رہی تھی شکایتی قدموں کے ساتھ وہ انجانے راستوں پر چلنے لگا ایک بار بس ایک بار اس کے ملنے کی دعا دل نے شدت سے کی تھی اور دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں اسے اندازہ نہ تھا سڑک کے پرلے کنارے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی وہ بلاشبہ مردہ ہی تھی اپنے دھندلائی آنکھوں کو رگڑ کر باقاعدہ یقین کرنا چاہا اور تیزی سے روڈ کر اس کر کے اس کی سر پر پہنچا بچکیوں کے سبب اس کا وجود ہولے ہولے سے لرز رہا تھا بارش میں نا جانے کتنی دیر سے بھٹکتی رہی تھی اپنے ارد گرد سے بیگانہ اس کا دل ندامت کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا اس کے فضول ضد کے سبب اس پر سارا راز افشاں ہوا تھا وہ اس کے برابر بیٹھ گیا تھی اس نے روتا چرا اوپر کیا زکریا کو سامنے پا کر وہ جیسے اپنا ضبط کھو بیٹھی اور اس کے کندھے سے لگ کر زار و قطار روئے لگی۔

”میں ہی کیوں ذکی، میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا، کسی اور کے ساتھ کیوں نہیں، تمہارے ساتھ کیوں نہیں۔“ اس کے شرٹ کے گریبان کو مٹھی میں جکڑتے وہ روتے ہوئے بولی۔

”کون سے اب میرا سب ختم ہو گیا میں اکیلی رہ گئی کوئی نہیں ہے میرا کچھ نہیں بچا سب ختم ہو گیا سب ختم کر دو، میں خالی ہاتھ رہ گئی جن کو اپنا بھتیجی رہی وہ تو میرے کچھ بھی نہیں کوئی رشتہ نہیں میرا ان سے جنہوں نے ساری عمر مجھ سے چھپائے رکھا۔“ وہ سسک رہی تھی آنسو شرٹ کو بھگونے لگے ذکی اس کی پشت کو سہلانے لگا۔

”نفرت کرتی ہوں میں تم سب سے، کوئی نہیں ہے میرا میں لاوارث ہو اس لیے اب مجھ پر کوئی احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ جھجکے سے اسے پرے کرتے دھاڑی ذکر کیا کے لیے پوچیشن ناقابل یقین تھی۔

”انیف مردہ جسے تم ہمدردی اور احسان کا نام دے رہی ہو دراصل وہ ہماری محبت ہے سمجھیں کسی نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر سب کو تمہاری پروا ہے سب تم سے بے تحاشہ پیار کرتے ہیں ہم سب تمہارے ہی تو ہیں تم ایلی تھوڑی نہ ہو۔“ وہ نرمی سے اس کے بال سنوارتے کہنے لگا۔

”بس بہت ہو گیا ذرا مہاب میں تمہاری باتوں میں نہیں آنے والی اگر آج مجھے کچ پتا نہ چلتا تو شاید ساری عمر میں اپنوں پرانیوں کا فرق نہ سمجھ پاتی ہاں ٹھیک ہے وقت انسان کو بہت کچھ سیکھا دیتا ہے میری زندگی کا بھی ب سے بھیا نک باب میری آنکھوں کے سامنے آ گیا میں ساری عمر تمہاری نفرت سہتی رہی صرف اس لئے کے یک دن تم بھی بدل جاؤ گے پر میں غلط تھی تم کیونکہ میری پرواہ کرو گے تم بھی آخر اسی عورت کی اولاد ہو جس سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں تم سب جھوٹے، دھوکے باز اور خود غرض ہو، مطلبی ہو۔“

”شٹ اپ، تم اتنی سلفیش کیسے ہو سکتی ہو۔“ اس کی بدگمانی بڑھتے دیکھ کر زکریا کو طیش آ گیا جبکہ وہ ہلنق تھی اس کا منہ کھٹنے لگی۔

”ہاں خود غرضی دکھائی ماموں نے ایک معصوم بے سہارا لڑکی کو بیٹی کا مقام دے کر اس سے بے تحاشا محبت لی معاشرے میں مقام دیا یولو کیا سہ۔“ ادوگی انہیں ان کی خود غرضی کی قدرت نے ان سے ان کی بیٹی چھین لی تو یہ ان کا قصور تو نہ تھا انہوں نے تمہیں سگی بیٹی سے بڑھ کر چاہا، فشین آئی، عمیر، زیب سب تم سے بے تحاشا پیار کرتے ہیں بے غرض بے لوث محبت رشتے صرف خون کے نہیں احساس کے بھی ہوتے ہیں یہی احساس انسانیت ہر شے سے بڑھ کر ہے اور اگر احساس خون کے رشتوں میں بھی نہ ہو تو ہر رشتہ بے معنی ہو جاتا ہے ان کی بے لوث محبت کو اپنی بے اعتباری کی نذر کر کے بے مول نہ کر دیکھو کہ ہر رشتہ اعتبار سے بنتا اور بڑتا ہے اعتبار نہ تو ہر رشتہ بے معنی ہو جاتا ہے۔“ وہ چونکی کتنا کرب تھا کتنی شگفتگی تھی اس کے چہرے پر۔

”مگر انہوں نے کچ کیوں چھپایا؟“ سوال کو اپنی زبان تک آنے سے نہ روک پالی۔

”ایک بار اپنی بیٹی کھونے کے بعد دوسری مرتبہ شاید وہ اپنی بیٹی نہیں کھونا چاہتے تھے۔“ وہ شاید جانتے تھے لہجہ جان کر تم ایسا ہی ری ایکٹ کرتیں یولو کیا پھر انہیں تمہارے انداز سے تکلیف نہ ہوتی انہوں نے ہر ملاوٹ سے ماورا تمہیں اپنا یا اگر یہ ان کی خود غرضی تھی تو ان کی یہی سزا ہے ایک بیٹی تو تقدیر نے ان سے چھین لی اب تم سری مرتبہ بھی چھین لو اگر تمہیں اب بھی ہم سب کی محبتوں پر شک ہے تو چاہو کہیں بھی چلی جاؤ سب کچھ چھوڑ گا زکریا سوچو کیا رہ پاؤ گے سب کے بغیر پایا کے بغیر ان کی محبتوں کے بنا ماما، عمیر سب کے بغیر میرے بغیر۔“

اس کی بات پر اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ آنکھوں میں محبتوں کا بہاں سینے اسے دکھ رہا تھا وہ نظریں پھیر کر رہ گئی منڈی ہوا پس چلنے لگیں بھکے کپڑوں سمیت اسے ٹھنڈی لگنے لگی۔ ماما بالکل ٹھیک کہتی تھیں وہ واقعی بہت جلد بانی ہو جاتی ہے۔ وہ بھلا کیسے ان سب کے بنارہ پانی اس کچ پر تو اس نے سوچا ہی نہ تھا ماما، پاپا، پھوپھو، جن کی باتوں کی وہ مقروض تھی ان کے بغیر کیسے رہ پانی ان کے بغیر تو وہ بالکل ادھوری تھی بھلے ان سب سے اس کا کوئی ان کا رشتہ نہ تھا مگر محبت تو تھی اور جہاں محبتیں ہوں رشتے اپنے آپ بن جاتے ہیں اور زکریا اس کے چہرے کو لکھتے وہ سوچنے لگی کیا وہ ذکر کیا کے بنارہ پانی اس انداز سے سوچ کر اس کا دل ایک دم زور سے دھڑکا۔

”مانا کے بہت بینڈم ہوں بیگم پر یہ پبلک پلٹیں ہے گھر جا کر اچھی طرح نظر اتار لینا۔“ وہ اس کی جانب

نہیں دیکھ رہا تھا پر اس کی نظروں کی چوری اس سے مخفی نہ رہ سکی اس نے فوراً نظروں کا رخ بدل دیا۔  
 ”مجھے تو اچھا خاصا لکچر سنا چکا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔“ نظریں سڑک پر گرتے چپکتے ننھے بوندوں پر  
 مرکوز کئے پوچھا گیا۔

”تمہارے برعکس مروہ میں ساری عمر اپنوں میں ہوتے ہوئے محبتوں کو ترسنا ہوں پاپا نے تو پلٹ کر میری جہ  
 بھی نہ لی کہ ان کا بیٹا بھی ہے ان کے نزدیک میری کوئی ویلیو ہی نہ تھی ساری عمر دیار غیر کی خاک جھانٹا رہا  
 ، اپنائیت، محبت جیسے لفظوں سے کبھی پالا ہی نہ پڑا جیسے انسان کی صورت میں پتھر بن کر رہ گیا تھا میں اور اس پتھر  
 میں تمہاری محبت نے جان ڈال دی تمہاری محبت، وفا، تمہارا صبر، مجھے بے دام غلام بنا گیا تمہارے ساتھ کی ہوڈ  
 زیادتیوں کو سوچوں تو خود سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں میں نے تمہارا بہت امتحان لیا تمہارے صبر  
 برداشت کا اور تم چپ چاپ میری ذیادیتوں اور نفرت سہتی گئیں مجھے لگتا تھا کہ ایک دن سب اپنے گھر  
 والوں سے کہہ دو گی اور پھر اس دن اس رشتے کا اینڈ ہو جائے گا مگر تمہاری محبت نے مجھے سرتاپا بدل دیا مجھے  
 اسیر بنا لیا اس لئے آج اظہار کرنے میں کوئی عار نہیں مروہ آئی ریلی وانٹ یو محبت کا اظہار کرنا نہیں آتا ہاں فہ  
 اتنا ضرور کہوں گا میری زندگی ہے کیا تم پچھلی باتوں کو بھلا نہیں سکتیں کیا تم زندگی کے ہر قدم پر میرا ساتھ دو گی  
 اس کی بات ابھی نامکمل تھی کہ ذکی کا فون بجنے لگا اسکرین پر ماما کانگ کے الفاظ جگمگانے لگے۔

”جی مام مروہ میرے ساتھ ہی ہے۔“ کہہ کر اس نے فون مروہ کی سمت بڑھایا جو اس نے جھٹکے سے ہوئے تھام لیا۔

”ہاں پچھو، ٹھیک ہوں۔“ دوسری جانب سے بے چینی سے کچھ پوچھا گیا۔

”ہاں ممی اچھو ٹکی میں اپنا پرس اور فون گھر پر ہی بھول گئی تھی اور پھر راستے میں میری ایک فرینڈ مل گئی تو اس  
 طرف آگئی سو ری لیٹ ہو گیا آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ روحہ بیگم یہ جان کر کے مروہ نے ان کی باتیں نہیں سنی  
 کے دل کو ایک دم سکون سال کیا فوراً سجدہ شکر بجالانے لگیں۔

”تم نے ماما سے جھوٹ کیوں بولا۔“ ذکر با اس کے جھوٹ پر ابھی بھی حیران تھا۔

”جب تک شیشہ شفاف ہو ہر چیز بھلی سی لگتی ہے اور جب اس پر داغ لگ جائے ہر چیز بد نما سی دیکھا  
 دے لگتی ہے میں نہیں چاہتی ہمارا رشتہ بد نما لگے اسے ہر داغ برائی سے اب مجھے بچانے رکھنا ہے اب رشتوں  
 لے کر چلنے کی میری باری ہے انہیں سچ بتا کر میں ان کا مان بھرم نہیں توڑنا چاہتی۔“ مروہ سے اس قدر ذہانت  
 اسے قطعی توقع نہ تھی وہ کسی کا قول ہے۔

”رشتوں کو اسیس دو بھٹوں کے لئے جگہ بنائے آپ بن جائے گی۔“ اس نے اسی انداز میں اس کی بات اسے لوٹا دی۔  
 ”اہم میرے ساتھ رہ کر تھوڑی بہت عقلمند بھی ہو گئی ہو ویسے تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“  
 زندگی کے سفر میں تم میری مسافر بنو گی اپنی محبت کا کشکول تمہارے سامنے کھڑا ہوں تمہارے ساتھ  
 زیادتیاں کیں اس کے بدلے تمہیں اختیار ہے چاہو تو اسے قبول کر لو چاہو تو دھک دے دو پر ہاں ایک بات یاد رکھنا  
 دل بہت مشکل سے کسی پر اعتبار کرنے کے قابل ہوا ہے کہیں تمہارے انکار سے دوبارہ بھی جڑ نہ سکے۔“ اپنا ہاتھ  
 آگے کر کے کہتا گیا جس پر اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اب مزید کسی اقرار کی ضرورت ہی باقی نہ رہی  
 دونوں ہولے ہولے سے چلتے واپسی کے سفر پر گامزن تھے واپسی کا سفر سن ضرور تھا مگر جہاں محبتیں ہوں وہاں  
 کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔



آسیہ مظہر چوہدری

## وصیلِ عشق

”بابا جانی! چاچو اس مرتبہ بھی نہیں آئے۔“  
سات سالہ آیاں منہ بننے ہوئے بولا۔  
”بیٹا! چاچو جلدی آئیں گے۔ وہ نہایت اہم  
کام انجام دے رہے ہیں۔ ملک و قوم کی خدمت  
سرا انجام دے رہے ہیں۔ اس لیے وہ نہیں آسکتے  
میری جان چاچو سے ناراض نہیں ہوتے۔ و



ہیں۔“ ایاز کی گفتگو کو وہ بہت غور سے سن رہا تھا۔  
 ”اوہ! جیسے لاہور سٹی اور کراچی سٹی میں لوگ  
 ہیں۔“ اس نے اپنی طرف سے سمجھ داری دکھائی۔  
 ”نہیں جان ہر الگ الگ علاقے میں رہنے  
 والے لوگ ایک قوم کی مانند ہیں اور آپ کے چاچو  
 اس قوم کی حفاظت کرنے کے لیے انہیں برے  
 لوگوں سے بچانے کے لیے دوڑ گئے ہوئے ہیں۔“  
 ”اوہ مائی چاچو ویری بریو مین۔“ ایاز نے

بہت کام کے بندے ہیں۔“ ایاز نے اسے  
 بہلاتے ہوئے کہا تھا اور وہ بہل بھی گیا تھا۔ بچے تو  
 ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ انگلی تمام کر چل پڑے۔  
 ”بابا جانی! قوم کیا ہوتا ہے؟“ ایاز نے اب  
 کے اپنی گول گول آنکھوں کو پھیناتے پوچھا تھا۔  
 ”بیٹا! قوم بہت سے لوگوں کو کہتے ہیں جیسے  
 ہمارا یہ شہر۔ اس سے ساتھ والا شہر ہمارے یہاں  
 جتنے بھی لوگ موجود ہیں وہ ایک قوم کی مانند

## ناولٹ



کو چاہیے سنبھل جائیں اور اپنی نئی زندگی کا تعین کریں زندگی کی مسافت ابھی بڑی لمبی باقی ہے۔“  
مزمنہ نے کہا تو بیگم اشتیاق اس بات پر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی تھیں۔

☆.....☆

”تمہارے بال ہمیشہ میرے پیار میں سوکن کا روپ دھارن کرتے ہیں۔“ وہ اس کے لمبے سیاہ گھنے ریشمی بالوں کو دیکھ کر جل کر گویا ہوا تھا۔

”اب میں آپ کے پیار کی خاطر اپنے بالوں کو کٹاؤ تو نہیں سکتی۔“ وہ اسے تپانے لگی تھی۔

”اچھا جناب یعنی کے ہمارے پیار سے زیادہ اہم یہ بال ہیں۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوا تو علشبہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”قسم سے اس کبھی کبھی بالکل بچے بن جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ بچیس سالہ کیپٹن انس بلال سامنے کھڑا ہے جو ایک عدد بیوی کا مالک ہے۔“

”یہ آج کل بڑی تیز پتی ہوئی ہو جب سے میکے سے آئی ہو، خیر تو ہے۔“ وہ اسے اپنے حصار میں قید کرتے ہوئے بولا تو وہ اس کی قربت سے گھبرا کر کسمسا کر دوڑ جانے کی کوشش کرنے لگی۔

”انس پلیز کوئی آجائے گا۔“

”آنے دو شرعی بیوی ہو میری حق رکھتا ہوں تو پر۔“ وہ اپنا چہرہ اس کے کانوں کے قریب لا کر بولا تو اس کی سٹی ہی گم ہو گئی۔ اس کی ایسی شرارتوں پر اس کی جان جاتی تھی۔

”آئی آئی۔“ اچانک اس کے کہنے پر انس اچھل کر دوڑ بٹا تھا اور وہ اسے انگوٹھا دکھائی باہر بھاگی تھی۔

اچانک کوئی چیز بڑے زور سے اس کے پاؤں پر گر گئی تو وہ حواسوں کی دنیا میں لوٹ آئی۔ آئیے

کے سامنے بال بناتے ہوئے وہ نہ جانے ماضی کے

اب کے مسکراتے ہوئے تابی بجائی تھی اور پھر مسکراتا ہوا باہر کھیلنے کے لیے نکل گیا تھا۔ ایاز نے سکھ کا سانس بھرا تھا۔ اور کتنی دیر سے آنکھوں میں رکھا ہوا نمکین پانی اب بے تاب پچل رہا تھا زندگی میں ہمیں کبھی ایسا موڑ بھی دیکھنا پڑتا ہے جب ہر بات ڈر ڈر کے بتائی جاتی ہے۔ سچ جھوٹ کا مغلوہ بنایا جاتا ہے۔ فقط بتایا جاتا ہے۔ فقط اپنوں کی تسلی کے لیے۔

”کیوں اتنی دور چلے گئے ہیں چھوڑ کر، یہاں تک کہ واپسی کے تمام راستے بھی بند کر لیے۔“ ایاز اب کے پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔

☆.....☆

”علیشہ! نہیں جارہی امی۔“ مزمنہ لاؤنج میں آتے ہوئے بیگم اشتیاق سے بولی تھی۔

”کیوں نہیں جارہی؟“ بیگم اشتیاق یہ سن کر بوجھل دل کے ساتھ گویا ہوئیں۔

”وجہ نہیں بتائی اس نے بس کہہ رہی ہے موڈ نہیں۔“ مزمنہ کا لہجہ اب کے کوفت زدہ تھا۔

”کیا ہے گا اس لڑکی کا یہ تو اپنے آپ کو پاگل کر لے گی۔“ بیگم اشتیاق تاسف سے کہتیں واپس صوفے پر جا بیٹھیں تھیں۔

”امی! جو ہوتا تھا وہ ہو چکا۔ کسی نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا ناں آپ کی جو جاری شدہ حالات کے ساتھ کپڑا ماز کر لینا چاہیے۔“ مزمنہ نے بھی جیسے تھک کر کہا تھا گھر کے سب افراد علشبہ کی وجہ سے بے چین و پریشان تھے۔

”تم جانتی ہو ناں وہ اس سے کتنا پیار کرتی تھی اور وہ بھی اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا ابھی اس کی شادی کو ایک ماہ ہی تو ہوا تھا۔ جب یہ سب ہو گیا۔“ بیگم اشتیاق دھکی لہجے میں جیسے دوبارہ اس تلخ حقیقت اس واقعے کو دہرانے لگی تھیں۔

”امی! اب قسمت کے آگے کس کی چلی ہے آپ کی

”تم جاؤ بیٹا! میں اب فجر کی نماز پڑھ کر ہی سوؤں گی۔“

☆.....☆

بادلوں نے آج صبح ہی سے آسمان پر اپنا تسلط جمایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں، سرسراہٹ انگیز احساس بخش رہی تھیں۔ دن دوپہر کا تھا پر سماں شام کا سا لگ رہا تھا۔ بیگم اشتیاق کے بھائی اور بھائی آئے ہوئے تھے اور مزہ اور دلچسپی میں کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

”مزہ! اب ٹرانزل فریج میں رکھ دو اور بریانی کو میں نے دم لگا دیا ہے۔ میں شاور لے آؤں اتنی دیر میں تم کھانے کے برتن لگا دو۔“ وہ اسے ہدایات دینے لگی اور ساتھ ہی کچن میں بکھر اسامان سمیٹنے لگی تھی۔

”علیہ! تم جاؤ میں کرلوں گی۔“ مزہ نے کہا تو وہ کچن سے نکل کر سیدھی اپنے روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد مزہ نے سب کے لیے گرین ٹی بنائی اور چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ دونوں اپنے مشرکہ روم میں چلی گئی تھیں۔ نیونکہ بیگم اشتیاق نے انہیں وہاں سے اٹھنے کو کہا تھا۔

”جی بھائی! اب بتائیں؟“ جس وجہ سے وقار اور بیگم وقار ان کے گھر آئے تھے۔ وہ موضوع ڈسکس ہونے لگا تھا۔

”آپا! ہم آج آپ کی طرف ایک اہم کام سے آئے ہیں۔“ بیگم وقار بولیں تو بیگم اشتیاق اچنبھے سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”کہو صبا کیا بات ہے؟“

”وہ آپا! ہم علیہ بیٹی کے لیے ایک رشتہ لائے تھے۔“ ان کی اس بات پر بیگم اشتیاق نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

کس سفر پر جا لگی تھی۔ ماضی آہ کیا اس کا پیار اس کا ماضی بن گیا۔ وہ حسین پل جو ابھی مکمل طور پر کشید بھی نہ کیے تھے ماضی کا حصہ بن گئے۔ ایک ٹھکین بانوں کا گولہ اس کے گلے میں آکا تھا وہ بالوں کو الجھائے بغیر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

”جب اتنی دور چلے ہی گئے ہو تو پھر بار بار کیوں خیالوں میں آجاتے ہو۔ کیوں تمہاری یادیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔“ وہ بے بسی سے آنسو بھائی بیچرز میں پریکھتی چلی گئی تھی۔ وقت نے کیسے پلٹا کھایا تھا کہ محبت بڑی آزمائش بن کر آئی تھی۔

☆.....☆

”امی پلیز! مت ایسے رات بھر بیٹھی رہا کریں۔ آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں رہتی۔ ایسے تو آپ اور بیمار پڑ جائیں گی۔“ ایاز رات کے پچھلے پہر پانی لینے کے لیے کچن میں آیا تو لاؤنج میں بیٹھی نغانہ بیگم کو دیکھ کر ان کی جانب چلا آیا۔

”بیٹا نیند ہی تب آتی ہے جب سکون ہو اور میرا تو سکون ہی لٹ گیا ہے۔“ وہ پھرائی آواز میں بولتے بولتے یکدم پھوٹ کر رو دی تھیں۔

”امی حوصلہ کریں، بس ایسے ہی اللہ کی مرضی تھی۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ انس اللہ کی راہ میں دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوا ہے۔“ ایاز نے انہیں بانہوں میں بھرتے ہوئے دلا سے مرے لہجے میں سمجھایا تھا۔

”بیٹا! خوش ہوں اور اللہ کی رضا میں راضی بھی ہوں۔ پر ماں ہوں ناں اور ماں کا دل پھر ضد کرنے لگتا ہے۔“ وہ جیسے بے بسی کی انتہا پر تھیں۔

”امی جان آرام کریں صبح کا ذب ہونے میں اب کچھ وقت باقی ہے۔“ وہ انہیں اٹھاتے ہوئے لاؤنج اس کو دیکھ کر رہ گئیں۔

تھی۔

☆.....☆

”واہ علیشہ تمہارے تو دارے نیارے ہی ہو گئے۔“ جب سے بیگم اشتیاق نے علیشہ سے بات کی تھی مزمنہ نے اسے چھیڑ چھیڑ کے اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔

”مزمنہ! اب پنوگی مجھ سے۔“ وہ غصے سے اسے گھورنے لگی۔

”یعنی کے ہمارے جیجا جی کا تعلق آرمی سے ہے۔ واہ ان بلیو ایبل اب میں دیکھنا اپنی دوستوں کو کیسے جلاؤں گی۔“

”اوہ..... شیخ چلی کی چیلی خواب دیکھنا بند کر اور امی کے سامنے زبان بند ہی رکھنا۔“ علیشہ نے اسے ڈٹا تھا۔

”ویسے آپ! کیا جواب دوگی امی کو۔“ مزمنہ ایسے ہی من موجدی ٹائپ لڑکی تھی۔ موڈ ہوتا تو اپنے سے دو سال بڑی علیشہ کو کبھی آپی اور کبھی نام سے بلا لیتی تھی۔

”مجھے کیا پتا امی جو بہتر سمجھیں۔“ یہ کہتے ہوئے ایک فطری سی شرم اس کے چہرے کا احاطہ کرنے لگی۔

”ہائے ہماری ہوشنر مار ہی ہے۔“ مزمنہ پر شور ہوئی۔

”رکو مزمنہ کی بچی۔“ وہ اسے مارنے کو لپکی لپک کر وہ اسے طرح دیتی کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

☆.....☆

”مجھے لگتا ہے یہ کانچ کی نازک چوڑیاں صرف تمہاری ہی نازک کلائیوں کے لیے بنی ہیں۔“ سرخ سبز رنگ کی چوڑیاں اس کی کلائی میں ایک ایک کر کے پہناتا جا رہا تھا۔

”انس میں خود پہن لوں گی۔“ وہ اس کی نگاہ میں دیتی نگاہوں کے اشارے سمجھ گئی تھی۔

”پر علیشہ تو ابھی پڑھ رہی ہے صبا۔“ بیگم اشتیاق جواباً گویا ہوئیں۔

”بھابی رشتہ بہت اچھا ہے اس لیے مجھے انہیں دو ٹوک انکار کا جواز نہیں ملا۔ نعمانہ بیگم میری بہن کی بہت اچھی دوست ہے۔ نعمانہ نے شازیہ (بہن) سے بات کی تو اس نے مجھے بتایا بہت اچھی سنا بھی اور شریف فیملی ہے۔ ہماری علیشہ بہت خوش رہے گی۔“ صبا ان کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔

”بات تو ٹھیک ہے تمہاری پر.....!“ بیگم اشتیاق لحظہ بھر رک سی گئیں۔

”آپا! میں بذات خود بھی ان کی فیملی سے ملا ہوں بہت اچھے لوگ ہیں۔ میری تو کوئی بیٹی ہے نہیں ورنہ میں رشتہ جوڑنے کو پل بھر نہ لگاتا۔“ آخر میں وقار یہ کہتے ہوئے آبدیدہ سے ہو گئے تھے۔ صبا اور وقار اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اس لیے مزمنہ اور علیشہ کو اپنی خاص توجہ واہمیت دیتے تھے۔

”پلیز وقار ایسے مت کہو مزمنہ اور علیشہ تم لوگوں کی تو ہیں۔“

”تو پھر آپ انکار مت کیجیے۔“ صبا بولی۔

”لو کا کیا کرتا ہے؟“

”آرمی میں ہے۔“

”تم لوگ جانتے ہو اشتیاق کے جانے کے بعد میں نے کیسے حالات کو فیس کیا ہے، تم لوگوں کا اگر ساتھ نہ ہوتا تو میں تنہا کہاں تک دو بیٹیوں کو لے کر دنیا کا مقابلہ کرتی۔“ گزرتی زندگی کی تلخ یادیں ان کے چہرے پر پر چھائیں بن کر اٹھ آئی تھیں۔

”آپا! ایسے مت کہیں آپ ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔“ صبا ان کے قریب آ کر اپنے بازوؤں سے ان کے گر حصار قائم کرتے ہوئے بولی تو وہ اس کی محبت پر مسکرا دیں۔

”جیتی رہو۔“ انہوں نے دل سے دعا دی۔

”یار شو ہر اتنے پیار سے پہنا رہا ہے پہن لو کیا  
قباحت ہے۔“ وہ معصوم سا گویا ہوا۔

”اور یہ جوشو ہر کی رگ ظرافت ہے ناں وہ پھر  
پھڑکنے کو تیار ہے۔“ وہ اس کی لودیتی نگاہوں سے  
چہرہ موڑ گئی تھی۔

”بھئی تو یار رومانس میں ساتھ دے لیا کرو،  
ہمیشہ دادی اماں کا رول اپنائے ہوئے ہوتی ہو۔“  
وہ بد مزہ سا ہو گیا تھا۔

”ہاں ہاں اور بھی القابات نوازیں جیسے میں  
بوڑھی روح ہوں۔ پیار کی زبان بلکہ آنکھیں نہیں  
سمجھتی اور اور.....“ وہ یاد کرنے لگی۔

”ارے بس جان! تم آج اتنی پیاری لگ رہی  
ہو، دل چاہ رہا ہے شادی پر لے جانے کی بجائے  
کہیں اور بھگا کر لے جاؤں۔“ وہ اس کے گرد  
حصار باندھنے لگا تھا۔

”اب اگر آپ کا رومانس ختم ہو گیا ہو تو چلیں،  
نیچے سب دیٹ کر رہے ہیں۔“ وہ اس کے حصار  
کی قید کاٹنے لگا ہوا تھا۔

”بہت ظالم ہونے سے۔“ وہ اپنے صبح چہرے  
میں معصومیت طاری کرتے ہوئے بولا تو علیشہ ہلکھلا  
گرہنس پڑی۔

وہ دونوں ایک ساتھ میزبھوں سے نیچے اترے  
تھے اور نیچے کھڑے افراد خانہ نے اس جوڑی کو نظر  
نہ لگنے کی دعائیں دی تھیں۔ بلکہ جیکٹ نما

ٹیروانی پہنے دراز قد میں نمایاں کوئی اطالوی  
ٹہزادہ لگ رہا تھا۔ جب کہ علیشہ نے سلور اور  
بلیک کلر کا راجستھانی فرناک پہنا ہوا تھا۔ جس کی

جالی دار آستینوں پر ننھے منے ڈھیر سارے موتی  
نمائا رہے تھے۔ دونوں شاندار لگ رہے تھے۔  
ہرے ہال میں لوگوں کی نظریں ان دونوں کا

مطالعہ ہی کرتی رہی تھیں۔

☆.....☆

”اے! جو آپ کو صحیح لگے۔ آپ ہم سے بہتر  
فیصلہ کر سکتی ہیں۔“ اس نے فرمانبردار اولاد کی طرح  
اپنی خوشیوں کی ڈور اپنے والدین کو سوپ دی تھی۔  
یہی عقل کا تقاضا تھا۔ کیونکہ یہ بات سو فیصد سچ ہے۔  
جو بچے والدین کے فیصلے کو مقدم جانتے ہیں وہ  
زندگی میں ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ علیشہ نے  
بھی اپنی رضا مندی بیگم اشتیاق کو سوپ دی تھی اور  
بیگم اشتیاق اس کی جانب سے اتنا مان پا کر خوش ہو  
گئی تھیں اور بے ساختہ ان کے دل سے اس کی دماغی  
خوشیوں کے لیے کئی دعائیں نکلی تھیں۔

☆.....☆

اس مرتبہ وہ پورے ایک ماہ بعد گھر آیا تھا۔  
ملک کے حالات کافی حساس بن چکے تھے جس کے  
باعث آرمی کو کبھی بھی نہیں کسی بھی وقت بلا لیا  
جاتا تھا اور کیپٹن انس کی تو تعیناتی بھی کافی حساس  
جگہوں پر ہوتی تھی۔ اس کی بہادری کی بدولت  
اسے ہر مشن میں بطور خاص شامل ہونے کی اطلاع  
دی جاتی جس کی بدولت وہ کسی بھی وقت ڈیوٹی  
پر اپنا فرض سرانجام دینے کے لیے نکل جاتا تھا۔  
اس دفعہ بھی وہ اپنے اوپر عائد کئی ذمہ داریاں  
پوری کر کے آیا تھا اور اس مرتبہ جب گھر آیا تو  
آگے موجود خبر نے یکدم اسے ساکت کر دیا تھا۔

”شادی!“ تین لفظ بھی جیسے انک انک کر  
نکلے تھے۔

”ہاں انس! میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا  
ہے۔“ نعمانہ بیگم تو سب جیسے پہلے ہی طے کر کے  
بیٹھی ہوئی تھیں۔

”امی مجھ سے پوچھے بغیر۔“  
”کیوں اب مجھے تم سے رضا مندی لینے کی  
ضرورت پیش آئے گی۔“ انہوں نے اسے گھورا۔

”نہیں میں نے ایسا تو نہیں کہا لیکن.....“  
”اب کوئی لیکن وکین نہیں سنوں گی میں، انس

تمہاری ہر منزل کا راستہ مجھ تک ہی آتا ہے۔“ مسکراتے ہوئے اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہ گیا تھا۔

☆.....☆

اور پھر آنے والے دنوں نے ان دونوں کو مجھ کی بھول بھلیوں میں اور گم کر دیا۔ ڈیڑھ ہفتہ یو ایک دوسرے کی سنگت میں گزرا کہ دنوں لمحوں کا حساب بھول بیٹھے تھے اور پھر آخر انس کے جانے وقت آ گیا اور جانے کا سن کر علیہ کا دل ٹھٹھم گیا تھا۔

”تم رورہی ہو۔“ وہ کمرے میں آیا تو وہ آ صوفے پر بیٹھی بچکیوں سے رورہی تھی۔

”انس پلینز مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔“ وہ ان کے کشادہ سینے سے لگی التجا کرنے لگی تھی۔ انس جذبات سے ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔

”ادھر میری طرف دیکھو۔“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے بولا۔

”تم اتنی بزدل ہو گئی یہ میرے وہم و گمان بھی نہ تھا۔“ وہ سر جھکا گئی تھی۔

”تم کیپٹن انس بلال کی محبت ہو اور میری محبت اتنی کمزور اور بزدل نہیں ہو سکتی۔“

”میں کمزور نہیں ہوں۔“ وہ سوس سوس کر بولی۔

”اچھا تو پھر یہ سیلاب کس خوشی میں اٹا ہے۔“ وہ اس کے آنسوؤں کو اپنی پوروں سے ہٹا دیا۔

”دیکھو علیہ آج میں تم سے چند باتیں کر جا رہا ہوں جو میرے خیال سے بہت ضرور ہیں۔“ وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

”ہر وطن کے رکھوالے کی پہلی محبت اس دھرتی اس کے وطن سے ہوتی ہے۔ یہ گھریلو محبت دوسرے نمبر پر آتی ہیں۔ ہم رشتوں کو تو چھوڑ

اب میں تھک چکی ہوں۔ مجھ اکیلی سے اب اس گھر کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالی جاتیں۔ ایاز کی دلہن لے کر آئی تو وہ بھی فقط دو سال بعد ایاز کو ہماری گود میں ڈال کر چل بسیں۔ اس وقت ہڈیوں میں دم خیم تھا تو اتنا سب کچھ سہ برداشت کر لیا لیکن اب تو مجھے لگتا ہے جیسے میں بس اپنی زندگی کی بازی ہار رہی ہوں۔“ ان کے آخری جملے پر انس تڑپ کر ان کے سینے سے جا لگا تھا۔

”مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔ پر پلینز آئندہ کے بعد ایسی بات منہ سے نہ نکالے گا۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور ان کا ہاتھ کسی قیمتی متاع کی طرح تھام کر چومنے لگا۔ نغمہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ دیا۔

☆.....☆

اور پھر یوں چٹ مٹکی پٹ بیاہ والا حساب ہوا۔ انس کے آتے ہی ایک ہفتے کے اندر، علیہ اشتیاق کے جملہ حقوق انس بلال کے نام کر دیئے گئے اور یوں علیہ باطل کا انگنا چھوڑے پیا انگنے اپنے ساجن کے ہمراہ ایک نئی منزل کی ہمراہی میں چلی آئی۔ شادی کی پہلی رات ہی ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور پہلی نظر کا دیکھنا ہی دونوں کو محبت کی اڑان بھرنے پر مجبور کر گیا تھا۔

”مجھے اگر پہلے معلوم ہوتا کہ میری بیوی اتنی خوب صورت ہوگی تو میں فٹ ہی شادی کے لیے ہاں نہ کر دیتا۔“ وہ اس کے کانوں میں شوخ رعنائیوں بھرے میٹھے میٹھے بول اٹھیلنا جا رہا تھا اور وہ اس کی شونیوں بھری گستاخیوں سے گلال ہوتی جا رہی تھی۔

”مم..... میں چیخ کر لوں۔“ وہ یکدم اس کے حصار سے گھبرا کر نکلی تھی اور وہ یوں اس کے بھاگنے پر قہقہہ لگا کر رہ گیا تھا۔

”کہاں تک بچو گی علیہ انس بلال اب تو



”چاچی ہمارے اسکول میں نیکٹ ویک 14  
اگست ہے مجھے تقریر کرنی ہے آپ میری ہیلپ  
کر دیں۔“

”اُوہ ضرور میں شام کو آپ کے روم میں آکر  
تیار کر دیتی ہوں۔ ابھی آپ جا کر کھیلو۔“  
دوسری جانب اس کے نمبر پر انس کی کال آرہی  
تھی۔

”او کے چاچی۔“ وہ چھلانگیں لگاتا دروازہ پار  
کر گیا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام کہاں مصروف تھیں؟“ وہ پوچھنے  
لگا۔

”جی وہ ایان کے ساتھ تھی۔“

”ہوں ہمارے بغیر آخر دل لگا ہی لیا جناب  
نے۔“ وہ شوخی سے گویا ہوا تو اس کے آنسو پلکوں  
کی باڑ توڑنے پر مجبور ہو گئے اور پھر یکدم اسے  
انس کی رات کو بھیجی نظم دوبارہ یاد آنے لگی۔  
”کہاں گم ہو گئی۔“ وہ اسے خاموش پا کر گویا  
ہوا۔

”انس آپ کا مشن کیسا جارہا ہے؟“ اس نے  
بات کا رخ ہی موڑ دیا تھا۔

”بس دعا کرنا یا رہیں صرف دعاؤں کی  
ضرورت ہے۔“

”اللہ پاک آپ کو کامیاب کرے۔“

”آمین۔“ وہ بولا اور علیہ اس بات سے قطعی  
انجان تھی کہ یہ بات جیت ان دونوں کی آخری  
ملاقات تھی۔

☆.....☆

”انس کس آس کی ڈوری میں باندھ گئے ہو  
تمہاری یادیں مجھے پاگل کر دیں گی۔“ بارش کی  
بونڈیں اسے بھگوئی جارہی تھیں۔ پر وہ ٹیرس پر  
کھڑی ہر احساس سے ماورا اس انس کو سوچے

ہیں پر وطن کی محبت کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتے۔  
یہ محبت ہمارے خون کی ایک ایک بوند میں رچی بسی  
ہوتی ہے ہمارے خوابوں میں بس اسی کا بھیرا ہوتا  
ہے اور ہم ان محبتوں کی خاطر اس قرض محبت کو قطعی  
فراموش نہیں کر سکتے۔“ وہ جو کچھ ایسے سمجھانا چاہ  
رہا تھا کہنا چاہ رہا تھا وہ شاید سمجھ رہی تھی۔ یا نہیں پر  
انس چاہتا تھا وہ جانے سے پہلے محبتوں سے گندھی  
اس کا منی لڑکی کو ہنستا چھوڑ کر جائے۔ وہ خود مطمئن  
احساس کر پاتے یہاں سے اپنے فرض کی تکمیل  
کے لیے روانہ ہو۔

”ایم سوری انس۔“ وہ شرمندہ سی بولی تو انس  
نے خوشی و سرشاری سے بھر اسانس لیا۔

”ٹھیکس علیہ، مجھے یقین تھا تم میری ذمہ  
س داریوں کو سمجھو گی۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے  
منبط بولا تھا۔ وہ بظاہر مسکرا دی۔ اندر کا درد چھپائے  
اندر ہی بھل بھل بہتے آنسوؤں کو بہاتے وہ  
پنے مسکرا رہی تھی۔

”بس ہر نماز کے بعد دعا کرنا کہ تمہارا انس  
میں اپنے فرض کو تکمیل تک پہنچا سکے اور یا غازی بن  
کے لوٹے یا شہید۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو  
بت علیہ چہرہ موڑ گئی۔

”میں ہر بل اپنی دعاؤں میں آپ کو یاد رکھوں  
تے گی انس۔“ وہ مسکرائی تھی اور دل کو مضبوط کیے  
انس کو الوداع کہہ آئی تھی۔

☆.....☆

”چاچی میں آجاؤں؟“ ایان دروازے پر  
کھڑا اجازت لیتے بولا تھا۔  
”آجاؤ ایان۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے  
رک اس آئی۔

”چاچی مجھے آپ سے ایک کام تھا۔“  
”جی چاچی کی جان بولیں۔“ اس نے اس کے  
دونوں بھرے ہوئے گالوں پر بوسہ دیتے پوچھا۔

جارہی تھی جو اس کے دل کی دھڑکن تھا۔ اس کی زندگی تھا۔

”علیہ چلو یہاں سے۔“ مزہ تقریباً اسے کھینچتے ہوئے کمرے میں لے آئی تھی۔

”مرنے کا بہت شوق ہے کیا۔“ وہ اسے زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

”ہوش میں آؤ علیہ کب تک حقیقت سے نگاہیں چراتی رہو گی۔ اس بھائی اب ہم میں نہیں ہیں۔“ مزہ کا خود یہ سب باتیں کہتے دل کٹ رہا تھا۔

پر کیا کرتی بہن کو ایسے بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

”مزہ صرف خبر ہی آئی۔ شاید خبر جھوٹی ہو۔“

”آرمی والے جھوٹ نہیں بولتے۔ اس بھائی جس مشن پر گئے وہاں سے واپس نہیں لوٹے جس کا مطلب یہی ہے کہ.....“ مزہ رک گئی۔ کیونکہ دروازے کی دہلیز پر بیگم اشتیاق کھڑی تھیں۔

”علیہ تم کیوں یہ سب قبول نہیں کرتیں۔“

”امی!“ وہ ان کے گلے لگے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”دیکھو بیٹا! تمہارا اور انس کا ساتھ یہیں تک تھا۔“ بھول جاؤ سب اور زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو انھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔“ بیگم اشتیاق کی باتوں نے لحظہ بھر علیہ کو چونکا دیا تھا۔

”آج تمہارے ماموں ممائی آرہے ہیں جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ وہ اسے تسلی دلا سے دیتیں کمرے سے نکل گئی تھیں جب کہ وہ فقط یہی سوچ کر رہ گئی تھی کہ کیا پہلی محبت کو بھولانا اتنا آسان ہے؟

☆.....☆

رات کہر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سیاچن کے برف پوش پہاڑ ہزاروں داستانیں اپنے اندر سموئے کھڑے تھے۔ فضا میں دھند اس نوعیت کی تھی کہ اپنا ہی ہاتھ دیکھنے پر دکھائی نہ دیتا۔ ایسے منظر میں اچانک دو نفوس کی کراہنے کی آوازیں فضا میں ایک

ساتھ پیدا کرنے لگی تھیں۔ برفیلی زمین میں کمرنگ یہ دونو جوان دھنسے اپنی پوری جدوجہد کے ساتھ باہر نکل رہے تھے مگر ان کی کوششیں لا حاصل ٹھہر رہی تھیں۔ سیاہ آسمان پر جھمکتا چاند اپنی پراسرار روشنی ہر سو پھیلانے ہوئے تھا۔

”ہادی۔“ پہلے نفوس نے لڑکھڑاتے لہجے میں اپنے دوسرے ساتھی کو آواز دی۔

”کس..... سنو میں یہاں ہوں۔“ ہادی چند قدم کے فاصلے پر کراہتے ہوئے بولا۔

”تت..... تم ٹھیک ہو؟“ پہلے نفوس نے اپنی حالت کو بھلائے دوسرے ساتھی کو پریشانی میں دیکھ کر پوچھا تھا۔

”سر میں اپنی ٹانگیں نکال پارہا۔“ وہ اپنی پوری زور آزمائی لگاتے ہوئے بول رہا تھا۔

”ہمت رکھو، بس ایسی کوئی چیز مل جائے جس سے میں تم تک پہنچ سکوں۔“ وہ اپنی پوری طاقت لگاتے اپنی ٹانگیں باہر نکالنے کی جدوجہد میں تھا لیکن سیاچن کی بے رحم یرف اپنی پوری طاقت سے انہیں اپنے اندر پھینچ رہی تھی۔

”بس ہادی ہمت مت ہارنا اور کوشش کرو۔“

”سر! میں اب لگتا ہے اس دلدل کے نیچے پھینچا جا رہا ہوں۔“ ہادی کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”نہیں تم اپنے دماغ کو بحال رکھو۔“ وہ اسے نیچے کی جانب سرکنا دیکھ کر چیخ کر بولا۔

”ہادی میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“

”سر! مجھے معاف کر دیجیے گا بس آپ کا اور ساتھ نہیں دے سکتا۔“ ہادی کی آواز پست ہو رہی تھی۔

”یہ لورسی ہادی اسے پکڑو جلدی۔“ اچانک پہلے نفوس نے دماغ کے کام کرنے پر اپنے گرد باندھی رسی ہادی کی جانب پھینچی تھی۔

”ہادی! پکڑو اسے۔“ وہ نیچے ہوتے بول رہا

ہم یہ بات ہمیشہ کیوں بھول بیٹھتے ہیں۔ آج جو ہم اتنی آرام دہ شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں اس پاکستان کی بدولت ہے جسے ہم تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا بابائے قوم نے ہمیں اسی لیے یہ ملک دیا تھا کہ ہم اسے برباد کرتے پھریں؟ نہیں اس ملک کو حاصل کرنے کے لیے لہو بہانے والوں کا لہو اتنا سستا نہیں کہ وہ رائیگاں جائے۔ پاکستان ہمیشہ رہتی دنیا تک اسی طرح شان و شوکت سے قائم و دائم رہے گا لیکن جو ہم سب یہ الٹا سیدھا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اس سے پاکستان اس کو تو نہیں ہمارا ہی نقصان ہو رہا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے سنبھلنے کا۔

بات کا اصل مقصد یہی ہے کہ پاکستان کو ہمارے خالی غولی دعوؤں تیلیوں کی ضرورت نہیں ہے، عملی کاموں کی ضرورت ہے اور عملی کام ہی ہمیں تخت و تاج کا رستہ دکھا سکتے ہیں۔“

اسکول پر سیکرٹری کی تقریر کے اختتام پر پورا پنڈال زور دار تالیوں کی گونج سے تھرک اٹھا تھا۔ ایمان بھی زور زور سے تالیاں پیٹ رہا تھا۔ جب کہ اس کے ساتھ بیٹھی علیشہ سوچ رہی تھی کہ جب ہر پاکستانی کی سوچ ایسی ہو جائے تو کوئی بڑی طاقت ہمارے راستے میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

☆.....☆

”آپ علیشہ کو کہیں جاب کرنے دیں شاید ایسے وہ اس واقعے سے نکل آئے۔“ صبا نے اپنی طرف سے ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

”اب تم ہی قائل کرو اسے، ہم تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے۔“ بیگم اشتیاق کی آواز میں صدیوں کی سی تھکن تھی۔

”آپا بات ہی اتنی بڑی ہے، علیشہ کا بھی طرز عمل کچھ غلط نہیں۔“ صبا خود بھی اندر درخندہ تھی۔

”مگر نہیں سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے، ایسے اگر ایک

تھا۔“

”جی میرے ہاتھ میں رسی آگئی ہے۔“ ہادی نے رسی کو تھام لیا تھا۔

”میں کھینچتا ہوں تم بس ہمت رکھو۔“ وہ اپنی پوری طاقت لگاتے اسے کھینچ رہا تھا اور بالآخر ہادی باہر نکل آیا۔

”سر! آپ نہ ہوتے تو شاید.....“ ہادی نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر نکالا تو وہ بے دم سا وہیں برقی زمین پر اوندھا پڑ گیا۔

”ہمیں اپنی آخری پچی پچی سانس تک لڑنا ہے سمجھے۔“ وہ پھولتے ہوئے سانس کے ساتھ بولا تھا۔

”ہمارے مشن کی کامیابی ہی ہمارا اصلی مقصد تھا جو ہم نے پورا کر دیا اب آگے بھی ہم پست نہیں ہوں گے۔“

”سر! ہم ابھی بھی دشمن کی سرحد میں ہیں۔ ہمیں بہت ہوشیاری سے یہاں سے باہر نکلنے کا رستہ ڈھونڈنا ہوگا۔“ ہادی نے کیپٹن انس کو دوبارہ بیٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔

☆.....☆

تفیریوں کی حد تک تو ہم پاکستان کی سر بلندی کے لیے ایسے ایسے قلابے ملا رہے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے مگر جہاں عملی کام کرنے کی بات آتی ہے تو ہم بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟ چودہ اگست کا دن تو اب ہمارے لیے ایک تفریحی شو بن گیا ہے۔ بس اس دن گھر کو جھنڈیوں سے سجالینا، بانگیوں پر آوارہ لڑکوں کا دن ویلنگ کرنا، اٹلے سیدھے کرتب دکھانا کیا یہ پاکستان کے لیے ہماری محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے؟ یہ جو ہمارا ملک ہے جو ہمارے بزرگوں نے اپنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے کیا صرف اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم یہ سب کچھ کرتے پھریں

جب کہ وہ لہرا کر پاس ہی رکھے صوفے پر گر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھاتا جا رہا تھا اور چند لمحوں بعد ہی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر وہیں ایک جانب لڑکھڑائی گئی تھی۔

☆.....☆

یہ خبر کسی قیامت کی طرح دونوں گھرانوں پر ٹوٹ کر گر گئی تھی اور سب سے زیادہ دکھ والی بات یہ تھی کہ میت کا آخری دیدار بھی ان کے نصیب میں نہ تھا۔ کیونکہ یہ مشن اس سچ کا تھا کہ میت تو ساتھ لانا دور کی بات یہ پتا کرنا بھی مشکل تھا کہ میت کہاں اور کس جگہ ہے اور سیاحین کے ظالم برف پوش پہاڑوں پر کسی کو ڈھونڈنا کجا محسوس کرنا مشکل تھا۔ نعمانہ بیگم کی حالت سیریس ہو گئی تھی جس کے باعث انہیں ہفتہ بھر اسپتال میں ایڈمنٹ کرنا پڑا۔ علیشہ پورے پانچ دن بعد سکتے سے لوٹی تھی اور پھر بہت عجیب سی ہو گئی تھی۔ ہر وقت اکیلی الگ تھلک رہتی یا رونی رہتی اور یوں ایک ماہ میں ان کی یادیں ایک امنٹ نقوش کی طرح سب کے دلوں پر نقش کر گئی تھیں۔

☆.....☆

وہ قیل کے بعد بیگم اشتیاق کے ساتھ اپنے گھر چلی آئی تھی۔ اس کے آنے پر کوئی کچھ نہ بولا تھا کیونکہ اس کی ذہنی حالت کافی بکھر چکی تھی۔ نعمانہ بیگم نے نم آنکھوں کے ساتھ اسے اس گھر سے وداع کیا تھا۔ کتنے ارمانوں سے وہ اسے اپنے گھر میں لے کر آئی تھیں۔ پر آہ قسمت بھلا قسمت کے آگے کسی کی کہاں چلی ہے۔ ہنستا بتا گھر یکدم ویران ہو گیا تھا۔

جو محبت ابھی پروان چڑھی ہی تھی زوال کی نذر ہو گئی۔ شاید محبت کے باسیوں کی یہ کہانی بھی ادھوری کہانیوں کی طرح ادھوری رہ گئی تھی۔

☆.....☆

شخص مر جائے تو پھر ساری دنیا ہی نہ اس کے پیچھے مر جائے زندگی صرف ایک شخص پر آخر ختم نہیں ہوتی۔“ بیگم اشتیاق بولی تھیں۔

”آیا ابھی زخم تازہ ہے۔ سنبھل جائے گی۔“  
”سنبھلنا پڑتا ہے صبا ورنہ پہاڑ جیسی زندگی ایسے تو نہیں گزرتی۔“

”میں سمجھاؤں گی اسے اور جاب کے لیے قائل بھی کروں گی۔“ صبا نے جیسے انہیں تسلی دینی چاہی۔  
”تم بھی کوشش کر لو۔“

☆.....☆

وہ دن بھی عام دنوں جیسا تھا۔ جب اس حادثے نے علیشہ کی پوری زندگی کو اٹھل پھٹل کر دیا تھا۔ صبح سے ہی گرمی کی شدت میں کافی اضافہ ہو رہا تھا۔ علیشہ نے گھر کی ملازمہ کے ساتھ گھر کے کام کیے اور فارغ ہو کر نیوی کے آگے آئی تھی۔ نعمانہ بیگم اور آپسی عزیز کے ہاں گئے ہوئے تھے جب کہ ایاز انس کے کام کے سلسلے میں پچھلے دو دن سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ نیوی پر کوئی مارننگ شو چل رہا تھا۔ ابھی اسے نیوی دیکھتے آدھا منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ اچانک لینڈ لائن کی گھنٹی زور و شور سے چنگاڑ اٹھی۔

”ہیلو۔“ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔

”آپ کیپٹن انس کے گھر سے بول رہے ہیں؟“ دوسری جانب سے کافی تیوری سے پوچھا گیا۔

”جی میں ان کی مسز بات کر رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”ہمیں انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ کیپٹن انس ایک مشن کی تکمیل کے دوران شہید ہو چکے ہیں۔“ یہ کوئی بم تھا جو علیشہ کے سر پر گرا تھا۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔

”ظاہر ہے ایک ذرا سی لغزش بھی ہمیں اوپر پہنچا سکتی ہے۔“ انس نے اب کے مزاحیہ انداز میں کہا تو ہادی ہنس دیا۔

”چلو اب ہم اپنا یہ خود ساختہ مشن سرانجام دینے کے لیے نکلیں۔“ دونوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اپنے مشن کی پایہ تکمیل کے لیے نکل گئے۔

☆.....☆

ہفتہ پہلے وہ جس اسکول میں جاب کی دیکھنی جمع کرا کے آئی تھی وہاں سے جواب مثبت آیا تھا کیونکہ یہ آرمی والوں کا اسکول تھا۔ اس لیے انس کی وجہ سے اسے بغیر میرٹ کے جاب دے دی گئی تھی حالانکہ اس کی اپنی تعلیمی اسناد ایم ایے انگلش تھی پر پھر بھی وہ اس بات پر زیادہ خوش تھی کہ یہ جاب اسے انس کے نام کی وجہ سے ملی۔

”میرا نام ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی جڑا رہے گا۔“ وہ زیر لب مسکراتی تھی۔

دن رات اپنی ڈگر پر رواں دواں تھے۔ انس کو ان سے پھڑے چھ ماہ اور سات دن ہو گئے تھے۔ بظاہر دیکھا جائے تو سب ایک مرتبہ پھر زندگی کی جدوجہد میں آگے بڑھنے لگے تھے۔ یہی دنیا کی ریت تھی یہی دستور۔ رہی دل کی بات تو اس کے گھاؤ بھی آہستہ آہستہ بھر ہی جاتے۔ بھرنا ہی تھا کیونکہ زندگی جمود کا شکار کبھی نہیں ہوتی۔ زندگی بالکل کا نام ہے زندہ دلی کا نام ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں زندگی کے ان اصولوں کو ماننا پڑتا ہے۔ برتنا پڑتا ہے۔ کسی ایک کے چلے جانے سے زندگی رکتی نہیں ہے رکنا اس کی سرشت میں شامل ہی نہیں ہے یہ تو وقت کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

☆.....☆

وہ دونوں انتہائی احتیاط سے ان کے پیچھے ہو لیے تھے۔ کیونکہ یہی ایک رستہ تھا جو انہیں یہاں

رات بیت گئی اور دن چڑھ آیا لیکن یہاں دن ہوتے ہوئے بھی شام کا سا سماں تھا۔ ہر جانب تاحد نگاہ ویرانی ہی ویرانی تھی۔ چاروں جانب برف کے بڑے بڑے تودے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں پچھلی رات سے اب تک مسلسل سفر میں تھے۔ بغیر راستے کا تعین کیے بس چلتے جا رہے تھے۔ پچھلی آدھی رات اور اب آدھا دن بھی گزر چکا تھا لیکن انہیں ایسا کوئی راستہ نظر نہ آیا جس سے وہ یہاں سے باہر نکل سکیں۔

”سر مجھے لگتا ہے ہم راستہ بھٹک چکے ہیں۔“ ہادی ہانپ کر وہیں برقیلی زمین بیٹھ گیا۔

”ہادی! ہم ہار نہیں مان سکتے۔ جب تک جسم میں جان ہے لڑتے رہیں چلو اٹھا شاباش۔“ انس نے اسے کندھے سے پکڑتے ہوئے اٹھایا تھا۔

”سر! کبھی کبھی مجھے اپنے آپ سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو انس نے اس کی جانب دیکھا۔

”کیوں!“

”میں آپ جیسا بہادر کیوں نہیں بن پاتا۔“

”تم بہادر ہو تو آج یہاں میرے ساتھ ہو، سمجھے۔“ اچانک ہی انہیں اپنے سے چند میل کے فاصلے پر کسی کی آوازیں سنائی دینے لگی۔

”چھپ جاؤ۔“ انس نے فوراً سرگوشی میں کہا اور وہ دونوں قریب ہی بنے ایک برف سے ڈھکے پتھر کی آڑ میں ہو گئے۔

انڈین آرمی کے چند لوگ وہاں سے گزر رہے تھے جو شاید یہاں کا جائزہ لینے آئے تھے۔

”میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے۔“ انس نے یکدم کچھ سوچتے ہوئے ہادی سے کہا۔

”جی سر۔“ اور پھر وہ اسے سب بتانے لگا۔

”سر! پر ہمیں یہ کام چوکنا ہو کر انجام دینا ہو۔“

اشتیاق نے ٹوک دیا۔ ”علیشہ نعمانہ بہن صحیح کہہ رہی ہیں تم آج چلی جاؤ، ان کے ساتھ وے بھی تمہاری ابھی ہفتے کی چھٹیاں باقی ہیں۔“ بیگم اشتیاق نے اس کے بہانے پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ کسے بتاتی کہ وہاں اسے انس کی یادیں کسی آکٹوپس کی طرح جکڑ لیتی ہیں اور وہ جس بے چینی سے ٹکنا چاہتی ہے وہ دوبارہ اس کے من میں عود آتی ہے۔

”جی اچھا۔“ وہ انکار بھی نہ کر پاتی تھی۔

”کب تک وہ ایسی زندگی جیتی رہے گی۔“ اس نے سوچا تھا۔

☆.....☆

شام اپنے سلونے پن کے ساتھ نیلگوں آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ عود آئی تھی۔ اڑتے چھچی دن بھر کی خوار یوں کے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ رہے تھے۔ وہ کمرے سے ملحقہ کھڑکی کے سامنے کھڑی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ یہاں آتے ہی پھر اس کی یادوں نے اس کے گرد پھرہ باندھ دیا تھا۔

”ویسے وہ کیا منظر ہوگا جب میں ڈیڈی اور تم می بنو گی۔“ وہ نہا کر باہر نکلی تو آگے کمرے میں بیڈ پر آڑھا تر چھالیے انس نے چھلچھوڑی تھی۔ وہ اس کی بات پر یکدم گلال ہوئی اور تیزی سے صوفے پر پڑا دوپٹہ اپنے گرد پھیلا دیا۔ گھنے بالوں سے پانی کی بوندیں ہولے ہولے ٹپک رہی تھیں۔

”انس پلیز! بھی تو سیریس ہو جایا کریں۔“ وہ بولی تھی۔

”چلو سیریس ہو کر پوچھ رہا ہوں۔“ اب کے وہ بیڈ سے چھلانگ لگا کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔

”راستہ دیں، مجھے کچن میں جانا ہے۔“

”پہلے میرے سوال کا جواب تو دو۔“ اس نے

سے نکال سکتا تھا۔ یہ ان کے لیے ایک بہت بڑا خطرناک رسک تھا لیکن انہیں اللہ پر کامل بھروسہ تھا اور جو اللہ کے بھروسے چلتے ہیں وہ بھی مات نہیں کھاتے۔ دو جگہ انڈین آرمی کے لوگ کے تھے اور یہیں سے انس اور ہادی نے موقع کا فائدہ اٹھایا تھا جہاں دو انڈین آرمی کے بندے رکے اس جگہ بر فیلے پتھر ہی پتھر تھے۔ اونچے نیچے پتھر۔ انس نے اللہ کا نام لے کر ایک پتھر سے انڈین فوجی کے سر پر وار کیا اور پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے ہمیشہ کے لیے جہنم واصل کر دیا اور وہیں پتھروں کے پیچھے اس کی لاش کو پھینک دیا تھا اور اس انڈین فوجی کا لباس خود پہن لیا۔ بلیک گلاز اور ماسک کی وجہ سے انہیں پہچاننے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ ہادی بھی دوسرے انڈین کے لباس میں تھا دونوں نے ایک دوسرے کو کنکری کا نشان دکھایا اور ان سب کی ہمار ہی میں چلنے لگے۔ ان لوگوں کی منزل شاید مخالف سمت بنے اپنے کیمپ کی جانب تھی اور یہیں سے انس کے دماغ میں ایک اور منصوبہ بنا تھا اور اس منصوبے پر وہ ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔

☆.....☆

مزنہ کو دیکھنے کچھ لوگوں نے آنا تھا تو بیگم اشتیاق نے نعمانہ بیگم اور ایاز کو بھی دعوت پر بلا لیا۔ صبا اور وقار بھی مدعو تھے۔ رشتے والے لوگ مزنہ کو پسند کر گئے تھے اور دو ماہ بعد شادی کا کہہ گئے تھے۔ اس وقت وہ سب لاؤنج میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب کہ علیشہ، نعمانہ بیگم کی گود میں سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔

”علیشہ! دودن کے لیے ہماری طرف آ جاتی۔“

آیان اتنا یاد کرتا ہے تمہیں۔“ نعمانہ بیگم نے اس کے گھنے لمبے سیاہ بالوں میں انگلیاں پیھرتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ آئی جا۔“ وہ ابھی بولی ہی تھی کہ بیگم

اس کے گرد حصار تنگ کر لیا۔ وہ پل کر رہ گئی تھی۔  
 ”انس پلینز چھوڑیں۔“ وہ کسمائی تھی۔  
 ”پہلے بتاؤ۔“ وہ اڑ گیا۔

”نہایت ہی بدھولگیں گے۔“ وہ زور سے اسے دھکا دیتی کمرے سے باہر بھاگ گئی جب کہ وہ اس کے بالوں کی خوشبو میں محصور ہو کر آہ بھر کر رہ گیا تھا۔

”ظالم لڑکی۔“ وہ ہلکے سے بڑبڑا کر رہ گیا۔  
 یکدم کمرے میں کسی کے دستک دینے پر وہ حواسوں میں لوٹی تھی۔

”علیہ میں اندر آ جاؤں۔“ دروازے پر ایاز کھڑے تھے۔  
 ”جی ممانی آئیے۔“ وہ بڑا کر دوپٹہ درست کرنے لگی۔

”کیسی ہو؟“ انہوں نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”جی ٹھیک ہوں۔“ وہ جھکے سر کے ساتھ بولی تھی۔

”اور کیسی جا رہی ہے جا ب؟“ انہوں نے کچھ وقفے کے بعد پوچھا۔

”جی اچھی جا رہی ہے۔“ وہ بولی۔ ایاز جواباً خاموش ہو گئے۔ الفاظ جیسے ختم ہو گئے تھے کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

”علیہ ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو۔“ انہوں نے کہا تو وہ چونکی۔

”جی بھائی میں برا کیوں مناؤں گی۔“

”ایک بڑے بھائی کا مشورہ ہے، مجھے برامت سمجھنا، کوئی غلط خیال دل میں لانا، بس میں چاہتا ہوں میری یہ چھوٹی بہن پھر سے زندگی کی جانب لوٹ جائے، ابھی تمہاری عمر اتنی نہیں ہوئی کہ کوئی اور تمہارا ہاتھ نہ تھام سکے۔ پلینز اپنی زندگی کو نیا رخ دے دو۔“ وہ کہہ کر خاموش ہو گئے جب کہ

علیہ انہیں ساکت آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہی۔  
 ”علیہ مجھے برامت سمجھنا۔“ ایاز نے اسے دوبارہ پکارا تو وہ چونکی۔

”بھائی میں آپ کے فضلے کی قدر کرتی ہوں لیکن جو پہلا شخص میری زندگی میں آیا تھا وہ اب میری پوری زندگی میں شامل ہو چکا ہے اور اگر میں اسے زندگی سے نکالوں گی تو اس کا مطلب اپنی زندگی ہی ہار دوں گی۔“ اس کا لہجہ نرم آلودہ اٹل تھا۔ ایاز نے اسے دکھ کے ساتھ دیکھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہہ چکی تھی اس کے بعد کچھ اور کہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے باہر نکل گئے۔ جب کہ وہ اپنی زندگی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

”انس میں تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں، وہ وعدہ تو میں نے کر لیا تھا لیکن میں کمزور پڑ گئی، ہاں میں کمزور پڑ گئی، مجھے معاف کر دینا انس میں وہ وعدہ نبھانے میں باقی جو تم نے جاتے وقت مجھ سے لیا تھا۔“ وہ زمین پر جھکتی چلی گئی تھی۔

☆.....☆

کسی کو ان پر کوئی شک نہ ہوا تھا۔ وہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ اب دور سے ان کا بارڈر نظر آرہا تھا اور دوسری طرف سبز ہلالی پرچم پوری شان و شوکت سے لہرا رہا تھا۔ وہ ہادی کے فریب ہوا۔

”سنو ہادی! چند قدم کے فاصلے پر ایک خفیہ سرگ ہے، جو سیدھا ہمارے بارڈر میں جا کر نکلتی ہے تم وہاں سے نکل جاؤ۔“  
 ”سر آپ بھی چلیں گے؟“ ہادی نے سوالیہ پوچھا۔

”نہیں تم جاؤ مجھے ابھی ایک اور کام سرانجام دینا ہے۔“ وہ بولا۔

”نہیں سر! میں آپ کے بغیر نہیں جاؤں گا۔“



ہادی نے انکار کیا۔  
 ”یہ میرا آرڈر ہے جاؤ تم۔“ اب کے انس سخت  
 لہجے میں بولا تو ہادی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا حکم  
 ماننے پر تیار ہو گیا۔  
 ”دعا کرنا یا شہید ہو جاؤں یا غازی بن کے  
 لوٹوں۔“ اس نے کہا اور ان کی سمت آگے بڑھ گیا  
 جب کہ ہادی جھاڑیوں کی آڑ میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

☆.....☆

ہادی نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر سب کو حیران کر دیا تھا  
 اور پھر پورا واقعہ آکر بیان کر دیا۔ سب ان کی  
 جرأت بہادری کی داد دے رہے تھے۔ اللہ اکبر  
 کے نعرے بلند تھے۔  
 ”انس کہاں ہے؟“ کرنل شہریار نے انس کی  
 بابت پوچھا تو ہادی خاموش ہو گیا۔  
 ”کیپٹن انس کہاں ہیں؟“  
 ”سر! وہ انڈین آرمی کے بارڈر پر بنے  
 مورچے کی جانب گئے ہیں۔“  
 ”گڈ! اس کا مطلب میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔“  
 کرنل شہریار اب کے مسکرائے تھے۔  
 ”کیسا اندازہ؟“ کرنل افتخار نے پوچھا۔  
 ”وہ انڈیا کے بارڈر پر ایک آندھی بن کر گرے  
 گا۔“

☆.....☆

آج چھ ماہ اور بیس دن کے بعد وہ اس کے  
 سامنے موجود تھا۔ وہ ابھی تک ساکت نگاہوں سے  
 اسے تک رہی تھی جیسے ابھی وہ یقین نہیں کر پا رہی  
 تھی کہ انس واپس لوٹ آیا تھا۔ یہ خواب تھا یا  
 حقیقت! جس شخص کے وہ قل کرا چکے تھے اس پر  
 فاتحہ پڑھ چکے تھے اس کے لوٹنے کی امید تک کا  
 خیال دل میں نہ لائے تھے۔ وہ یکدم ان کے  
 سامنے آ موجود تھا۔ یہ قدرت کا کیسا معجزہ تھا۔ انس  
 نے بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ انڈین آرمی  
 کو اور ان کے مورچے کو جہنم واصل کیا تھا اور جواباً  
 بھاگتے ہوئے وہ گولیوں کا نشانہ بنے ہوئے اپنی  
 سرزمین پر آگرا تھا۔ گولیاں اس کے پیٹ اور

”پر اب اس کے گھر والوں کو اطلاع دے  
 دیں کہ وہ زندہ ہے۔“ کرنل افتخار بولے۔  
 ”نہیں افتخار، یہ مشن کامیاب ہو جائے پھر  
 اطلاع دیں گے۔ شہادت کی یا غازی لوٹنے کی۔“  
 اور پتا نہیں کیوں اس بات پر ہادی کے آنسو بہہ  
 نکلے تھے۔

☆.....☆

وہ ان کے خفیہ مورچے کے قریب پہنچ چکا تھا۔  
 جہاں ان کا اسلحہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ اسے  
 بس اب صرف رات کا انتظار کرنا تھا کیونکہ اس کے

”ویسے اتنے ماہ میرے بغیر رہ کر تم کافی مضبوط  
دل نہیں ہو گئیں؟“ وہ واش روم سے باہر نکلا تو وہ  
فوراً اسے تھامنے کے لیے آگے ہوئی۔ زخموں کے  
باعث ابھی وہ جلنے پھرنے سے قاصر تھا۔  
”جی ہاں۔“ وہ سر ہلاتے زور و شور سے بولی  
تھی۔

”اب تو تم شکر کر رہی ہو گی مجھے ایسی حالت  
میں دیکھ کر کہ تمہیں تنگ کرنے والا اس اب  
تمہارے رحم و کرم پر آ گیا۔“ اور اس کی اس بات  
پر علیشہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”ایسی فضول باتیں میرے ساتھ نہیں  
کریں گی، سمجھے ورنہ انہی دھکادے دوں گی۔“ وہ  
اسے ڈٹتے ہوئے بولی تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔  
”چلو گر لو کچھ دن من بانی، اس کے بعد تو سب  
حساب سود سمیت واپس لوں گا۔“ وہ معنی خیز لہجے  
میں بولنا اسے پھر کھال کر گیا تھا۔

☆.....☆

کیپٹن انس کو اس کی بہادری پر متعجب رأت سے  
نوازا گیا اور اسے میجر کی پوسٹ پر تعینات کر دیا  
گیا۔ یہ دن بلاشبہ علیشہ کے لیے ایک بہت خاص  
دن تھا۔ اس نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ بے  
شک شکر ادا کرنا اس پر لازم تھا۔

وہ خود بھی ایک این جی او سے منسلک ہو گئی تھی۔  
جہاں عورتوں اور بچوں کے حقوق دلانے کے لیے  
کام کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ  
پاکستان کے ہر باسی کو اپنے حصے کا کام کرنا ہے کیونکہ  
صرف پنپنے ہوئے لوگوں پر ہی پاکستان کی حفاظت کی  
ذمہ داری عائد نہیں ہے۔ ہر عام پاکستانی کا بھی یہ  
اولین فرض ہے کہ وہ اپنی آخری سانس تک اس کی  
حفاظت کا بیڑہ اٹھائے۔ کیونکہ یہی ہماری زندگی کا  
مقصد ہے اور یہی اولین فرض بھی!!

☆.....☆

بازوؤں میں لگی تھیں جس کی وجہ سے اسے فوراً سی  
ایم ایچ لے جایا گیا اور یوں دو ہفتے کے بعد آج وہ  
ہوش میں آیا تھا تو اس کے گھر والوں کو اطلاع  
دے دی گئی تھی۔ یہ خبر دونوں گھرانوں پر ایک  
دھچکا بن کر گری تھی اور وہ سب دوڑے دوڑے  
ہسپتال چلے آئے تھے۔ نعمانہ بیگم کے تو آنسو ہی  
نہیں ٹھم رہے تھے۔ وہ بار بار اللہ کے حضور سجدے  
میں گر رہی تھیں۔ بیگم اشتیاق کی آنکھیں اشکبار  
تھیں۔ ان کی بیٹی کا سہاگ زندہ سلامت واپس  
لوٹ آیا تھا۔ سب رشتے دار انس کو دیکھنے دوڑے  
چلے آئے تھے اور اس کی بہادری، دلیری کے گن  
گانے لگے تھے۔ پر انس لب سے خاموش  
پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی کی پرچھائی تھی  
اور اس کی یہ ویرانی علیشہ نے دیکھ لی تھی اور وہ  
جان بھی گئی تھی کہ یہ ویرانی کیوں اس کے محبوب کی  
آنکھوں میں اُمڈ آئی تھی۔

اس وقت کمرے میں صرف وہ دونوں ہی  
موجود تھے۔ وہ اس کے قریب آئی اور اپنا ہاتھ اس  
کے ہاتھ پر رکھا تو انس چونک گیا۔

”میں جانتی ہوں آپ کے دل کی خواہش  
ادھوری رہ گئی ہے، مگر جو تباہ بھی آپ کو ملا ہے  
وہ بھی بہت بڑا ہے۔“ غازی، بن کے لوٹنا کوئی  
معمولی بات تھوڑی ہے۔“ وہ شاید اس کے سن کا  
لال کم کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔  
”اور مجھے آج مدتوں بعد اس بات کا ادراک

ہوا کہ وہ سب نایاب لوگ تھے جن کا پہلا عشق ان  
کی سیر زمین بھی اور آج میں بھی اس بات کا اقرار  
کرتی ہوں کہ میرا پہلا عشق میرا پاکستان ہے۔“  
وہ ہولے سے مسکراتی تھی۔ مدھم سی مسکراہٹ اور  
اب کے انس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر  
رکھ کر جیسے اس کے اقرار کا مان رکھ لیا تھا۔

☆.....☆

# ہڑی عمیر

طبیعت سنبھلی تو وہ گھر آگئے مگر اپنے ساتھ نئی سوچیں بھی لے آئے اور انہوں نے بہت سوچتے ہوئے عائشہ درانی کے لیے ایک بہت اچھا اور مناسب رشتہ تلاش کیا۔ احمد پڑھا لکھا اور سلجھا لڑکا تھا۔ چند سال پہلے ہی اس کے والدین کا انتقال روڈ ایکسڈنٹ میں ہو گیا تھا۔ اس کے والد پاپا کے دوست تھے۔ اس لیے پاپا کو اس سے مناسب رشتہ مل ہی نہیں سکتا تھا۔ ایم فل کے امتحانوں کے فوراً بعد اسے احمد کے سنگ رخصت کر دیا۔ احمد بہت خیال رکھنے والا شوہر تھا۔ اس کی شادی کے چند مہینوں بعد ہی پاپا بھی ہر گھر سے آزاد ہو کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اس دنیا میں اب صرف اس کا ایک ہی رشتہ تھا اور وہ تھا احمد۔ احمد اب پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا اور پھر یہ دن انہیں ماں بننے کی خوشی دے گئے تھے۔ ایک روڈ ایکسڈنٹ میں احمد کی اچانک موت سے وہ تنہا رہ گئیں۔

عائشہ درانی کی اب ساری توجہ اپنی دو سالہ بیٹی درنایاب میں سمٹ کر رہ گئی۔ پاپا کا گھر کرائے پر تھا اور احمد کی دکان کا کرایہ بھی آ جاتا۔

انہیں خرچے کی طرف سے زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ عدت ختم ہوتے ہی انہوں نے گھر بیٹھنے کے بجائے جاب کی تلاش شروع کر دی کیونکہ کرائے سے ضرورتیں تو پوری ہو جاتی تھیں مگر مہینے کے آخر میں ہاتھ دبان پڑتا تھا اور پھر ابھی تو درنایاب چھوٹی تھی۔ کل کو وہ بڑی ہوتی تو اس کی ضرورتیں بھی بڑھ جاتیں اور ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کی کتنی

”مما، کہاں ہیں آپ؟“ درنایاب پورے گھر میں عائشہ درانی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

”میں یہاں ہوں بیٹا!“ انہوں نے اپنے کمرے سے آواز دی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ماں سے لپٹ گئی تھی۔

”کیا ہوا میری جان؟“

”مما! میرا زلٹ آ گیا ہے اور میں نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا ہے۔“ خوشی سے جھلکاتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ ایک مرتبہ پھر ماں سے لپٹ گئی تھی۔

”بہت بہت مبارک ہو بیٹا! تم نے تو جج میں اپنی ماں کا نام روشن کر دیا ہے۔“ اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

”مما! میں اپنی فرینڈ کو ٹریڈ دوں گی۔“

”ہاں، ہاں کیوں نہیں سنا دے والے دن سب کو بلا لو گھر پر۔“ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ بھی اتنی خوشی کے موقع پر۔ وہ خوشی سے چہکتی اپنی دوستوں کو دعوت دینے باہر کو بھاگ گئی تھی۔

☆.....☆

عائشہ درانی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ بچپن میں ہی ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پاپا نے اس کی تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ ہر فرمائش پوری کی اچھا کھلایا پلایا اور تعلیم دلوائی۔ ان دنوں وہ ایم فل کر رہی تھیں۔ جب پاپا کو ایک ہوا۔ رورو کے ان کا برا حال ہو گیا۔ خود کا سہارا خود ہی بننا پڑا۔ بھلا کون تھا جو اس نازک موقع پر ان کو حوصلہ دیتا۔ پاپا کی



آجائے۔ اچھے مارکس تو آجاتے ہیں لیکن پوزیشن نہیں آتی۔“

”تم لوگ رٹا لگاتے ہو۔ میری طرح سمجھ کے پڑھا کرو ناں۔“ وہ اپنے مصنوعی کالر جھاڑتے ہوئے ادا سے بولی تھی۔

”ویسے بھی آنٹی! جس کی مدر آپ جیسی سوفٹ نیچر کی کیئرنگ ہوں۔ ان کی بیٹی ایسی ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی دوسری فرینڈ نے کہا تھا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔ میری ماما جیسی کسی کی ماما نہیں ہو سکتیں۔“ اس نے اٹھ کے عائشہ درانی کے گلے میں بازو ڈال کر جھٹ سے کہا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے گال پر پھینکی دی تھی۔

”you know“ فرینڈز میری ایسی کوئی خواہش نہیں جو میری ممانے پوری نہ کی ہو۔“

”چلو بہت مسکا لگ گیا۔ اب دھیان سے کھانا کھاؤ سب۔“ انہوں نے سب کے لیے کھانا نکالتے ہوئے کہا تھا۔

”مما! ایک بات مانیں گی؟“

”ہاں بیٹا! بولو۔“

”مما! اس مرتبہ میں اپنی کامیابی کی خوشی میں اپنی پسند کا گفٹ لینا چاہتی ہوں۔“

”اچھا کیا چاہے میری چندا کو؟“

”مما! مجھے موبائل لے دیں۔“

”موبائل؟“ انہیں حیرت ہوئی تھی۔

”دیکھیں ناں! ممما! میری سب فرینڈز کے پاس

موبائل ہے۔ صرف میرے پاس نہیں ہے۔“ وہ منہ بنا کے بولی تھی۔

”جی آنٹی! اب کون سا یہ بچی ہے۔ ماشاء اللہ

انٹرکلیئر کر لیا ہے۔ وہ بھی پوزیشن کے ساتھ اب اسے

بھی موبائل لے دیں۔ ہم نے بھی جب اس سے

بات کرنی ہوتی ہے تو آپ کے نمبر پر کال کرنی پڑتی

ہے۔ ہمیں بھی کال کرتے وقت جھک سی محسوس ہوتی

ہی خواہشیں ہوتیں جنہیں وہ ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ اس لیے کل کی فکر میں انہیں اپنے آج میں ہی کچھ کرنا تھا۔ چند دنوں کی بھاگ دوڑ میں انہیں ایک پرائیویٹ کالج میں جاب مل گئی۔ درنایاب بھی تین سال کی ہونے والی تھی۔ اس لیے انہیں جاب میں زیادہ پرابلم نہیں ہوئی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت کو بنایا تھا۔ انہوں نے اسے بڑی بڑی باتیں سمجھانا شروع کر دی تھیں۔ اس کی پڑھائی پر بھرپور دیتیں۔ یہ بھی وجہ تھی کہ وہ اپنی کلاس میں سب سے ذہین طلبہ تھی۔ اس کا ہوم ورک پرفیکٹ ہوتا ہر روز وہ اپنا سبق باقاعدگی سے یاد کر کے جاتی اور جب پیچرز اس کی تعریف کرتیں تو عائشہ درانی کو لگتا انہیں دنیا جہاں کا خزانہ مل گیا ہو۔ اب وہ اسی کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز تھیں اور احسن طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔

☆.....☆

آج درنایاب کی ساری فرینڈز ان کے گھر جمع تھیں۔ درنایاب نے اپنی پوزیشن کی خوشی میں سب کو دعوت دی تھی اور وہ خوشی سے پورے گھر میں کسی تلی کی مانند گھومتی پھر رہی تھی۔ عائشہ درانی کو اپنے گھر میں رونق اسی کے دم سے محسوس ہوئی۔ سفید پیروں کو چھوٹی فراک پہنے بڑا سادو پیٹہ شانوں پر پھسلائے وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہی تھی۔

”آنٹی! آپ کو پیٹہ سے درنایاب کو دیکھ کر ہمیں بہت رشک آتا ہے۔ یہ بہت لگی ہے۔“ کھانا کھاتے ہوئے اس کی ایک فرینڈ نے کہا تو عائشہ درانی ہنس پڑی تھیں۔

”وہ کیسے بیٹا؟“

”آنٹی! یہ اتنی ذہین ہے۔ ہم بھی اتنا پڑھتے ہیں۔ ہر بار اتنی کوشش کرتے ہیں کہ پوزیشن

انہیں بہت شدت سے احساس ہوتا۔ کاش ان کا بھی کوئی اپنا ہوتا۔ جہاں وہ آجاسکتیں۔ کوئی ان کے گھر آتا۔ یوں اکیلے زندگی ناگزرتی مگر زندگی میں ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی ناں۔

☆.....☆

رات کو پیاس کی شدت سے ان کی آنکھ کھلی تو وہ پانی پینے کچن میں آئیں۔ اچانک درنایاب کے کمرے کی جلتی لائٹ پر نظر پڑی اور انہوں نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں ایک بنجنے والا تھا۔ درنایاب رات کو کبھی اتنی دیر تک جاگ کر نہیں پڑھ کر تھی۔ حیران و پریشانی کی کیفیت میں وہ درنایاب کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ عائشہ درانی کو ایک دم اپنے کمرے میں دیکھ کر گھبراہٹ کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر لہرانے لگی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑے موبائل کو جلدی سے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

”دری! تم ابھی تک سوئی نہیں؟“

”وہ..... ماما.....“ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بمشکل جواب دیا تھا۔

”لائٹ آف کرو اور سو جاؤ عین آجائے گی۔“

”جی ماما!“ اس نے فوراً تابعداری سے جواب دیا تھا۔ پھر اکثر ایسا ہونے لگا کہ درنایاب بہت خوش رہنے لگی۔ بے وجہ اکیلی بیٹھی رہتی۔ ٹیوشن سے آکر کھانے کے بعد جو نام وہ ماما کے ساتھ گزارتی تھی۔ اب پڑھائی کا بول کر فوراً اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ عائشہ درانی نے زیادہ نوٹ نہیں کیا۔ ان کے حساب سے وہ اب بڑی کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس لیے پڑھائی بھی زیادہ وقت مانگتی تھی۔ لیکن جو تہائی انہیں درنایاب کی موجودگی میں کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی اب بہت اکیلا پن محسوس کرنے لگی تھیں۔ جیسے گھر میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا موجود ہی نا ہو۔

ہے اگر اس کے پاس موبائل ہوگا تو ہم آرام سے جب چاہیں اس سے بات کر سکتے ہیں۔“ اس کی فرینڈز نے بھی اس کی حمایت میں بولنا ضروری سمجھا تھا۔ عائشہ درانی عجیب سی کشمکش میں مبتلا خاموش بیٹھی تھیں۔

”دیکھیں ناں ماما! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنی فرینڈز سے کہا تھا کہ آپ میری ہر بات مانگتی ہیں۔ پلیز میری انسٹلٹ نا کرو ایسے گا مان جائیں ناں۔“

”ok۔“ گہرا سانس لیتے ہوئے انہیں ماننا ہی پڑا تھا۔

”یاہو.....“ اس نے نعرہ لگاتے ہوئے بھرپور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

☆.....☆

اگلے دن ہی درنایاب کے ساتھ جا کر انہوں نے اس کی پسند کا موبائل اسے لے دیا۔ وہ خوش خوشی موبائل کے فکشن چیک کرتی رہی اور عائشہ درانی کے ساتھ اس نے اپنی ڈھیروں تصویریں بھی بنالیں۔ درنایاب کی خوشی سے بڑھ کر بھلا ان کے لیے کیا اہم تھا۔

تھرڈ ایئر کے ایڈیشن اسٹارٹ ہوئے تو عائشہ درانی کے کہنے پر اس نے BS اوپر میں ایڈیشن لے لیا۔ اس مرتبہ بھی کلاس میں اس کی کارکردگی پہلے کی طرح برقرار تھی۔ دونوں ماں بیٹی ایک ساتھ کالج کے لیے نکلتیں شام کو عائشہ درانی زرا جلدی آجاتیں تو وہ درنایاب کے آنے سے پہلے اس کے لیے کھانا تیار کھتیں۔ کھانا کھا کے وہ کچھ دیر آرام کرتی پھر ٹیوشن چلی جاتی۔ اس دوران عائشہ درانی گھر کے چھوٹے پھوٹے کام نبھال لیتیں۔ رات کو کچھ دیر وہ عائشہ درانی سے باتیں کرتی پھر پڑھنے چلی جاتی۔ عائشہ نماز پڑھ کے جلدی سو جاتیں۔ ایک روٹین کی طرح ساکن زندگی گزر رہی تھی۔ کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ کبھی کبھی

ہوئے ہاتھ رک گیا۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔  
 ”میں کچھ پوچھ رہی ہوں دری؟“ انہوں نے  
 بہت آرام سے کہا تھا۔  
 ”وہ..... ممما..... علی.....“  
 ”ہاں بولو۔“

”ممما! ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے  
 ہیں۔“ نظریں جھکائے اس نے بتایا تھا۔ عائشہ درانی  
 نے بے یقین نگاہوں سے سامنے بیٹھی اپنی بیٹی کو دیکھا  
 تھا۔ دل میں بہت دکھ ہوا لیکن چہرہ ابھی بھی نارمل  
 تھا۔

”میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں اگر ہو سکے  
 تو ملنا چاہتی ہوں۔“ عائشہ درانی نے یوں کہا تھا۔ جیسے  
 کوئی خاص بات نہ ہو۔ درنایاب حیرت و خوشی کی  
 کشمکش میں بیٹھی بے یقینی سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ  
 اتنی جلدی ماں جائیں گی اس کے تو وہم و گمان میں بھی  
 نہیں تھا۔

☆.....☆

اگلے دن پھر عائشہ درانی نے علی سے بات کرنے  
 کو کہا تو وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولی تھی۔

”ممما! وہ اکیچولی علی تھوڑا ڈر رہا تھا آپ سے۔  
 اس لیے وہ آپ سے ملنے تو نہیں آ سکتا لیکن وہ کال پر  
 بات کرے گا آپ سے۔“ انہوں نے اثبات میں سر  
 ہلادیا پھر درنایاب کے سامنے ہی علی کو کال کی تھی۔

”ہیلو بیٹا! اسلام و علیکم! میں درنایاب کی مہربانیاں  
 کر رہی ہوں۔“ عائشہ درانی نے اپنا تعارف کروایا  
 تھا۔

”جج..... جی آنٹی کیسی ہیں آپ؟“ دوسری  
 طرف گھبراہٹ واضح تھی۔  
 ”اللہ کا شکر ہے آپ کیسے ہو بیٹا؟“ وہ شائستگی  
 سے بولی تھیں۔

”جج میں بھی ٹھیک ہوں۔“

”اور آپ کے گھر میں سب کیسے ہیں؟“

درنایاب ابھی اکیڈمی سے نہیں آئی تھی۔ کچن کا سارا  
 کام سمیٹ کر وہ فارغ تھیں تو درنایاب کے کمرے کی  
 صفائی کرنے اس کے کمرے میں آ گئی۔ کمرہ سینٹے  
 ہوئے ان کی نظر سائیڈ پر پڑے موبائل پر پڑی۔ اکثر  
 فارغ وقت میں وہ اپنی اور درنایاب کی تصویریں دیکھا  
 کرتی تھیں۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے موبائل اٹھایا تو  
 موبائل پر لگے سیکورٹی کوڈ نے ان کے ماتھے پر کل  
 ڈال کر انہیں کچھ غلط ہونے کا اشارہ دیا تھا۔

اگلے دن درنایاب کالج جانے لگی تو انہوں نے  
 اس سے موبائل مانگ لیا۔

”ممما! آپ نے کیا کرنا ہے موبائل؟“ اس کے  
 چہرے کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا تھا۔

”کیا کرنا ہے مطلب؟ اب میں تمہارا موبائل  
 بھی نہیں دیکھ سکتیں؟“

”نہیں ممما! ایسی بات نہیں ہے۔ میں ابھی لاتی  
 ہوں۔“ وہ اٹھ کے کمرے میں گئی تو عائشہ درانی بھی  
 اس کے پیچھے ہی کمرے میں آ گئی تھی اور درنایاب کے  
 موبائل اٹھاتے ہی اس کے ہاتھ سے موبائل پکڑ لیا  
 تھا۔

”اسے تو سیکورٹی کوڈ لگا ہوا ہے۔“ انہوں نے  
 کسی بھی قسم کی حیرانی ظاہر کیے بغیر نارمل انداز میں کہہ  
 کر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ درنایاب کے  
 دھڑکتے دل کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے کوڈ کھول دیا  
 عائشہ درانی نے موبائل لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔  
 اور دونوں اپنے اپنے کالج کے لیے نکل پڑی۔

شام کو جب درنایاب اکیڈمی جا چکی تھی تو عائشہ  
 درانی نے اپنے بیگ سے موبائل نکالا اور پھر ان کے  
 سامنے سے سب پردے ہٹتے چلے گئے۔ سب کچھ  
 واضح ہو گیا تھا۔ اب ان کے شک کو یقین کی سند مل  
 چکی تھی۔ رات کو کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے بڑے  
 نارمل انداز میں پوچھا تھا۔

”یہ علی کون ہے؟“ درنایاب کا کھانا کھاتے



اس بار اس نے بکرے کے علاوہ عید کی شاپنگ میں بھی کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ اس کے عید کے کپڑے بھی عائشہ درانی خود لے آئی تھیں۔ جنہیں اس نے بے دلی سے ایک نظر کے بعد دوسری بار دیکھا تک نہیں تھا۔ لوگ عید کی خوشیاں منانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور وہ دنیا جہاں سے کئی الگ تھلگ پڑی رہتی۔

کل عید تھی اور درنایاب آج بھی رات کا کھانا کھائے بغیر کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ عائشہ درانی نے کل کے لیے کپڑے استری کر کے پھیگ کیے اور درنایاب کے کمرے میں آئیں تو وہ لائٹ آف کیے تکیے میں چہرہ چھپائے لیٹی ہوئی تھی۔

”ارے دری بیٹا! ایسے کیوں لیٹی ہو؟“ لائٹ آن کر کے اس کے پاس بیٹھ کے بالوں میں ہاتھ پھرتے ہوئے محبت سے بولی تھیں۔

”کچھ نہیں ماما۔“ بھگی آواز میں بولتی وہ اٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔

”دری بیٹا! کوئی پریشانی ہے کیا؟ ماما کو نہیں بتاؤ گی۔“ ان کے اتنے لاڈ محبت سے پوچھنے کی دیر بھی وہ ماں کے گلے لگی رو پڑی تھی۔ کچھ دیر رونے کے بعد سنبھلی تو عائشہ درانی نے نرمی سے اسے الگ کیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ بتاؤ شاباش۔“

”ماما علی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔“ وہ روتے ہوئے جیسے شکایت کرنے لگی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”جس دن سے آپ نے اس سے بات کی

ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ مجھ سے ٹھیک سے بات ہی نہیں کرتا۔ میں پوچھتی ہوں تو ٹال دیتا ہے اور ایک دن اس کا میسج آیا کہ آج کے بعد مجھ سے رابطہ نہ کرنا اور اب اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا ہے ماما۔“ ساری

”سب ٹھیک ہیں۔ درنایاب نے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ خیریت تو ہے آنٹی؟“ وہ فوراً مدے پر آیا تھا۔

”ہاں دراصل میں بات تم سے نہیں تمہاری امی سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن پھر سوچا جس کے ریفرنس سے بات کرنی ہے پہلے اس سے بات کر لوں۔“

”ای سے..... لیکن کیوں آنٹی؟“

”مجھے درنایاب نے بتایا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو اسی سلسلے میں، میں تمہاری ماما سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ بڑوں میں بات طے ہو جائے تو اچھا ہے۔“

”جی آنٹی! میں کوشش کروں گا۔“ وہ سنبھل کے بولا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے بیٹا! جب تمہاری ماما نے بات کرنی ہو تو مجھے اسی نمبر پر کال کر لینا۔“

”جی آنٹی ضرور۔“

”او کے بیٹا! اللہ حافظ۔“ انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

”ماما تھیک پو تھینک یو سو میچ۔“ درنایاب خوشی سے چبکتی عائشہ درانی سے لپٹ گئی تھی۔

☆.....☆

کافی دن گزر گئے ناعلیٰ نے کال بیک کی اور نا عائشہ درانی نے دوبارہ کوئی رابطہ کیا لیکن چند ہی دنوں میں درنایاب کی ہنسی کہیں کھو گئی تھی۔

ذوالحجہ کا چاند نظر آ گیا تھا۔ بچوں کو نئے کپڑوں سے زیادہ قربانی کے جانوروں سے لگاؤ تھا۔ ہر گلی، محلے می بچے بکروں کی رسیاں پکڑے گھومتے رہتے۔ عائشہ درانی نے بھی ایک کو لیگ کے توسط سے قربانی کے لیے بکرالے لیا تھا۔ ہر سال درنایاب بکروں کی خوب آد بھگت کرنی۔ نہلائی ٹائم پر چارہ دیتی اور عید کے دن ان کی جدائی پر موٹے موٹے آنسو بہاتی مگر

کرتا ہی نہیں تھا اور نہ کبھی شادی کرنے والا تھا۔“  
 انہوں نے بے نہیں پوچھا تھا کہ وہ علی کو کیسے جانتی  
 ہے مگر وہ اسے دنیا کی حقیقت سے آگاہ کر رہی تھیں۔  
 ”آئی ایم سوری ماما! آئی ایم ریلی سوری، ان  
 کے سامنے ہاتھ جوڑ کے وہ شرمندگی سے بولی تھی۔  
 ”ایک شرط پر معاف کرو گی۔“ ان کا دل اب  
 پکا پکھلا ہو گیا تھا۔ اس لیے مسکراتے ہوئے بولی  
 تھیں۔

”کبھی شرط ماما؟“  
 ”دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرو گی اور ہمیشہ کلاس میں  
 فرسٹ آؤ گی۔“  
 ”یہ تو دو شرطیں ہو گئیں ماما۔“ وہ شرارت سے  
 بولی تھی۔

”دوبی سہی پر ممانی پڑیں گی۔“  
 ”اوکے باس۔“ وہ ہنستے ہوئے ان کے ساتھ  
 لگ گئی تھی۔  
 ”میرا بکرا کہاں ہے ماما! مجھے اس کے ساتھ  
 سو بیٹ سی سیلفی لینی ہے۔“ وہ اپنے پرانے روپ میں  
 لوٹ آئی تھی۔  
 ”وہ ناراض ہے تم سے۔ اس لیے وہ تو سیلفی نہیں

بنوانے والا۔“  
 ”اپو بس نہیں بنوائے گا۔“ وہ بیڈ سے اترتی باہر کی  
 طرف بھاگ گئی تھی۔

عائشہ درانی مطمئن سی مسکرانے لگی تھیں۔ انہیں  
 یقین تھا کہ ان کی درنایاب دوبارہ ایسی غلطی نہیں  
 دہرائے گی۔ کیوں کہ انسان اس وقت تک نہیں سمجھتا  
 جب تک اسے ٹھوکر نہ لگے اور درنایاب محبت کے نام  
 پر ٹھوکر کھا چکی تھی۔ اس لیے عائشہ درانی کو یقین تھا کہ  
 اب ان کی درنی ایسی کسی جھوٹی محبت پر یقین نہیں  
 کرے گی۔ اس بڑی عید نے اسے بڑا سبق دے دیا  
 تھا جو اسے ساری زندگی یاد رہنے والا تھا۔

☆.....

بات بتا کر وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے پھر رو پڑی  
 تھی۔ عائشہ درانی نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

”دوری بیٹا! مجھے بہت پہلے ہی معلوم تھا کہ ایسا  
 ہونے والا ہے۔ تمہیں پتہ ہے لڑکیاں بہت حساس  
 ہوتی ہیں۔ بہت جلد دوسرے انسان کے ساتھ  
 اموشنل ہو جاتی ہیں اور بہت سی امیدیں اور توقعات  
 وابستہ کر لیتی ہیں لیکن لڑکے ایسا نہیں کرتے ان کے  
 لیے یہ سب انجوائے منٹ ہے۔ میں سب لڑکوں کی  
 بات نہیں کرتی مگر آج کل زیادہ تر یہی ہو رہا ہے۔ تم  
 جانتی ہو جب تم نے مجھے علی کے بارے میں بتایا تو  
 عام ماؤں کی طرح میں نے تمہارے ساتھ سختی کیوں  
 نہیں کی؟ بے جا پابندیاں اور روک ٹوک کیوں نہیں  
 کی؟ کیوں کہ اگر میں ایسا کرتی تو تمہارے اندر  
 بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے اور یقیناً تم مجھے اپنا  
 دشمن سمجھنے لگتیں اور میری لاکھ پابندیوں کے باوجود بھی  
 تم اپنی دلی خواہشات کو روک نہیں پاتیں اور زندگی  
 میں تمہیں جب بھی موقع ملتا تم ایسی ہی غلطیاں دوبارہ  
 کرتیں اس لیے میں نے بہت کل کا مظاہرہ کرتے  
 ہوئے علی سے بات کی تھی۔“ وہ غور سے ماں کی باتیں  
 سن رہی تھی۔

”تم جانتی ہو جب کوئی لڑکا کسی لڑکی سے سچی  
 محبت کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ لڑکی کے ساتھ محبت  
 کے بڑے بڑے دعوے نہیں کرتا اور نہ محبت کے لیے  
 موبائل پر رات دیر تک میسجز اور کال پر بات کرنے کی  
 ضرورت ہوتی ہے۔ وہ لڑکا سیدھا اور صاف راستہ  
 اختیار کرتے ہوئے اپنے گھر والوں کو لڑکی کے گھر  
 بھیجتا ہے اور لڑکی کے ساتھ شرعی رشتہ بنانے کی کوشش  
 کرتا ہے۔ سچی میں نے علی سے شادی کی بات کی  
 تھی۔ کیونکہ میں جان گئی تھی کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے  
 گا اور میرے کہنے پر تم بھی میری بات پر یقین نہ  
 کرتیں اور دیکھو تم کیسے شادی کے نام پر ہی اس نے  
 اپنا نمبر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ کیونکہ وہ تم سے محبت



## عید کا پہلا سفر

بیگم ہی اس کی پرورش کرتی آرہی تھیں۔ انہوں نے اب تک اس کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو پورا کیا تھا۔ وہ ضدی اور تک چڑھی تھی۔ نانی کے پرس میں سے چپکے سے پیسے نکال لیتی اور خرچ بھی کر دیتی بعد میں نانی کو پتا چلتا تو اپنا سر پیٹ لیتیں۔



”ارے بخت ماری یہ کیا کر دیا، یہ تو کیل کے پیسے تھے۔ میں نے الگ کر کے رکھے تھے۔“ وہ ڈھٹائی سے منس دیتی۔

لیکن رقیہ بیگم تھوڑی ہی دیر میں پھر سے اس کے لاڈ پیار کرنا شروع کر دیتیں۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس دن مشعل نے نانی کے ساتھ شہر کی بہتر ہوٹلاریٹ سے جا کر اپنے لیے سوٹ کا کپڑا خریدا اور خوش خوشی گھر لے آئی۔ ابھی وہ شام کی چائے بنا رہی تھی کہ نانی کچن میں چلی آئیں۔

”ارے مشو یہ تیرا سوٹ کڑھائی والا ہے۔ بہت مہنگا آیا ہے۔ ایسا کر اس کو گھر میں خود ہی سی لینا۔ درزی سے سلواؤ کی تو اس کا خرچہ الگ آجائے گا۔“

”نانی! ایک تو آپ مجھے مشو نہ کہا کریں۔ سب لوگ ہنستے ہیں اور دوسرے یہ کہہ میں یہ سوٹ درزی سے

ہی سلواؤں کی۔ درزی زیادہ اسٹائلش سی دے گا۔ میں بھلا کیسے سیوں گی اتنی گرمی میں۔ اوپر سے لوڈ شیڈنگ اف توبہ۔“ مشعل نے ایک ہی سانس میں کہا اور نانی چپ ہو رہیں۔ جانتی تھیں کہ اپنی نواسی کے آگے بحث کرنا بے کار ہے۔ آخر میں جیت اسی کی ہوتی ہے۔ وہ

ضدی اور منہ پھٹ ہے۔ ان کی بات بھی نہیں مانے گی۔ زیادہ ہی کچھ کہا تو پھر بھوک ہڑتال شروع ہو جائے

”دادی! مجھے اس عید پر اچھا سا سوٹ لے کر دیں۔“ مشعل نے ضدی لہجے میں کہا۔

”ارے کیسی باتیں کر رہی ہو مشعل دماغ پھر گیا کیا تمہارا ابھی تو پچھلے دنوں تمہیں ایک سوٹ لے کر دیا تھا۔“ نانی رقیہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں پتا مجھے عید پر نیا سوٹ لے کر دیں۔“

”اچھا نیا لے دوں؟ اور وہ جو ابھی تو نے لیا ہے اس کا کیا ہوگا۔“ دادی بولیں۔

”وہ کوئی عید کا تھوڑی تھا اور ویسے بھی وہ میں نے سب کے سامنے پہن لیا ہے اب عید پر نیا ہونا چاہیے۔“ مشعل بضد تھی۔

”اچھا بھی! اچھا ٹھیک ہے۔ دلادوں گی۔“ رقیہ بیگم نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور پھر اپنا پرس اٹھا کر پیسے گننے لگیں۔ سات سو..... آٹھ سو..... یہ ہوئے ہزار اور یہ ہوئے.....!

”نانی! ایک تو آپ بھی ناں بڑی کج بخت ہیں۔ پیسے کا بڑا حساب رکھتی ہیں۔“

”ارے توبہ کرو لڑکی، اس میں کجی کی کیا بات ہے اور ویسے بھی یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ پیسہ پانی کی طرح بہائے جاؤ۔“

”نانی! آپ میری مائیں تو گھر کا خرچہ میرے ہاتھ میں دے دیں۔“

”تمہارے ہاتھ میں تو کبھی نہیں دوں گی میں خرچہ تم تو ایک ہی دن میں ساری پرسن خرچ کر ڈالو گی۔“ ادی نے اسے ڈٹے ہوئے کہا۔

مشعل بیگم رقیہ کی اکٹوتی نواسی تھی۔ ماں باپ کا لے کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے رقیہ

گی۔ وہ بس اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئیں۔ پھر دونوں نے کمرے میں بیٹھ کر چائے پی۔

☆.....☆

عید آنے میں ابھی مہینہ پڑا تھا۔ مشعل پورے گھر کی صفائی ستھرائی میں لگی ہوئی تھی۔ رقیہ صحن میں چڑیوں کو باجرہ ڈال رہی تھیں۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

”او! اس وقت کون آگیا۔“ مشعل بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولنے پر تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکیہ کھڑا تھا۔ ڈاکیہ نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور سلام کرتا ہوا چلا گیا۔ مشعل ہاتھ میں لفافہ لیے ہولنوں کی طرح اندر چلی آئی۔

”کس کا ہے؟“ نانی نے اس کی حیران صورت دیکھ کر پوچھا۔ جواب میں مشعل کے چہرے پر مزید بدحواسی طاری ہو گئی۔

”ارے کجخت بتاتی کیوں نہیں کس کا ہے۔“ نانی پریشان ہو کر بولیں۔

”چنانچہ کسی عمران کا ہے۔“ مشعل نے لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ جسے انہوں نے فوراً ہی دونوں ہاتھوں سے دیو بج لیا۔ لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگیں اور پھر ساتھ ہی وہ اپنا دل پکڑ کر چار پانی پر بیٹھ گئیں۔

”مشعل بیٹی پانی لا۔“ وہ تھکاوٹ سے چور لہجے میں بولیں۔

”ہائے ہائے ایسا بھی کیا ہو گیا نانی ٹھہریں میں پانی لانی ہوں۔“ مشعل دوڑی دوڑی گئی اور ایک گلاس پانی لے آئی۔ رقیہ نے جلدی سے پانی پیا پھر اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھیں۔ لفافہ ان کے ہاتھ میں ہی تھا۔ مشعل بھی ان کے پیچھے لپکی۔ نانی بستر پر بیٹھ کر لفافے کو کھینچ لگیں۔

”کیا ہوا نانی کچھ بتائیے ناں۔“ پھر نانی نے لفافہ ایک طرف رکھا اور تمہید باندھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی دوا دلا دیں تھیں۔ ایک تو مشعل کی ماں

اور دوسرا ان کا بیٹا فیصل۔ فیصل بڑا ہو کر پڑھ لکھنے کے بعد لندن بیرون ملک جا بسا۔ اُدھر رقیہ اس انتظار میں رہیں کہ بیٹا باہر کمانے گیا ہے تو پیسہ بھیجے گا لیکن فیصل نے پلٹ کر کبھی ان کی خبر تک نہ لی۔ وہ بے چاری اپنی قسمت کو روٹی رہ گئیں۔ فیصل کے یہاں شادی کے ڈیڑھ سال بعد ایک بیٹا ہوا۔ اس کا نام عمران تھا۔ عمران کو رو برو دیکھنا تو دور انہوں نے اسے کبھی تصویر خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ فیصل انہیں چھوڑ کر دوسرے دیس جا بسا تھا لیکن آج عمران کا خط آیا تھا اس نے بتایا تھا کہ فیصل اور اس کی ماں میمونہ کالندن میں کارا یکسٹنٹ میں انتقال ہو گیا، وہ اکیلا ہے، مار باپ کے سوا اس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ لہذا وہ ہمارے گھر رہنے آ رہا ہے۔

مشعل پرتو جیسے بم بلاسٹ ہو گیا۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر یہ اچانک سے اس کا کزن عمران کہاں سے ٹپک پڑا۔ نانی نے بتایا کہ وہ اس سے تین سال بڑا ہے۔

”ہائے ہائے نانی میں ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہوں گی۔“ مشعل اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

”آپ اس سے کہیں کہ وہ اپنے رہنے کے لیے کوئی کرائے کا گھر ڈھونڈ لے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو رشو! میں اب اتنی بڑی تھوڑی ہوں کہ فیصل کے کیے کی سزا اسے یوں دلا کہ اس چھت کے نیچے جگہ ہی نہ دوں۔“

”ارے چھوڑیے نانی! آپ بھی کیا بے کار بات لے کر بیٹھ گئیں۔ میں اس کو ایک سینکڑن گھر میں بیٹھ کھنڈے دوں گی۔“

”اچھا بس بڑا ہے وہ تم سے عزت سے نام لواتا۔“

”ہونہہ! انہیں کرنی مجھے اس کی کوئی عزت و زت ابھی وہ اس گھر میں آیا نہیں اور آپ نے اس کے لا شروع کر دیے۔ مجھے بھول گئی ہیں آپ۔“ مشعل

”ارے دادی آپ، مجھے پہچانا۔“ اس نے بالکل بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”ارے کیسے پہچانتی بیٹا تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں۔“ رقیہ بیگم پیار سے اس کا ہاتھ چوم کر بولیں۔  
 ”ارے اندر آؤ نا بیٹا! ہر کیوں کھڑے ہو۔ گرمی لگ جائے گی۔“ انہوں نے مزید کہا اور عمران کو لے کر اندر آ گئیں۔

”کون کجبت ہے نانی۔“ مشعل نے ان کی باتیں سن لی تھیں اور اب انجان بننے کی اداکاری کر رہی تھی۔  
 ”اوپں ہوں ایسے نہیں کہتے کیا سمجھایا تھا میں نے تمہیں۔ تم سے پورے تین سال بڑا ہے۔ تمیز سے بات کرو۔“ رقیہ بیگم نے اسے ڈپٹا۔ عمران نے پہلے چونک کر مشعل کو دیکھا اور پھر اپنا بیگ ایک طرف پھینک کر اس کی طرف گلے ملنے کے انداز میں لپکا۔  
 ”ارے مائی بے بسی سسر۔“ مشعل گھبرا کر چیخے ہوئی۔  
 ”ارے بیٹا کیا کمر ہے ہو۔“ رقیہ بیگم اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔  
 ”بیٹا یہ پاکستان ہے یہاں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے گلے نہیں ملتے۔“

عمران نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ”چلیں ہاتھ تو ملاتے ہوگی گے ناں۔“ اور یہ کہنے کے ساتھ ہی عمران نے مشعل کا کوئل نازک سا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر مسل ڈالا۔ وہ ”سی“ کر کے رہ گئی۔ دل میں غصہ تو بہت آیا مگر نانی کے سامنے اس سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
 ”تمہیں تو بعد میں دیکھ لوں گی۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑاتی۔

”کچھ کہا آپ نے؟“ عمران نے پوچھا۔  
 ”نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ مشعل نے منہ بسور کر کہا۔  
 ”چلیے آپ اندر چل کر ساری غلط فہمی دور کر دیں گے۔“ عمران نے چپک کر کہا۔

نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔  
 ”ارے کیا ہو گیا ہے بچی اس گھر میں کوئی بھی آئے تیری اہمیت تو کم نہیں ہو سکتی ناں۔ چل بس چپ کر جا۔“ نانی نے چپ کر لیا تو وہ خاموش ہو گئی۔  
 ☆.....☆

نانی بہت خوش نظر آرہی تھیں جب کہ مشعل کا ابھی بھی عمران کے یہاں آنے کا سن کر منہ بنا ہوا تھا۔  
 ”اے مشو ذرا دیکھ تو سالن اتنا ہے کہ ہم دونوں کو ہو جائے۔“ انہوں نے پیار سے پوچھا۔  
 ”ہاں بہت ہے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔“ مشعل حلق پھاڑ کر بدتمیزی سے بولی۔ نانی بے چاری چپ ہو رہیں۔  
 ☆.....☆

گرمی بہت شدید تھی اور آج عمران نے آنا تھا۔ رقیہ نے صبح ہی صبح مشعل سے گھر کی صفائیاں شروع کر وادی تھیں۔ اب دوپہر کا ایک بجنا تھا۔ جتنی دھوپ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ نانی نے انہی سفید چادر سر پر درست کی اور چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھیں۔

”لگتا ہے عمران آگیا۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”ہونہہ!“ مشعل نے منہ میڑھا کرتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ منہ کس کو بنا کر دکھا رہی ہو اور سنو اس کے سامنے تمیز سے رہنا اور ہاں دوپٹہ لو۔ بے حیا۔“ نانی نے اسے جھڑکا۔

”اسے پوچھتی ہے میری جوتی۔“ مشعل نے اٹھائی سے جواب دیا۔ نانی نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی لڑکا کھڑا تھا۔

”یہ رقیہ بیگم کا گھر ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”ہاں بالکل، میں رقیہ ہوں۔“ رقیہ بیگم نے کہا۔ اس کے نے ایک سیکنڈ کے لیے رقیہ بیگم کو بلک چھپکائے فیرو دیکھا پھر خوشی سے چلا تا ہوا ان کے گلے لگ گیا۔



”بیٹا مشو ایسا کرو کہ عمران کے لیے شربت بنا لاؤ۔“ رقیہ بیگم نے کہا۔  
 ”نانی! آپ کو کتنی بار کہا ہے۔ مجھے مشومت کہا کریں۔“ مشعل جل کر بولی۔

☆.....☆

آج پانچواں روز تھا رقیہ مشعل سے کہہ کر عمران کے لیے رات کے کھانے میں کڑی بنوار ہی تھیں۔ وہ گرمی سے تنگ آ رہی تھی۔

”ارے کیا نانی آپ بھی کب تک اس بدتمیزی و عوتیں کرتی رہیں گی۔ اب بس بھی کریں۔“ مشعل نے منہ بسور کر کہا۔

”وہ کوئی مہمان نہیں ہے جو میں اس کی دعوتیں کروں گی اس گھر کا ہی فرد ہے وہ بھی سمجھیں۔“

”ہونہہ۔“ مشعل نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ رقیہ بیگم مزید اسے ملامت کرنا چاہتی تھیں مگر خاموشی میں ہی عافیت جانی اور بچن سے نکل کر اندر کمرے میں جا کر آرام کرنے لگیں۔ ادھر عمران بچن میں چلا آیا۔

”سنیے۔“ اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

”جی سنا ہے۔“ مشعل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”آپ اتنی گرمی میں کام کر رہی ہیں یہاں پنکھا چلا لیجئے ناں۔“

”کیوں بل آپ بھریں گے؟“ مشعل نے ایک بار پھر طنز کا وار کیا۔

”جی میں بھروں گا۔“ اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ مشعل کو آگے کچھ جواب سمجھ نہ آیا تو

چپ ہو رہی۔ جب شام کا وقت قریب آیا تو رقیہ نے شور مچا دیا۔

”مشو بیٹا! جلدی کرو میرے ساتھ مل کر دسترخوان لگواؤ۔“ مشعل نے رقیہ بیگم کے ساتھ مل کر دسترخوان پر مختلف لوازمات رکھنے شروع کیے۔

”نانی آپ ان صاحب کے آنے سے پہلے تو کبھی اتنا اہتمام نہیں کرتی تھیں۔“ مشعل نے بدتمیزی سے کہا۔

”تو کیا ہوا اگر اب کر لیا تو۔“ رقیہ بیگم نے اسے ٹوکا پھر اچانک ہی کچھ خیال کر کے اپنا پرس کھولنے لگیں۔

”ارے ہاں عمران بیٹے یہ پیسے لے لو۔“ ان کے پان اور سونف مجھے لا دینا۔“ انہوں نے پرس کھولتے ہوئے کہا لیکن اندر جھانک کر ٹھٹھکیں۔

”ہائیں! یہ کیا پیسے کہاں گئے۔“

”مجھے کیا معلوم آپ نے رکھے تھے۔“ مشعل نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

”کہاں چلے گئے۔“ رقیہ بیگم حیرت سے بولیں۔

”ارے میں بتاتا ہوں پیسے آج انہوں نے نکالے تھے۔“ عمران نے مشعل کی طرف اشارہ کیا۔

”اب بھول گئی ہیں بے چاری۔“ عمران نے اس کی پول کھول دی۔

”کیا پیسے تم نے نکالے تھے مگر کیوں؟“ رقیہ بیگم نے اسے ہور کر دیکھا تو اس نے اپنے سامنے رکھے

پکڑوں کی پلیٹ اٹھا کر دیوار پر دے ماری اور غصے سے وہاں سے چلی گئی۔ رقیہ بیگم حیران پریشان اسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔ مشعل اس واقعے کے بعد

عمران سے سخت چڑنے لگی تھی اور اس سے بدلہ لینے سوچے بیٹھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ عمران کو اس گھر سے ہی نکلوا دے۔ اس رات مشعل نے عمران کو الگ

کمرے میں بلایا اور پھر اچانک ہی شور مچا دیا۔

”بچاؤ بچاؤ، اف اللہ نانی جلدی آئیے۔“ عمرا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا سسر؟“ عمران نے پوچھا۔

”مجھے سسر مت کہو، بدتمیز لڑکے۔“ اتنے میں راقیہ بیگم شور شرابا سن کر وہاں پہنچیں۔

”ارے کیا ہو گیا آفت کی پرکالہ کیوں بچاؤ بچاؤ شور ڈالا ہوا ہے۔“ مشعل نے رقیہ کی آواز سن کر

دوپٹہ اتار کر عمران کی طرف اچھال دیا۔

”نانی! دیکھیں یہ میرے ساتھ بدتمیزی کر

لے آیا اور اسے رقیہ بیگم کے سامنے لا کھڑا کیا۔ مشعل کو بھی اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اتنے دنوں میں اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ عمران دل کا بہت اچھا ہے۔ اس نے دادی کی بیماری میں ان کا بہت خیال رکھا تھا اور مشعل کو بھی اس طرح جھوٹ بولنے اور الزام تراشی کرنے پر کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے نانی کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

”نانی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔“ اس نے ساری بات بتائی تو رقیہ بیگم خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ کئی دن گزر گئے مگر انہیں نے مشعل سے کوئی بات نہ کی وہ انہیں مٹاتی رہتی۔ کبھی ان کے سامنے ہاتھ جوڑتی کبھی ان کے پیر پکڑتی مگر وہ جواب میں خاموش رہتیں اور خلا گوگھوڑتی رہتیں۔

☆.....☆

آج چاند رات تھی۔ مشعل رقیہ بیگم کے پاس کمرے میں چلی آئی۔

”نانی! عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔ کل عید ہے۔“ اتفاق سے عمران بھی وہیں بیٹھا تھا۔

”نانی! عمران مجھے کب کا معاف کر چکے ہیں۔ آپ بھی معاف کر دیں پلیز نانی۔“ رقیہ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا پھر مسکرا دیں اور اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ مشعل خوشی سے رونے لگی۔

”اچھا ٹھیک ہے معاف کیا مگر ایک شرط پر۔“ انہوں نے کہا۔

”تمہیں اور عمران کو شادی کرنی ہوگی۔“ عمران اور مشعل نے چونک کر رقیہ بیگم کو دیکھا۔ ”بھئی انکار مت کرنا ورنہ میں ایسے ہی روٹھی رہوں گی۔“

”مجھے منظور ہے نانی، جیسے آپ کہیں۔“ مشعل نے شرم کر عمران کی طرف دیکھا اور شرم کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ عید کا چاند بھی ان کے لمن پر مسکرا ہوا تھا۔

☆.....☆

”رقیہ بیگم نے جو مشعل کو اس طرح داویلا کرتے اور عمران کے ہاتھ میں اس کا وہ پٹہ دیکھا تو سمجھ گئیں کہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ وہ یہ ہی سمجھیں کہ عمران باہر رہا ہے زندگی بھر اس لیے مغربی ماحول کا اثر ہے، بگڑ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”کیا ہوا شو! کچھ تو بول۔“

”اب کچھ بولنے کو نہیں رہا نانی۔“

”لیکن پھر بھی کچھ تو بتا آخر بات کیا ہے؟“

”نانی! اب بہت دیر ہو گئی۔“

”نہیں یہ جھوٹ ہے میں نے کچھ نہیں کیا۔“

عمران نے پہلی بار مشعل کو غصے سے دیکھ کر کہا اور آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر رسید کیا۔

”بتانی کیوں نہیں ہو بدتمیز لڑکی۔ سچ بتاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ مشعل کی تو حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ اتنی زور کا تھپڑ تو دور کی بات آج تک کسی نے اسے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا۔

”عمران مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“ رقیہ بیگم نے صدمے سے چور آواز میں کہا اور ساتھ ہی اپنا دل پکڑ لیا۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ عمران اور مشعل کے اب تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ عمران اور مشعل انہیں لے کر قریبی اسپتال گئے۔ وہاں انہیں فوراً ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ انہیں فوری ٹریٹمنٹ دیا گیا۔ اب ان کی حالت خاصی بہتر تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ایسا شاک کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہیں کسی بات سے صدمہ پہنچا ہے۔

☆.....☆

رقیہ بیگم اپنے کمرے میں بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ تب ہی عمران ان کے کمرے میں چلا آیا۔ اس نے آتے ہی انہیں یہ یقین دلایا کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

”میں تمہارا یقین نہیں کر سکتی۔ میری مشعل اتنا بڑا مہوٹ کبھی نہیں بولے گی۔“ مجبوراً عمران جا کر مشعل کو



# فصل

”ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! بہت خوب صورت! قابل ستائش!“

یہ الفاظ کس قدر سحر کن، کس قدر مدہوش کر دینے والے تھے۔ پہلی بار کسی کا مجھے دیکھ کر میرے بارے میں ایسے الفاظ ادا کرنا مجھے بے حد حیرت زدہ کر رہا ہے۔

آنکھوں میں آنسوؤں کو دبائے، ہونٹوں پر تبسم سجائے وہ اپنے بستر میں دبک کے بیٹھی تھی۔ خوشی سے اس کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ گھر میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ ماں باپ کی لاڈلی بیٹی روشانے جہاں ان کے دل کی ٹھنڈک تھی۔ وہیں اپنے بھائی اسد کی آنکھوں کا تارا بھی تھی۔

اس کی ہر خواہش کو سر آنکھوں پر رکھا جاتا اور ہر بات کو منہ سے نکلنے سے پہلے ہی پورا کر دیا جاتا۔ سب کے لاڈ پیارنے اسے بے حد حساس اور نازک مزاج بنادیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عائشہ بیگم نے روشانے کی شادی کرنے میں غلط بالکل نہیں دکھائی۔ بلکہ انہوں نے نہایت محل مزاجی سے اس کے لیے ایسا سسرال ڈھونڈا جہاں اسے کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔

اچھا خاندان، امیر گھرانہ، دولت کی ریل پیل اور لمبا چوڑا سسرال نہ ہونا یہ تمام خوبیاں کسی بھی رشتے میں دیکھنا عائشہ بیگم نے اپنا وظیفہ بنالیا تھا اور اس سوچ کی وجہ سے انہوں نے معلوم نہیں کتنے ہی اچھے رشتوں کو منع کر دیا۔ بالآخر طویل جدوجہد کے بعد عائشہ بیگم کو ایسا گھرانہ مل ہی گیا لیکن اس طوالت کی وجہ سے روشانے کی عمر کے کئی سال عائشہ بیگم کی سوچ کی نذر ہو گئے۔

ارمان اور اس کی ماں سے پہلی ملاقات میں ہی

عائشہ بیگم اس قدر متاثر ہوئیں کہ کسی سے بھی مشورہ کیے بغیر روشانے کی بات چکی کردی اور چٹ مٹکئی پٹ بیاہ والی بات کی۔

☆.....☆

”ارمان عمر میں روشانے سے پانچ سال چھوٹا ہے لیکن یہ ارمان اور اس کی والدہ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ عائشہ بیگم نے نہایت تقاضے سے کہا تو ہال میں موجود لوگ چیخو پیار کرنے لگے۔ ایک خاتون جو عائشہ بیگم کے بالکل عقب میں کھڑی تھیں۔ عائشہ بیگم کی بات سن کر گہو ہوئی۔

”دیکھ لیجیے گا یہ اچھائی کہیں مہنگی نہ پڑ جائے۔ زمانہ دیکھا ہے میں نے کہے دیتی ہوں ایسے ہی کوئی اپنے کم عمر لڑکے کے ساتھ اتنی بڑی عمر کی لڑکی کو نہیں بیاہ لیتا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔“ خاتون نے اپنی آنکھیں میٹکا کر کہا تو اس کی بات سن کر عائشہ بیگم غصے سے لال ہو گئیں انہوں نے یکدم ہی گھور کر اس کی طرف دیکھ لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

”ایسی باتیں کر کے بدشگونی تو نہ کیجیے۔ ابھی نکاح ہوا ہے اور آپ بجائے اس کے کہ دعا کریں روشانے اپنے گھر میں خوش رہے۔ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”ہائے! ہائے! ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟ میں ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی۔ تم تو میرے منہ کو آگئیں۔“ خاتون نے ہاتھ ہلا کر غصہ سے کہا اور پاؤں



☆.....☆

”میں اکتا گیا ہوں اب۔“ ارمان نے غصہ سے کہہ کر تو عالیہ بیگم نے چائے کا کپ فوراً میز پر رکھا اور ارمان کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹ سے بولیں۔

”کس چیز سے اکتا گئے ہو؟“ انداز سوالیہ تھا۔

”سوال کر کے اسے مزید تپا دیا اور وہ فوراً ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ کی بہو کی بے جا تعریفیں کرتے کرتے ایک فرمانبردار شوہر کا کردار ادا کرتے کرتے میں تھک گیا ہوں۔“ غصے سے اس کی آنکھوں میں لالی اتر آئی اور وہ چل کرٹی وی لاؤنچ میں چلا آیا۔ ارمان کے روپ سے عالیہ بیگم کو تشویش ہوئی تو وہ فوراً بیٹے کے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔

”ایسا بھی کیا ہو گیا ہے؟ تھوڑا صبر سے کام لو۔“ عالیہ بیگم نے اسے سنبھایا۔

”کیا صبر کروں؟ میرے سارے دوست بے مذاق اڑاتے ہیں۔“ ارمان نے استفسار کیا تو عالیہ بیگم نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر غصے سے بولیں۔

”تمہارے یہ دوست تمہیں کھانے کے لیے تو کچھ نہیں دیتے۔ تمہاری ساری عیاشی کا ہمیشہ میں۔

خیال رکھا ہے اور تمہیں اپنے دوستوں کی پروا ہے۔“

”مام! میرا مطلب ہے ہمیں یہ ڈرامہ اور کتنے دکرنا ہوگا۔ یار! میں فیڈ اپ ہو گیا ہوں۔“ اس بار وہ صبر سے بولا مگر اس کے لہجے سے اکتاہٹ واضح تھی۔

”صبر کرو بس تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے۔“ عالیہ بیگم نے ارمان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے صبر کی تلقین کی لیکن وہ ماں کی کہی ہوئی بات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے صبری سے پھر گویا ہوا۔

”اور کتنا صبر؟“ انداز سوالیہ تھا۔

”ماما..... اور کتنا صبر؟ اس عورت کے ساتھ ایک سیکنڈ بھی گزارنا مشکل ہے۔“ ارمان فوراً سے صوفے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں دھ

پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

”مجھے سب معلوم ہے یہ لوگ میری بیٹی اور داماد کو دیکھ کر جل رہے ہیں۔ اللہ میری بیٹی کو حاسدوں کی بد نظر سے بچائے۔“ عائشہ بیگم نے دل ہی دل میں کہا اور اس کی طرف بولیں۔ جہاں سب لوگ نئے نویلے جوڑے کے ساتھ تصویریں کھنچوانے میں مشغول تھے۔

عروسی لباس میں ملبوس روشانے شہزادی لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں اپنے باپ اور بھائی کی منتظر تھیں وہ دونوں کچھ عرصے سے کینیڈا میں مقیم تھے اور اچانک ویزا نہ ملنے کی وجہ سے پاکستان نہ آ سکے۔

اتنے اہم موقع پر اپنے باپ اور بھائی کی غیر موجودگی جہاں اس کی آنکھوں میں آنسو سج رہی تھی۔ وہیں نئی زندگی کے نئے سفر کے شروع ہونے کی خوشی اس کی آنکھوں میں نئے دیپ جلا رہی تھی۔

بالآخر بہت سارے لوگوں کی دعاؤں کے سائے میں عائشہ بیگم نے روشانے کو رخصت کر دیا۔ آہستہ آہستہ سب لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ بیٹی کی رخصتی پر عائشہ بیگم کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں لیکن ان کا دل ہر لمحے بیٹی کو ڈھیروں دعا میں دے رہا تھا۔

☆.....☆

”تمہیں اپنی زندگی کا ہمسفر بنا کے جتنی مسرت مجھے ہو رہی ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہیں ہوئی۔“ ارمان نے مسکرا کر کہا۔

”تمہیں جب پہلی بار دیکھا تو میرا دل زور زور سے دھڑکا تھا اور بس یہی صدا بلند ہوئی تھی۔ یہ ہی ہے وہ لڑکی جس کا مجھے انتظار تھا۔“ ارمان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ روشانے بھی مسکرانے لگی اور شرم کے مارے اس کے گال مزید سرخ ہو گئے۔ روشانے کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھا ہے ارمان ساری رات ایسی ہی خوب صورت باتیں کرتا رہا۔ کبھی تو وہ شرمانے لگتی اور کبھی خود پر ناز کرتی۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے وقت کا پتہ ہی نہ چلا اور رات بیت گئی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ عالیہ بیگم کی بات سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔

”گلابرگ میں ایک کینال کی کٹھی۔ تمہارے لیے ایک نیوکار اور پھر تمہیں کینیڈا میں سیٹل کروانا۔ بس یہ سارے مطالبات پورے ہو جائیں تو ٹھیک ہے۔ ساری زندگی روشنائی اسی کٹھی کے کسی کونے میں پڑی رہے گی اور تم اپنی پسند کی کسی لڑکی سے شادی کر کے اپنی لائف کو انجوائے کرنا اور اگر ہمارے یہ مطالبات پورے نہ ہوں تو تم تین لفظ سنا دیں روشنائی کو۔ پھر وہ اپنے گھر اور ہم اپنے گھر۔“ عالیہ بیگم کی بات سن کر ارمان نے ایک بھر پور قبضہ لگایا جس کی گونج ٹی دی لاونچ میں سنائی دی۔

☆.....☆

”زندگی کا یہ وقت کس قدر خوب صورت ہے۔ ارمان کس قدر اچھے ہیں۔ ان کی والدہ محبت نے مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ میں بے حد خوش قسمت ہوں۔“ روشنائی اپنی قسمت پر ناز کرتے ہوئے ارمان کی خوبیوں کے تانے بانے اپنی سوچوں میں بن رہی تھی کہ اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ روشنائی اٹھی، جلدی سے دروازہ کھولا تو سامنے عالیہ بیگم کھڑی تھیں۔

”السلام علیکم امی!“ روشنائی نے نہایت مہذبانہ انداز میں عالیہ بیگم کو سلام کیا۔ عالیہ بیگم نے دھیرے سے سلام کا جواب دیا۔ کمرے میں داخل ہوئیں اور صوفے پر بیٹھ گئیں اور روشنائی کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نہایت ہی بناؤنی انداز سے بات شروع کی۔

”روشنائی دیکھو! اب تم بھی ہمارے گھر کی ایک فرد ہو اگر ہم تم سے کوئی بھی بات چھپائیں تو وہ ٹھیک نہیں ہے۔“ عالیہ بیگم کا لہجہ بے حد بناؤنی تھا مگر وہ تو مہارت رکھتی تھیں۔ بناؤنی انداز میں پر خلوص الفاظ ادا کر کے سامنے والے کو جھانسنہ دینے کا۔

”امی جان! کیا ہوا ہے؟ کھل کر بات کریں۔“ روشنائی جھٹ سے بولی۔

”روشنائی جو بات میں تمہیں بتانے جارہی ہوں، اس کو سننے کے بعد یقیناً تمہیں دکھ ہوگا مگر میرا خدا جانتا ہے اس میں ہماری نیت خراب نہیں تھی اور تم سے بھی درخواست ہے کہ تم ہماری نیت پر شک نہ کرنا۔“ عالیہ بیگم نے لجاجت سے کہا تو روشنائی نے اپنا ہاتھ عالیہ بیگم کے ہاتھ پر دھرنا اور دھیرے سے بولی۔

”امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ سے اور ارمان سے میں کبھی بھی بدگمان نہیں ہو سکتی۔ آپ بے فکر ہو کر بولیے۔“

”روشنائی یہ گھر ہمارا نہیں ہے بلکہ کرائے کا ہے اور مالک مکان ہمیں بہت تنگ کر رہا ہے۔“ عالیہ بیگم نے نہایت معصومانہ انداز میں کہا تو روشنائی ان کی بات سن کر حیرت زدہ رہ گئی۔

”لیکن امی! آپ لوگوں نے تو کہا تھا یہ گھر آپ کا ہے اب آپ.....“ روشنائی کی بات مکمل بھی نہ ہو پائی تھی کہ عالیہ بیگم نے ساری کی ساری بات روشنائی کی ماں پر ڈال دی۔

”اب دیکھو روشنائی جب میں اور ارمان تمہیں دیکھنے تمہارے گھر آئے تھے تم ہمیں بے خد پسند آئیں لیکن تمہاری والدہ کی ڈیمانڈ نے ہمیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ نہیں تو وہ پھر کبھی بھی تمہاری شادی ارمان کے ساتھ نہ کروا تیں۔“ عالیہ بیگم کی یہ دلیل کام کر گئی اور روشنائی کے منہ پر خاموشی کا قفل لگا گئی۔

”تم اپنی والدہ سے بات کرو کہ وہ اسی علاقے میں کوئی گھر ہمیں کرائے پر لے ویں اور اگر تمہیں یہ سب نامناسب لگتا ہے تو پھر ٹھیک سے ہم اپنے پرانے والے گھر میں چلتے ہیں۔“ عالیہ بیگم کی یہ ساری باتیں روشنائی کی حیرانگی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں لیکن اس وقت اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

”اب تم خود سوچو بیٹی! اس گھر میں تم عیش سے

رہتی ہو۔ وہاں اس گھٹیا سے چھوٹے سے علاقے کے چھوٹے سے گھر میں تم زندگی کیسے گزارو گی۔ میرا کیا ہے میں تو آج زندہ ہوں کل نہیں رہوں گی۔ تمہارے ہی فائدے کی بات ہے سوچنا ضرور۔“ عالیہ بیگم نے نہایت ہی محتاط انداز میں اپنی پہلی چال چل دی لیکن اس چال نے روشنانے کے حواس کم کر کے رکھ دیے۔ عالیہ بیگم تو اپنی بات روشنانے کے گوش گزار کر کے چلی گئیں لیکن اسے سوچوں کے گہرے سمندر میں دھکا دے گئیں۔

بالآخر روشنانے نے عائشہ بیگم کو فون کر کے ساری بات بتادی۔ پہلے تو عائشہ بیگم کو بے حد غصہ آیا لیکن محل سے سوچا تو روشنانے کا گھر بسانے کے لیے عالیہ بیگم اور ارمان کی خواہش پر ڈیننس میں گھر خرید کر روشنانے کے نام کر دیا اور روشنانے کے لیے ایک خوش حال زندگی کا گمان کر کے مطمئن ہو گئیں۔

☆.....☆

”ارمان! آج ذرا دفتر سے جلدی گھر آجائیے گا۔ مجھے امی کی طرف جانا ہے۔“ روشنانے کی بات سن کر ارمان غصہ سے لال ہو گیا اور مائی کی ناٹ غصہ سے باندھتے ہوئے بولا۔

”تمہاری ماں نے کون سا کار خرید کر دی ہے جو میں آئے روز تمہیں تمہاری ماں کے گھر لے کر جاؤں۔ بسوں میں دھکے کھا کر دفتر جاتا ہوں۔ تمہارے یہ چونچلے نہیں اٹھا سکتا۔“

ارمان نے غصے سے فائل اٹھائی اور وہاں سے چلا گیا لیکن روشنانے کو ارمان کے اس رویے نے جہاں شدید صدمے سے دوچار کیا وہیں عالیہ بیگم کی بات سن کر وہ چونک کر رہ گئی۔

”ارمان نوکری کر کر کے تھک گیا ہے وہ اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ ہے اگر وہ تیس چالیس لاکھ روپے ارمان کو کاروبار کے لیے دے دیں تو کون سا ان کا خزانہ ختم ہو جائے گا۔“

”اپنی ماں کے گھر جانا ہے تو ابھی جاؤ..... شوق سے جاؤ مگر واپس اسی وقت آنا جب ارمان کے کاروبار کے لیے پیسے اور نیوکار کی جابی تمہارے ہاتھ میں ہو اگر یہ مطالبات پورے نہیں کر سکتے تو ہمیں بھی تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“ عالیہ بیگم کے تنکھے لہجے نے روشنانے کے سارے وجود کو چھنی کر دیا۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھانس کی طرح اٹک گیا۔

”معلوم نہیں یہ لالچ تھا، ہوس تھی یا پھر ضروریات.....“ روشنانے دل ہی دل میں خود سے مخاطب ہوئی لیکن اس کے دل میں تو خاموشی کے قفل بڑے تھے۔ ایسا سکوت چھایا تھا کہ کسی بھی سوال کا کوئی بھی جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ گھر آئی اور عائشہ بیگم کے سامنے آنسوؤں سے بھیگے اس نازنین چہرے نے مطالبات کی نئی لسٹ تھا دی۔

”امی! میں ارمان سے بے حد محبت کرتی ہوں لیکن میں محبت کے نام پر کسی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خود کو سپر ہی نہیں بنانا چاہتی۔“ روشنانے نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیا۔

”ایسے نہیں کہتے اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے ہمارے پاس مجھ سے اور تمہارے ابا سے جہاں تک ہوگا دنیا کی ہر خوشی لا کر تمہارے قدموں میں رکھ دیں گے۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عائشہ بیگم نے روشنانے کو گلے سے لگاتے ہوئے حوصلہ دیا۔ عالیہ بیگم اور ارمان کے ان مطالبات کو بھی پورا کر دیا۔ روشنانے پھر سے اپنی ساس اور شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارنے لگی۔ یہ وقتی خوشی تھی یا زندگی بھر کا دھوکہ روشنانے حقیقت جان کر بھی انجان بن رہی تھی یا پھر یہ ہم مشرقی لڑکیوں کی تربیت میں شامل ہوتا ہے گھر بسانے کے لیے اپنی عزت نفس کو روند ڈالنا۔

نے سراٹھا کر ایک لمحے کے لیے عالیہ بیگم کی طرف دیکھا۔

”امی! اگر یہ سب میرے اختیار میں ہوتا تو میں ضرور اپنے ماں باپ سے فرمائش کرتی۔ وہ میری خوشی کے لیے آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دیتے۔“  
روشانے کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا تھا۔

”اللہ نے اور راستے بھی تو بتائے ہیں۔“ عالیہ بیگم کہاں باتوں میں دبنے والی تھیں۔ اپنے مطلب کی بات کو پورا کرنا اور اپنا کام نکالنا وہ خوب جانتی تھیں۔  
”کیا مطلب ہے امی جان؟“ روشانے نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

”مطلب صاف ہے جو چیز تم نہیں دے سکتی وہ کسی اور سے حاصل کر لینے ہیں۔“

مفاد پرست اور خود غرض لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ عالیہ بیگم کی خود غرضی انتہا کو چھو رہی تھی۔  
”کیا یہ بھی ممکن ہے؟ میری وفاء، میری قربانی، میری دولت کیا ان لوگوں کو کبھی میرا نہیں بنا سکے گی۔“  
وہ حیرت زدہ تھی۔

”میں ان کے لیے محض ایک ذریعہ ہوں۔ خواہشات اور مطالبات کو پورا کرنے کا۔ اگر میں ان کے مطالبات کو پورا نہ کروں تو میں بے کار ہوگئی۔“  
روشانے خاموش بیٹھی تھی سوالوں کی بوچھاڑ تھی مگر جواب کہیں نہیں تھا۔

”روشانے تم ارمان کو دوسری شادی کی تحریر اجازت دے دو۔“ عالیہ بیگم نے حسمی طور پر اپنا فیصلہ سنایا۔ جو روشانے پر ہم کی طرح گرا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔ پھر روشانے نے اپنے خاموشی کے قفل کو توڑا اور لڑکھڑائی زبان کے ساتھ عالیہ بیگم سے ایک سوال پوچھا۔

”کیا ارمان کا بھی یہ ہی فیصلہ ہے؟“ نہ جانے کس قدر ہمت کر کے اس نے یہ سوال پوچھا تھا۔

بہت جدا ہے اوروں سے میرے درد کی کیفیت زخم کا کوئی نشان نہیں اور تکلیف کی کوئی انتہا نہیں پھر زندگی نے ایک اور کروٹ لی اور روشانے کی شادی کو چار سال بیت گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ارمان کا رویہ بھی بدل گیا۔ رات کو دیر سے گھر آنا اس کا معمول بن گیا اگر بھی روشانے دیر سے گھر آنے کی وجہ پوچھ لیتی تو پھر ایک نیا فساد برپا ہو جاتا۔ دولت کی ریل پیل نے جہاں ارمان کا دماغ سا توں آسمان تک پہنچا دیا وہیں بری صحبت نے اسے نشے جیسی بری لت میں مبتلا کر دیا۔ نشے کی حالت میں وہ آکر روشانے کے ہاتھوں اور بازوؤں پر جلتا ہوا سگریٹ لگاتا۔

قسمت نے جہاں اتنے ستم ڈھائے وہیں ایک ستم یہ بھی کر دیا کہ شادی کے چار سال بعد بھی روشانے کو اولاد کی نعمت سے محروم رکھا۔ عالیہ بیگم ٹھٹھے ٹھٹھے طنز کے ایسے نشتر چلاتیں جس سے روشانے کا سارا وجود پھلنی ہو جاتا۔ آج تو عالیہ بیگم نے حد ہی کر دی۔

روشانے کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی۔  
”بھی عالیہ بیگم نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

”ہائے ہائے ہمارے تو نصیب ہی کھوٹے ہیں جو روشانے جیسی منخوس ماری سے پالا پڑ گیا۔

ہائے..... میرا تو اکلوتا بیٹا ہے اور وہ بھی کیا اب ساری زندگی اولاد کی نعمت سے محروم رہے گا۔“ انہوں نے آلسو پو پو محنت سے روشانے کی طرف نفرت سے دیکھا۔

”امی! یہ تو اللہ کے کام ہیں۔“ روشانے حسرت سے بولی۔ تو عالیہ بیگم نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور دم سے گویا ہوئیں۔

”اپنے قصور کو خدا پر نہ ڈالو۔ جب عورت کی عمر زیادہ ہو جائے تو وہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کھو جاتی ہے۔“ عالیہ بیگم نے حقارت سے کہا تو روشانے



”تو کیا اس کا فیصلہ مجھ سے الگ ہوگا۔ وہ تو تم سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بھلا تم خود سوچو کون کم عمر کا لڑکا اپنے سے پانچ سال بڑی عمر کی عورت سے شادی کا خواہش مند ہوگا؟ بس ہمیں تو دولت چاہیے تھی۔ اسی لیے تمہیں بیاہ لائے۔ اب تم ہمیں اولاد نہیں دے سکتی تو ساری زندگی کیوں تمہارے ساتھ بندھا رہے میرا بیٹا۔ اسے بھی جینے کا حق ہے یہ تو میں تھی جس نے اپنے بیٹے کو تم جیسی باندھ لڑکی کے پلو سے باندھ رکھا۔“ عالیہ بیگم نے حلقی سے کہا اور ایسی خود غرضانہ باتیں کیں جنہوں نے روشا نے کے سارے وجود کو چھلنی کر دیا۔

”ٹھیک ہے مجھے آپ کی اس خواہش پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میری ایک شرط ہے۔“ اس نے اپنے اندر ٹوٹی پھوٹی روشا نے کو یکدم ہی گلا گھونٹ کے مار دیا اور انتہائی جرأت سے بولی۔ جس سے عالیہ بیگم بوکھلا ہٹ کا شکار ہو گئیں۔

”ش.....ش..... شرط! کیا شرط ہے تمہاری؟“

انداز سوالیہ تھا۔

”ارمان سے کہہ دیجیے گا مجھے طلاق بھجوا دے۔ آپ بھی ایک ہفتہ کے اندر میرا گھر خالی کر دیجیے گا۔ میں اپنی امی کے گھر جا رہی ہوں اور گاڑی کی چابی میں کمرے سے خود ہی لے لیتی ہوں۔ اب میں اس سے زیادہ سائیڈل کو دودھ نہیں پلا سکتی۔“ روشا نے غصے سے چلا رہی تھی۔ آج پہلی بار اس نے عالیہ بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر کسی ڈر اور خوف کے اپنی بات کو بیان کیا۔ روشا نے کی باتوں نے عالیہ بیگم کو حیرت زدہ کر دیا۔ ان کے اوسان خطا ہو گئے لیکن جب تک وہ اس کیفیت سے باہر نکلیں روشا نے سارا ضروری سامان لے کر وہاں سے جا چکی تھی۔

☆.....☆

میری رسوائی میں غیروں کا کوئی دوش نہیں اس میں شامل ہیں میرے اپنے چاہنے والے

عائشہ بیگم نے روشا نے کو اپنی چوکھٹ پر بے سوچ کیس دیکھا تو وہ حواس باختہ رہ گئیں لیکن روشا نے جو آج ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ندامت یا دکھ کے آثار نہیں تھے۔

”غمزوہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس جہنم سے آزاد ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ روشا نے نہایت جرأت سے کہا۔

”مگر اب عالیہ بیگم اور ارمان کیا چاہتے ہیں؟“

روشا نے کوصوفے پر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے عائشہ بیگم نے اپنے حواس سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”وہ چاہتے ہیں میں میکے سے انہیں اولاد بھی لا دوں۔“ وہ استہزائیہ مسکرائی۔ عائشہ بیگم کو ایک لمحے کے لیے گمان ہوا کہ شاید روشا نے کے دماغ پر ان ساری باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔

”روشا نے ہوش کر دو..... تم کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ عائشہ بیگم نے روشا نے کے کندھے کو تھپتھپایا اور اسے حوصلہ دیتے ہوئے بوکھلا کر پوچھا۔

”امی! ہوش میں تو میں اب آئی ہوں۔“ وہ غصے سے چلائی۔

”کیا مطلب روشا نے؟ کیا ہوا ہے؟ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے بیٹی۔“ عائشہ بیگم کے ہاتھ پاؤں بخ بستہ ہو گئے۔ انہیں کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”سب قصور آپ کا ہے امی! جب کسی کے کردار کے بجائے اس کا گھر، جائیداد اور دولت کے معیار کو رکھا جائے تو بیٹیوں کے گھر کبھی بستے بلکہ ان کے گھر پہلے دن ہی اجڑ جاتے ہیں۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی وہ طلاق یافتہ جیسی زندگی گزارتی ہیں۔“ وہ غصہ سے چلا رہی تھی گویا اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی ہو اور عائشہ بیگم کم صم پیچی بیٹی کی ساری باتیں سن رہی تھیں۔

”یہ دیکھیں میری بازو، یہ سگریٹ کے جلے نشان

یہ نشان میرے بازوؤں پر نہیں لگے بلکہ انہوں نے تو میری روح کو گھٹا ل کر دیا ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی جب کہ عائشہ بیگم اس کی خوب صورت نازک کلاہیوں کو بد نما کرتے ہوئے ان دھبوں کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”ای! میں تو صرف ان کی حرص اور ہوس کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔ ایک سیڑھی کے سوامیری کوئی حیثیت نہ تھی اور اب وہ ارمان کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں محض اولاد کے لیے۔“ اب کے روشانیہ بلک بلک کے رونے لگی۔ عائشہ بیگم نے اسے گلے سے لگالیا اور حوصلہ دیتے ہوئے بولیں۔

”لغت بھیجو ایسے حریص لوگوں پر.....“ انداز حقارت آمیز تھا۔

”ساری غلطی میری تھی۔ میں نے تمہارے لیے امیر خاندان ڈھونڈا ان کی دولت اور رہن سہن کو پرہمتی رہی مگر کردار کو میں نے نظر انداز کر دیا۔ میں نے یہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ یہ سب کچھ دکھلا دہی ہو سکتا ہے۔ سارا تصور میرا ہی ہے۔“ عائشہ بیگم نے اپنا تصور تسلیم کرتے ہوئے نہایت تاسف سے کہا مگر اب کیا ہو سکتا تھا ایک غلط سوچ روشانیہ کی زندگی کو برباد کر چکی تھی۔

☆.....☆

ارمان جب گھر واپس آیا تو عالیہ بیگم نے اسے باری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ غصے سے اپنے اوٹ و حواس کھو بیٹھا اور فوراً ہی روشانیہ کے والد کو نیند آ نہان کر کے روشانیہ کے کردار پر حرف گیری کی۔

پہلے تو وہ بے حد پریشان ہوئے لیکن انہیں اپنی بیٹی روشانیہ پر مکمل بھروسہ اور اعتماد تھا۔ لہذا انہوں نے روشانیہ سے تفصیلاً بات کی۔ روشانیہ نے بھی روروں لے کر اپنے ابو اور بھائی کو گزشتہ چار سالہ زندگی کے نشیب و فراز گئے بارے میں آگاہ کیا۔

ساری حقیقت جان لینے کے بعد انہوں نے

روشانیہ کے والد کے تعلقات ک مشنر صاحب سے تھے۔ انہوں نے ساری بات سننے کے بعد روشانیہ اور اس کے ابو کو حوصلہ دیا اور تھانے میں الف آئی آر درج کر وادی۔ تھانے دار نے شام کے وقت دھاوا بول کر ارمان اور اس کی لالچی ماں عالیہ بیگم کو حوالات میں بند کر دیا۔ قیل اس کے کہ عالیہ بیگم اور ارمان منازت کر واد کے جیل سے رہا ہوتے۔ روشانیہ کے ابو نے کبھی اور گاڑی کو فروخت کر دیا اور خلع کے لیے عدالت سے رجوع کیا۔ تین ماہ میں خلع ہوئی۔

ایک غلط سوچ نے روشانیہ کی زندگی کو جہنم میں دھکیل دیا اگر ہم پہلے مطالبے چوبی ”نہیں“ کا قفل لگا دیں تو زندگیاں برباد ہونے سے بچ جائیں گی۔ روشانیہ کے ابو کو اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے بروقت اپنی زندگی کو بے حد عقلمندی اور جرأت و دلیری سے بچالیا تھا۔ وہ ایک قدم جو اس کے لیے اٹھاتا ہے حد مشکل تھا۔ وہ قدم اس نے اٹھایا اور اپنی زندگی کو مزید برباد ہونے سے بچالیا۔

جہیز ایک لعنت ہے۔ ایک ایسا معاشرتی ناسور ہے جو ہماری بیٹیوں کی عمر کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ سب مل کر فیصلہ کریں اور اپنا اپنا قدم اٹھائیں اور اس معاشرتی ناسور کو جوڑ سے اکھاڑنے میں اہم کردار ادا کریں۔

☆.....☆



## حسین بن علی کا سوتیلی

ایک ہوا تھا۔ فائزہ کا تو رورو کر برا حال تھا۔ I.C.U کے باہر چکر کاٹ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے آکر خوشی کی نوید سنائی۔ ”اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔ کچھ دواؤں کے زیر اثر ہیں۔ کچھ گھنٹوں میں ہوش آجائے گا۔“ وہ کہہ کر چلے گئے۔ وہ مسلسل چکر کاٹ رہی تھی۔ جب نرس نے آکر فائزہ کو پکارا تھا۔ ”آپ میں سے فائزہ کون ہیں۔“ نرس نے تسلیم بیگم اور فائزہ سے پوچھا۔

”جی میں ہوں کہیں۔“ فائزہ نے بتایا۔

”آپ کے فادر آپ کو ملارہے ہیں۔“ وہ کہہ کر چلی گئی۔ وہ جو بھی کمرے میں داخل ہوئی اپنے پیارے بابا کو مشینوں میں جکڑا پایا۔ مشینوں کی وجہ سے بابا جانی کو بات کرنے میں مسئلہ ہو رہا تھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر رو دی۔ بابا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ”بابا! آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں۔ ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہمارا دل نہیں لگتا اپنے بابا کے بغیر۔“ فائزہ نے روتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

”حادثہ جلدی چل حیدر آباد میں میسنگ رکھی ہے بھائی جان نے ارجنٹ نکلے کو کہا ہے اور تو اب تک موبائل پر لگا ہے۔“ علی کو حادثہ پر بہت غصہ آیا تھا جو کب سے موبائل پر باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

”ہاں یار بھائی جان کا مجھے بھی میسج آیا تھا۔“ حادثہ نے بتایا تو علی کا بارہ مزید ہلایا ہوا۔

”پھر بھی اتنی لا پرواہی برت رہا ہے۔ جانتا بھی ہے رستہ

”فائزہ اٹھ جاؤ بیٹا بہت دیر ہو گئی ہے دیکھو آٹھ بج گئے ہیں۔ کالج ٹائم نکل جانے کا پھر بعد میں نہ کہنا مجھے اٹھایا نہیں۔“ تسلیم بیگم اپنی لاڈلی کو جگاری تھیں لیکن فائزہ بھی اپنے نام کی ایک تھی نرس سے مس نہ ہوئی۔ جانتی تھی وہ نہیں اٹھی تو بابا آئیں گے جگانے اور یہی تو وہ چاہتی تھی۔ بابا کا وہ بالوں میں ہاتھ پھیرنا اسے بہت پسند تھا۔ نرم و ملائم لمبے لمبے جگنا اسے بہت پسند تھا۔

تسلیم بیگم تھک گئیں تو مجبوراً شفیق حسین کو بھیجا پڑا۔

”فائزہ بیٹی اٹھ جائیے دیکھیے آپ کے کالج کی وین آنے والی ہے۔“ شفیق حسین حسب معمول بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے اور پیار سے جگا رہے تھے۔

فائزہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اٹھنا پڑا تھا۔ اٹھ کر بابا کے گلے میں بائیں ڈال کر صبح بخیر کہا اور جلدی سے ہاتھ لینے چل دی۔

☆.....☆

فائزہ کے والد شفیق حسین اپنے والدین کی ایک ہی اولاد تھے۔ شفیق حسین گورنمنٹ کالج میں لیکچرار تھے۔ ان کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی فائزہ اور دو چھوٹے بھائی اذہان اور ریحان جو جڑواں تھے اور ٹانگھ کے اسٹوڈنٹ تھے۔ فائزہ بھی F.S.C کر رہی تھی۔ کیونکہ فائزہ اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ اسی لیے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ سب کی اس میں جان تھی۔ وہ بابا اور بھائیوں کا مان ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔

☆.....☆

بابا جانی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ انہیں دل



چھیڑا تھا۔

”حارث بھائی آپ نام بھی لے سکتے ہیں۔“ فائزہ نے کہا۔

”OK بابا آج سے نام ہی لیں گے۔“ حارث نے کہا۔ ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ علی نے روم میں انٹری کی۔ ”السلام علیکم!“ علی نے سلام کیا اور شفیق حسین سے مصافحہ کیا۔ وہ حارث کے برابر دالی چیئر پر بیٹھ گئے۔ فائزہ کچھ عجیب سی انجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ حارث نے فائزہ کی انجھن جان لی تھی۔ کچھ سوچ کر فائزہ کا تعارف کر دیا۔ جو اپنے باپ سے لگی بیٹھی تھی۔

”فائزہ یہ میرے دوست اور ٹرسٹ کے آڑ ہیں علی رضا اور یہ میری چھوٹی خالہ فائزہ۔“ حارث نے تعارف کرا کر ہوئے باقی تفصیل بتائی۔

علی نے ایک نظر اس لڑکی پر ڈالی جو نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ روٹی روٹی آنکھیں، بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ گوری رنگت رونے کی وجہ سے لال ہو رہی تھی۔ اس کی چھوٹی سی ناک کے نیچے پنک لب گلاب لگ رہے تھے۔ جو بھی اسے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ وہ بھی ہی بہت خوب صورت تھی۔ علی کیسے ندول ہارتا۔ کم تو علی بھی نہ تھا۔ بادامی آنکھیں، گولڈن بال پر گولڈن ہی شیو، اس پر کھڑے نقوش، یار یک پنک لب قد بھی ایسا تھا کہ ہر کوئی لڑکی اس پر فدا ہو جاتی۔ اس کی پرسنائی متاثر کن تھی۔ اس کی گوری رنگت اسے اور حسین بنا رہی تھی۔ بس ایک پل ہی لگا تھا اسے فیصلہ کرنے میں۔ فائزہ نے نظریں جو بھی اٹھائیں علی نے بھی اس پل دیکھا تھا۔ وہ کچھ پر زل سی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

علی برنس ٹائیکون تھا۔ علی کے والد رحمت خان زادہ کا! برنس تھا۔ علی کی محنت اور لگن نے ان کے برنس میں چار چاند لگا دیے تھے۔ علی اپنے برنس کے علاوہ بھی لوگوں کی مالی مدد کرتا تھا۔ اس نے مل کر اپنی خان زادہ ویلفیئر بنائی جس اہم کردار ارشد بھائی اور علی کا تھا۔ علی کے دو بھائی تھے جو بڑے تھے اور شاد شدہ تھے۔ ان کی ایک ہی بہن تھی وہ اپنے شوہر کے ساتھ

خراب ہے۔ روڈ بن رہا ہے نوری آباد کا۔ پھر ہمیں پہنچنے میں بھی چار گھنٹے لگیں گے۔“ علی نے غصے میں کہا تو حارث کو فون بند کرنا ہی پڑا۔

علی کی تو ارشد بھائی میں جان تھی اور ارشد بھائی جان نے بلایا تھا علی کیسے نہ جلدی کرتا۔ ایسا نہ تھا کہ ارشد بھائی ان کے سکے بھائی تھے۔ پہلی انہیں بہت چاہتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے ایک ٹرسٹ بنایا تھا جو سختی لوگوں کی مدد کرتا تھا، ٹرسٹ کی بنیاد علی اور ارشد بھائی نے رکھی تھی۔ وہ اب اس ٹرسٹ کو بہت اچھے طریقے سے سنبھال رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ٹرسٹ میں لوگوں کا اضافہ ہوتا گیا۔

”چلوں تیار ہوں۔“ حارث نے کہا۔ وہ دونوں حیدر آباد روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

بابا کے ایک کی خبر سن کر سب ان کی عیادت کے لیے آ رہے تھے۔ حارث جو بابا کے رشتے میں نواسے تھے وہ بھی آئے تھے۔ چونکہ وہ حیدر آباد میں ہی تھے تو یہ آسانی سے آ گئے تھے۔ حارث کے موبائل پر مسلسل فون ہو رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

”ہاں بھولوٹی؟“

”نہیں تم یہاں آ جاؤ، ادھر سے ہی پک کر لیتا۔“ حارث نے کہا کہ فون بند کر دیا تھا۔ اب وہ باقاعدہ فائزہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”ہاں تو فائزہ خالہ آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔“ حارث نے خالہ پر زور دیا تھا۔ جانتا تھا وہ چڑ جائے گی اور حارث یہ ہی چاہتا تھا کیونکہ اس کی سوچی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں۔ وہ کتنی دیر سے روٹی رہی ہے۔ اس کا موڈ بدلنے کو چھیڑ دیا تھا۔ جس پر حسب توقع فائزہ نے کہا تھا۔ ”حارث بھائی آپ مجھے خالہ تو نہ کہیں میں آپ سے چھوٹی ہوں۔“ اس نے ہمیشہ کا کہا جملہ پیت کیا۔

حارث کے بڑے ہونے کی وجہ سے وہ اسے بھائی کہا کرتی تھی۔ نام لینا اسے بالکل پسند نہ تھا۔ ”ارے خالہ ہو تو کہوں گا بھی ناں!“ اس نے جان کے

بیرون ملک میں سیٹل تھی۔ علی کی والدہ جاہتی تھیں۔ علی اب شادی کر لے مگر اسے جیسی لڑکی کی تلاش تھی جو تلاش فائزہ کو دیکھ کر ختم ہوگئی تھی مگر وہ چاہتا تھا پہلے فائزہ کو بتائے پھر ای کو۔

☆.....☆

وہ آج اپنی بیسٹ فرینڈ کی برتھ ڈے پر جارہی تھی جو اس کی بچپن کی دوست تھی۔ واپسی پر وہ لیٹ ہوگئی مگر اس نے بابا کو بتا دیا تھا۔ ورنہ بابا پریشان ہو جاتے۔ ابھی وہ بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ آسمان پر اچانک چھا جانے والے بادل اس کی سمجھ سے باہر تھے اسے بارش سے ڈر لگتا تھا۔ جب کبھی بجلی کرتی تو وہ روم سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی۔ وہ جلدی سے گھر پہنچ جانا چاہتی تھی مگر نہ کوئی بس آ رہی تھی نہ رکشہ نکلی۔ وہ بار بار آسمان کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو یا خدا ابھی بارش نہیں کرنا۔ موسم کے خطرناک تیز سے اسے خوف آ رہا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھا جہاں کالے بادل سورج کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ بجلی کی زوردار آواز سے بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ بس اسٹاپ پر کسی سواری کی منتظر تھی مگر نہ جانے کیوں کوئی راضی نہ تھا چلنے کو۔ سب کو موسم کے تیز سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ دل میں بس یہی دعا مانگ رہی تھی کہ کسی طرح گھر پہنچ جائے اور اس کی دعا قبول ہوگئی تھی۔ جب اچانک فائزہ کے عین سامنے لینڈ کرؤزر کی تھی۔ تبھی اچھل کر پیچھے ہوئی تھی۔ کار سے باہر آتھا شخص کوئی انجان تو نہ تھا۔

”فائزہ.....“ علی نے پکارا تھا۔ اسے حیرانی ہوئی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ تو علی نے کہا۔ ”لگتا ہے آپ نے پہچانا نہیں۔ میں علی رضا ہوں۔ حادثہ کا دوست۔“ علی نے یاد دلایا۔

”جی جانتی ہوں۔“ فائزہ نے کہا اور سائیڈ پر ہوگئی۔

”دیکھیں فائزہ بارش تیز ہو رہی ہے آپ کا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے آپ کار میں بیٹھ جائیں میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ علی نے کہا۔

”میں میں خود چلی جاؤں گی آپ تکلیف نہ کریں۔“ فائزہ نے کہا۔ ایسے کسی پر کیسے اعتبار کر سکتی تھی۔ بے شک وہ

حادثہ بھائی کا دوست تھا۔ اس کے لیے تو وہ اجنبی ہی تھا۔ دیکھنے میں تو شریف گھر کا لگتا تھا۔ فائزہ نے دل میں سوچا تھا۔

”فائزہ آپ مجھ پر بھروسہ کریں میں ایسا ویسا لڑکا نہیں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔“ فائزہ نے نہ چاہتے ہوئے گاڑی کی طرف قدم بڑھائے بنا کچھ کہے کار میں بیٹھ گئی تھی۔ علی نے بھی جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ وہ پوری بھیگ چکی تھی۔ بال بھی چہرے پر چپک رہے تھے بالوں سے گرتے قطرے اس کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ ننھی لکھو کرنی پر پنک لیمبر اینڈر ہی تھی۔ صاف شفاف چہرہ اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ علی کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔ علی کا دل تو چاہ رہا تھا دیکھے جائے۔ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا نہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے ریڈیو آن کیا۔ جہاں جو گانا چل رہا تھا وہ علی کے دل کی عکاسی کر رہا تھا۔

محبت برساتا تو سداں آیا ہے

تیرے اودھمیرے ملنے کا موسم آیا ہے

مجھ کو چھپا رکھے میں نے سینے سے لگانا ہے

پیار میں تیرے حد سے گزر جانا ہے

انتاپیار کی پہلی بار آئی ہے

وہ کنفیوژن ہو رہی تھی۔ علی نے اس کی کنفیوژن کو بھانپ لیا تھا۔ اسے ریڈیو off کرنا پڑا۔ فائزہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ گھر آنے پر وہ جلدی سے گیٹ کھول کر باہر نکلی تھی اور فارمیٹی نہائی تھی۔

”بھینکس۔“ فائزہ نے کیا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہو تو ہاں بھی میں یہ ہی کرتا۔ پھر آپ تو میرے دل کی ملکہ ہیں۔“ آخری بات وہ اپنے دل میں ہی کہہ پایا۔

”گھر آئیے بابا سے مل کر جائیے گا وہ بہت یاد کرتے ہیں آپ کو۔“ فائزہ نے دل سے کہا تھا۔

”میں میں پھر کبھی مل لوں گا۔“ علی نے کہا۔

”چلے جائیے گا بارش بھی تیز ہو رہی ہے۔ رک جائیں

گا۔“ فائزہ کو نہ جانے کیا ہوا تھا۔ ورنہ وہ کسی کو اتنا فورس نہیں کرتی تھی۔ علی کی شرافت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اندر آگیا، فائزہ کا کہنا کیسے مال سکتا تھا۔

☆.....☆

وہ لپٹے لپٹے تھک چکی تھی لیکن نیند آنکھوں سے روٹھ گئی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ علی کو سوچ رہی تھی جیسے ہی آنکھیں بند کرتی علی کا مسکراتا چہرہ پوری آب و تاب سے آنکھوں کی پتلیوں پر سا جاتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ علی کو سوچے جا رہی تھی یا خدا یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی وہ وہیں تو بیٹھا تھا اس نے صوفے کو دیکھ کر سوچا تھا اور آگے چل دی اچانک ہی اس کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی تھی۔ وہ کچھ اور نہیں والٹ ہی تو تھا۔ جس کھولتے ہی اسے علی کی مسکراتی فوٹو نظر آئی۔ جسے دیکھ کر فائزہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی، علی کی آنکھیں مسکرانے سے چھوٹی سی ہو گئی تھیں۔ اس کے والٹ میں موجود پاسپورٹ تھا اور علی کا کارڈ بھی تھا۔ جس میں اس کا نمبر لکھا تھا۔

اس نے سوچا علی کو کال کر کہہ انفارم کر دے والٹ کا۔ مگر رات گہری ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً سوچکا ہوگا۔ اپنی ہی سوچوں کو جھٹک کر وہ علی کی تصویر پر لیٹ گئی۔ اسے نہ جانے کیوں علی اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہو رہا تھا۔

☆.....☆

سورج اپنی آب و تاب سے روشن تھا کھڑکی سے آتی روشنی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹ بدلتی مگر دھوپ کی تپش اسے سونے نہ دیتی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے آنکھیں کھول دی تھیں پھر جلدی سے واش روم کا رخ کیا۔ فریش ہو کر وہ باہر آئی تو ڈیرنگ ٹیبل پر پڑا والٹ اسے بہت کچھ یاد کروا گیا۔ اس نے اپنی بے خودی پر اپنے سر پر چپٹ لگائی۔ پھر والٹ سے کارڈ نکالا اور علی کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک ہی بیل پر کال اٹھائی گئی۔

”السلام وعلیکم“ علی نے سلام کیا۔ فائزہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ کچھ لمحے تو بولا ہی نہ گیا تھا۔ پھر ہمت جمع کی اور جواب دیا۔

”علیکم السلام!“ فائزہ نے آہستہ سے جواب دیا تھا۔ ”جی کون؟“ علی نے آواز پہچان کر بھی بیگانگی اپنائی ورنہ دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔

”میں..... میں۔“ فائزہ کی آواز گلے میں بھس گئی دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ اپنے آپ کو بے شکل سنبھال پائی تھی۔ ”میں فائزہ شفیق ہوں۔“ اس نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

”اوہ جی فرمائیے کیسے یاد کیا اس ناچیز کو؟“ علی نے مودبانہ کہا۔

”ایکپلٹی وہ آپ کا والٹ یہاں رہ گیا۔ I mean گر گیا تھا۔ بس اس لیے ہی۔“ فائزہ نے اپنی خفت مٹانے کی وجہ پیش کی۔

”اوہ واقعی مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ ہم بھی کہیں ہمارے نصیب اتنے اچھے کہاں جو آپ ہمیں یاد کریں۔“ علی نے طنزیہ کہا کیونکہ کل آدھا گھنٹہ خاموشی کی نذر ہوا تھا۔ علی کو اس بات کا بہت دکھ تھا۔ وہ شکوہ بھی کر گیا۔

”جی کیا مطلب آپ کا میں سمجھتی نہیں۔“ فائزہ جان کر بھی انجان بنی۔

”ہاں تو واقعی آپ نہ سمجھ ہیں کچھ نہیں سمجھتی بہت معصوم ہی تو ہیں۔“ علی نے شرارت سے کہا۔ بات بے بات تنگ کر رہا تھا۔ چاہتا تھا فائزہ باتیں کرتی رہے۔ وہ اس کی آواز ہی سنتا رہے۔ پر فائزہ کنفیوژ ہو رہی تھی کوئی بات نہ بن پارہی تھی تو جلدی سے کہا۔

”آپ کل آکر اپنا والٹ لے جائیے گا۔“

”کل کیوں آج کیوں نہیں۔“ علی نے پھر شرارت کی۔

”اف، آپ آج ہی لے جائیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ نہیں چاہتی تھی علی کی باتوں کا جواب دینا۔ جانتی تھی اس کی نظروں کو کب بھولی تھی کیسے اس کا طواف کر رہی تھیں جو اسے رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔

☆.....☆

”فائزہ میں پڑوس میں جا رہی ہوں۔ آپ کھانا بنا لیتا۔“ تسلیم بیگم نے کہا وہ کسی کی عیادت کے لیے جا رہی تھیں۔

”جی امی! آپ بے فکر رہیں میں بنالوں گی۔“ فائزہ کے دماغ سے علی کے والٹ کی بات نکل گئی تھی۔ ورنہ تسلیم بیگم کو روک لیتی۔ ابھی وہ گیٹ lock کر کے آئی ہی تھی کہ گیٹ پر دستک ہوئی تو اس نے سوچا امی ہوں گی کچھ بھول گئی ہوں گی۔ وہ لینے آئی ہوں گی۔ بغیر پوچھے ہی وہ گیٹ کھول چکی تھی اور سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ حیران ہو گئی تھی اور اپنی بے وقوفی پر ملامت کر رہی تھی۔ علی کا مسکراتا چہرہ اسے اپنی بے وقوفی پر ملامت کرا گیا۔ جلدی سے سائیڈ پر ہوئی اسے اندر آنے کو جگہ دی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اندر بلایا۔ کیونکہ بابا کا حکم تھا مہمان کو دروازے سے نہیں لوٹایا جاتا۔ علی کو بیٹھنے کا کہہ کر وہ خود کچن میں چلی آئی اور چائے کا پانی رکھا اور پھر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ میز بانی بھی تو کرسی تھی۔

”لگتا ہے گھر پر کوئی نہیں ہے؟“ مسلسل خاموشی سے علی نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

”جی امی پڑوس میں گئی ہیں اور بابا کالج، اذہان اور ریحان یونی گئے ہیں۔“ فائزہ نے تفصیل سے بتایا۔

”آپ کیا کرتی ہیں؟“ علی نے پوچھا۔

”میں نے ماسٹر کیا ہے اب فری ہوں۔“

”پھر کوئی جاب نہیں کی؟“ علی نے بات بڑھائی۔

”نہیں بس امی اکیلی ہوتی ہیں تو ان کا ہاتھ بنا دیتی ہوں۔“ اس نے کہا اور ساتھ ہی ایکسکسپوز کیا اور جلدی سے اپنے روم سے والٹ اٹھایا اور کچن سے دو کپ چائے لیے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ علی نے اخبار سے نظریں ہٹائیں اور سائیڈ پر اخبار رکھا۔

”ارے اس کی کیوں تکلیف کی میں تو بس والٹ لینے آیا تھا۔“ علی کو شرمندگی ہوئی تھی۔

”ارے آپ ہمارے مہمان ہیں تکلیف کیسی اور ہمارے یہاں مہمان کو خالی پیٹ نہیں لوٹایا جاتا۔ اس لیے کھانا بھی کھا کر جائے گا۔“ فائزہ نے کہا۔

”نہیں میں اب نکلوں گا۔ کھانا پھر کبھی کھاؤں گا۔ ویسے چائے کافی اچھی بنائی ہے۔“ علی نے سب لیتے ہوئے کہا۔

”بھینکس یہ لیجیے۔“ فائزہ نے والٹ یاد آنے پر اسے

پیش کیا۔ جسے علی نے تھا تا تو فائزہ کا ہاتھ علی کے ہاتھ سے مس ہوا۔ وہ کرٹ کھا کر پیچھے کو ہوتی تھی۔ بے اختیار دل کی دھڑکن کے شور نے اسے پرل سا کر دیا تھا۔ وہ پینک کپڑوں میں سرخ پڑتی علی کے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ علی سے کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”فائزہ....“ علی نے گھمبیر لہجے میں پکارا۔

”جی۔“ وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

”ایک بات کہوں کیا آپ یقین کریں گی۔“ علی نے بے اختیار کھڑا لٹھا۔

”جی کہیں میں سن رہی ہوں۔“ وہ نظریں نیچے کے بیٹھی تھی نظریں اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ علی کی آنکھوں میں لکھی تحریر وہ پڑھ چکی تھی۔

”مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے کب کیسے میں نہیں جانتا۔ یوں تو بہت سولہ سے واسطہ پڑا لیکن ابھی کسی کے ساتھ کی تمنا نہیں کی۔ پہلی بار آپ کو دیکھا تو دل نے دھڑکنا ہی چھوڑ دیا بے اختیار کہہ گیا یہی وہ لڑکی ہے جسے میں تلاش کر رہا تھا۔ میں بس اتنا جانتا تھا اب آپ کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔ میرا خدا جانتا ہے میں ایک لمحہ بھی آپ کو نہیں بھولا۔ ہر پل دل نے لپکا رہے ہر جگہ آپ کو میری نظروں نے تلاش ہے پلیز فائزہ کچھ تو بولو۔“ علی نے بے چینی سے کہا۔

فائزہ حیران اور پریشان نظریں نیچے کیے ہوئے بیٹھی تھی سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کیا جواب دے وہ خود اپنے دل سے پوچھ رہی تھی۔

”پلیز فائزہ بولو۔“ علی نے بے چینی سے کہا۔

”علی مجھے نہیں معلوم میں کیا جواب دوں مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔“

”جودل میں ہے وہ ہی جواب دو۔“ علی نے صاف کہا۔

”علی آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں میں نہیں جانتی بس اتنا جانتی ہوں جو میرے بابا فیصلہ کریں گے وہ قبول ہوگا۔“ وہ نظریں نیچے جھکائے کہہ گئی۔

”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں میرے ساتھ پر؟“ علی نے پھر پوچھا۔

”نہیں۔“ علی کے دل نے لذی ذالنا شروع کر دیا۔ وہ جلد ہی رشتہ بھیجنے کا کہہ کر گھر روانہ ہو گیا۔

☆.....☆

مسلل ڈور تیل نے فائزہ کو اپنی سوچوں سے نکالا تھا۔ وہ جلدی سے ڈور کی طرف لپکی۔ جانی بھی تسلیم بیگم ہوں گی۔ تسلیم بیگم کے ساتھ حارث بھی موجود تھا۔ وہ حیران بھی حارث کی آمد پر اس نے کچن کا رخ کیا۔ کچھ دیر بعد ہی ٹرائل میں لوازمات سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو حارث کے آنے کا سبب معلوم ہوا ان کی بہن کی شادی بھی دعوت دینے آئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گھر کو روانہ ہوئے تھے۔

☆.....☆

”علی بیٹا ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ رفعت بیگم نے کہا۔ علی اپنے لیپ ٹاپ پر ای میل چیک کر رہا تھا۔ ”جی امی نہیں۔ آپ اوپر کیوں آئیں آپ کے پیروں میں دروہے نا مجھے بلالیا ہوتا۔“

”آپ کے پاس وقت کہاں۔“ رفعت بیگم نے شکوہ کیا۔ ”ارے امی ایسے تو نہیں کہیں۔“ وہ لیپ ٹاپ بند کر کے سیدھے ہو کر بیٹھا اور امی کے ہاتھ تھام لیے۔

”آپ کہیں کیا ضروری بات کرنی ہے۔“ علی نے پوچھا۔ ”میں چاہتی ہوں اب آپ بھی شادی کر لیں 28 سال کے ہو گئے ہو۔“ رفعت بیگم نے آج پھر وہی بات کر ڈالی تھی جس سے علی دور بھاگتا تھا۔

”تو کر لیں گے اور کوئی حکم۔“ خلاف معمول علی کے جواب نے رفعت بیگم کو حیران کیا تھا۔ ”نہیں بس یہی مان لو۔“ رفعت بیگم نے کہا۔

”کوئی پسند ہے آپ کو۔“ رفعت بیگم نے پوچھا۔ ”جی امی حارث کی خالہ ہے رشتے میں۔ میں ملو ادوں گا۔“ آج شادی میں اگر آئی تو آپ بھی دیکھ لیں پھر چلی جائے گا۔ ان کے گھر۔“ علی نے صاف بات کہی تھی۔ جس پر رفعت بیگم کو اعتراض نہیں تھا۔

☆.....☆

سی گرین اور پریل کنٹراس کی فرائک پرسفید نگینے کا کام

ہوا تھا۔ پریل ہی کمر کے چوڑی دار پاجامہ میں سفید ہی نگینے والے پیمس پرسفید ہی جیولری میں جھلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ لمبے گھنے براؤن بالوں کو کھلا چھوڑا تھا۔ پوری محفل کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ایک خاتون نے تو فائزہ کی ماما سے پوچھ لیا تھا۔ ”یہ آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔ کہیں نسبت طے تو نہیں۔ مجھے رشتے کی تلاش ہے اپنے بیٹے کے لیے۔“ فائزہ کی کچھ عجیب کیفیت ہو رہی تھی کچھ اٹھ کر سائیڈ پر چلی گئی۔

ایک کزن کے زور دینے پر وہ اسٹیج پر آئی تھی۔ دلہن سے ملنے کے فوراً بعد ہی وہ اسٹیج سے نیچا تر رہی تھی کہ فرائک پیروں میں لگی اور وہ گر جاتی کہ کسی کے مضبوط بازوؤں میں خود کھینچ لیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”فائزہ آنکھیں کھول لے آپ ٹھیک تو ہیں۔“ آنکھیں کھولتے ہی علی کا چہرہ نظر آیا تھا اور ایک جھٹکے سے وہ پیچھے ہوئی۔

”کیا آپ ٹھیک ہیں؟“ علی نے فکر مندانہ لہجے سے پوچھا۔ علی کی نظریں اس کے پشت پر بکھرے بالوں میں الجھ گئیں۔

”اف خدا یہ لڑکی تو حسن کا پیکر ہے۔“ علی نے دل میں سوچا۔

☆.....☆

سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوئے جاری تھی۔ ابھی تک کپڑے بھی چیتچ نہیں کئے تھے وہی واقعہ آنکھوں میں آئے جا رہا تھا۔ بار بار اپنے جسم کو دیکھتی جیسے علی کی ہانپوں میں ہوا اب تک۔ ”یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میں کیوں اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“ اچانک ہی دل سے آواز آئی تھی علی سے محبت ہو گئی ہے۔ نہیں نہیں ایسا ہو سکتا۔ اس نے خود سے انکار کیا۔ ”ایسا ہی ہے۔ تمہیں علی سے محبت ہو گئی ہے۔“ وہ اسے معلوم آج ہوا تھا۔

☆.....☆

وہ نماز سے فارغ ہوئی تو ڈرائنگ روم سے کچھ آوازوں نے اپنی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے وہی



خاتون بیٹھی تھیں جسے وہ شادی میں دیکھ چکی تھی۔ اندرا کر اس نے سلام کیا تھا۔ ان خاتون نے بہت پیار سے گلے لگایا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہ پائی تو کچن کا رخ کیا۔ کچن میں بھی آواز بہ خوبی سنائی دے رہی تھی۔

”بہن ہمیں جلدی مشورہ کر کے بتا دینا۔“ ان خاتون کی آواز آئی۔

”جی فائزہ کے ابو آ جائیں تو جواب دے دیں گے۔“

وہ سمجھ ہی نہ پا رہی تھی آخر کس بات کا مشورہ۔ فائزہ کا نازک دل عجیب کشش میں تھا۔ وہ ڈرائی لے اندر آئی۔

”آؤ بیٹھو یہاں ہمارے پاس۔“ ان خاتون نے اپنے برابر میں بٹھایا۔ باتوں کے دوران ان ہسمانوں کے آنے کا سبب معلوم ہوا تھا۔ جسے وہ سوچ کے ہی پریشان ہو گئی تھی۔

☆.....☆

”یہ کیسا امتحان ہے میرے خدا۔ میں کیسے روکوں اس رشتے کو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے علی کو کال ملائی مگر دوسری طرف کال نہ اٹھائی گئی۔ جس سے ابو بھی پریشان ہو گئی تھی۔ علی یہ کیسی راہ پر چلا دیا ہے مجھے۔ جب منزل قریب تھی تو کیوں ساتھ چھوڑ گئے۔ علی کہاں ہیں آپ پلینز کچھ کرئیے۔“ وہ خود سے ہم کلام تھی۔ وہ بیڑہ پڑھ گئی تھی۔ ”کیسی محبت ہے آپ کی۔ محبت کا یقین دلا کر پھر کیوں ساتھ نہیں آج۔ آج تک نہ کال نہ میسج کچھ بھی تو نہیں کیا۔ ایسے کوئی کرتا ہے بھلا خبر تک نہیں میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔“ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ”جب اسے ہی احساس نہیں تو میں کیوں اپنی محبت کی توہین کروں۔ کیوں بھیک مانگوں۔“ آخر اُمی نے پوچھا تھا رشتے کہ متعلق جسے اس نے جیسے آپ کی مرضی ہو۔ تسلیم بیگم تو اپنی لاڈلی پر نہال ہوئے جارہی تھیں۔

☆.....☆

وہ آج سرخ جوڑے میں ہاتھوں پر کسی کے نام کی مہندی لگائے بیچ بیٹھی اپنے مجازی خدا کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ دروازے کی آواز سے وہ اپنے اندر بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ شادی تو کر لی تھی مگر علی کو دل سے نہ نکالا تھا۔ کیسے بھول جاتی۔ پہلی مرتبہ علی کو ہی سوچا تھا لیکن آج سب الٹ ہوا تھا۔

بیڑہ روہ بیٹھا تھا جسے اس نے ایک جھلک تک نہ دیکھا تھا۔ بہت کہا تھا سب نے مگر نہیں دیکھا تھا۔ گھونگھٹ میں اسے اب بھی کچھ نظر نہ آیا تھا۔ گھبریر آواز میں سلام کیا مگر جواب نہ پا کر اس نے گھونگھٹ اٹھایا تھا۔

فائزہ چٹٹی چٹٹی آنکھوں سے گھور رہی تھی اسے۔

”بس بھئی اب اتنا بھی پیارا نہیں ہوں جو تم نظریں ہی نہیں ہٹا رہی ہو۔“ علی نے شرارت سے کہا۔ وہ گولڈن شیر وانی میں بہت ہی چارمنگ لگ رہا تھا۔

”آپ.....“ وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

”جی میں۔ کیوں یقین نہیں آ رہا آپ کو؟“ علی نے کہا۔

”مگر آپ تو روپوش ہو گئے تھے ایک بار بھی خبر نہیں لی کال تو دو درمیج تک نہیں کیا۔ کیسے یقین آئے آپ ہو۔“ اس نے بھی شکوہ کیا۔

”تو جان علی جان لو میں ایسا نہیں مگر میں بہت مصروف تھا مگر جانتی ہوں تا میری لف روٹھن۔“

”جانو! آپ کے کال میسج کا مطلب یہ تو نہیں ناں میں بھول گیا۔ جانو! آپ کے سارے شکوہ شکایت سب ختم کر دوں گا۔ پھر بھی شکایت نہیں ہوگی۔“ علی نے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”مگر میری شادی تو جو خدا علی سے ہوئی تھی۔“ فائزہ نے ایک بار پھر کہا۔

”اف حد کرتی ہو پاگل لڑکی میں ہی ہوں رضا علی اور علی رضا بھی۔ اب ختم کرو اس ٹاپک کو اور یہ لو.....“ اس نے مہر مٹی کی کیس فائزہ کو دکھایا تھا۔ جس میں نازک سا بریسلٹ تھا۔ علی نے خود پہناتے ہوئے کہا۔

”کیسا لگا۔“

”بہت خوب صورت آپ کی طرح۔“ فائزہ نے اظہار کیا تھا۔

”باہا با۔“ علی کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا اور دھیرے سے کان میں کہا۔

”محبت یوں بھی ہوتی ہے۔“

☆.....☆



شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلے وارناول

# زندگی بہرہ و صبر و شہر

ساری ہی تیاری ہو گئی تھی۔ ایک مہینہ بھی لگتا تھا پر لگاتے اُڑ گئے ہوں آریکہ کی دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ صرف پندرہ دن تھے اور اسے مایوں بیٹھ جانا تھا۔ ایسہ نے جلدی ہی اتنی چائی تھی جو ناہید اور



منیر احمد کو بھی مانتے ہی بنی تھی۔

”آپی! میں نیچے جا رہی ہوں آپ سالن کو چیک کر لیجئے گا۔“ ثمرہ نے کہا۔ نیچے حرا سے بلا رہی تھی جنین کے روم کی سینک ہو رہی تھی کیونکہ آریکہ کافرینچر پہلے ہی پہنچا دیا گیا تھا۔  
ناہید اور منیر احمد رشتے داروں میں شادی کا رڈ بانٹنے گئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی گھر میں تھیں۔  
”تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ ذرا سخت زدہ لہجے میں بولی تھی۔  
”آپی! میں اس لیے بھی جا رہی ہوں آپ کے روم کی سینک تو دیکھوں جنین بھائی نے کس طرح سیٹ کیا ہے سب کچھ۔“ اسے یہی دیکھنے کا جیس تھا۔  
”تمہارے دیکھنے سے وہ کوئی سینک رول نہیں دیں گے۔“ اسے ویسے ہی جنین کی دل جلانے والی

## فصل نمبر 15



حکمتوں پر غصہ تھا۔

”آپ جا کے بدل دیجئے گا جیسا دل کرے۔“

”فضول بحث ہے تم جاؤ جا کے جلدی آؤ مجھے تنہائی میں وحشت ہوتی ہے۔“ وہ بے زاری سے ہاتھ اٹھا

کے بولی۔

شرہ کے نکلنے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تھا اور اپنے کمرے میں آگئی تھی اسے حنین کی کسی بھی چیز نے دل کو خوش نہیں دی تھی۔ اپنی شادی کی تیاری بھی وہ زبردستی ہی کر رہی تھی، ورنہ وہ اسے تو شروع دن سے دل میں بسائے ہوئے تھی مگر حنین نے اسے برے برے القابات سے ہی نوازا تھا اس کے سامنے آتے ہی سارے کام برے اور غلط ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن تو اسے منحوس تک کہہ دیا تھا وہ سب کچھ اپنے دل پر ہی جھیل رہی تھی کسی سے بھی کوئی ذکر تک نہیں کرتی تھی اور اب وہ ساری زندگی کے لیے اس کے سر پر میلٹ ہونے جا رہی تھی جانے اس کے رویے کیسے ہوں گے۔ وہ سوچتے ہوئے اپنے کمرے کو بھی سمیٹ رہی تھی سلائی کے بعد تو کمرے میں زیادہ ہی پھیلاوا ہو جاتا تھا۔

دروازے پر ہلکی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اتنی جلدی تو شرہ آنے سے رہی تھی وہ کمرے سے نکلی اور کوریڈور اس کر کے گیٹ تک آگئی اور بناء پوچھے ہی کھول دیا تھا۔ سامنے حنین انی تمام تر وجاہت لیے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ لیے کھڑا تھا اور وہ تو حیرانگی کے ساتھ گڑبڑا بھی گئی۔ آچل کو دونوں شانوں پر درست کیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، ابھی اسے ہی تو سوچ رہی تھی اور سوچ اتنی تیز تھی جو حنین کے دل و دماغ کو پہنچ گئی اور وہ آگیا۔

”آ..... آپ.....“

”میں تو سمجھا حیرانگی سے بے ہوش ہو جاؤ گی۔“ وہ معنی خیزی سے گویا ہوا مگر آنکھوں کی شوخیاں بتا رہی

تھیں وہ بہت شرارتی موڈ میں ہے۔

”کیوں آئے ہیں ادھر اور شرہ تو آپ کی طرف گئی ہے۔“ وہ پراعتاد لہجے میں اس سے بول رہی تھی۔

”اسی لیے تو موقع ملے ہی یہاں آگیا تم سے دو دو ہاتھ کرنے۔“ وہ پھر دل جلانے والی مسکراہٹ لیے

آگے بڑھنے لگا۔

”پلیز اس وقت چلے جائیں امی ابو بھی نہیں ہیں۔“

”سب خبر ہے اسی لیے تو آیا ہوں۔“ وہ اسے راستے سے ہٹا کے اندر داخل ہو گیا۔

”کیا بد تمیزی ہے آپ ایسے کیسے اندر آ گئے۔“

”تمہارے سامنے ہی آیا ہوں۔“ گہری معنی خیز نگاہیں اس کے صبح چہرے پر جمادیں اور آریکے کا تو حیا

اور خوف سے چہرے کا رنگ تک بدل گیا تھا۔

”ادھر آؤ اور مجھ سے کچھ سن لو۔“

”اتنا کچھ پہلے ہی سنایا ہوا ہے اب کون سی کس بات کی ہے جو پوری کرنے چلے آئے ہیں۔“ اپنا ہاتھ اس

کے شگجے سے چھڑایا۔

”آپ کی بہتری اسی میں ہے آپ چلے جائیں۔“ وہ پشت سے ذرا درشت لہجے میں بولی تھی کتنا وہ اس

کے رویوں پر رو چکی تھی۔  
 ”آریکہ پلیرز کچھ تو صفائی کا موقع دو۔“ لہجہ التجا سیہ ہو گیا کیونکہ وہ بہت زیادہ اس سے بد دل اور بد گمان ہو گئی تھی اس کی صورت تک نہیں دیکھ رہی تھی۔

”صفائی کا موقع وہاں دیا جاتا ہے جہاں دل کو یہ اطمینان ہو ہم اس کے لیے اہمیت رکھتے ہوں اس لیے باندھا جا رہا ہے اس سے سارے مطلب جو پورے ہو جائیں گے۔“ وہ اتنی طنز اور روکھی ہو رہی تھی حنین نے اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے پر غور کیا۔  
 ”سارے مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“

”سمجھ کے انجان بننے کی بھی ادا آپ کی خوب رہی۔ پلیرز جائے میں مزید آپ کے سامنے نہیں کھڑی رہ سکتی، کیونکہ آپ کے سارے کام جو خراب ہو جاتے ہیں۔“  
 ”آریکہ پلیرز۔“ وہ رو ہنسا اور بے بس ہو رہا تھا۔

”کسی کے شخصیت کے مینار کو توڑنا بہت آسان ہوتا ہے اور اپنی شخصیت مینار بنانا سامنے والے کے سامنے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“ واضح اشارہ حنین کی طرف ہی تھا۔  
 ”یہ فلسفہ کب سے بولنے لگی ہو۔“ اس نے جیسے اس کی بات کو رد کیا ہے۔  
 ”فلسفہ نہیں ہے یہ میری اپنی بات ہے آپ نے میری شخصیت توڑ دی ہے۔“ وہ چیخی۔  
 ”آریکہ ایسا نہیں ہے۔“

”مسٹر حنین جو سچ اور واضح ہے میں سب جان گئی ہوں۔“ وہ اس کے سامنے آنکھوں میں نمی لیے حسرت بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔  
 ”اچھا یہ بتاؤ تم نے یہ فرنیچر وغیرہ اور یہ سارا سامان جب میں نے منع کیا تھا تو کیوں تم نے آنٹی سے ضد کی۔“

”ارے آپ کا کیا بھر و ساساری زندگی جہیز نہ لانے کا آپ کے منہ سے طعن سن لیا تو کیا ہوگا کیونکہ بعد میں مجھ میں مزید بے عزتی برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔“  
 وہ لب بھیج کر رہ گیا آریکہ غصے کے ساتھ اپنے ٹوٹے اور اداس لہجے کے ساتھ تھی اس کا دل کافی حد تک بد گمان ہو گیا تھا۔ وہ اسے کتنا ہی یقین دلائے وہ جواب میں نئی سی نئی بات تراشتی رہے گی۔  
 ”مجھے تم صفائی کا موقع نہیں دوگی۔“

”صفائی کا موقع کی آپ کو ضرورت کیا ہے جیتی جاگتی آپ کے پیر کی جوتی بن کے آتور ہی ہوں جو دل چاہے سلوک کیجیے گا۔“ دانت پیس کے طنز کیا۔  
 ”شٹ اپ۔“ وہ تو بھنا ہی گیا اس کے آخری الفاظ پر۔ ”جو تمہارے منہ میں آ رہا ہے بولے جا رہی ہو۔“

”آپ بھی وہی کرتے رہے ہیں، کیوں سچ سننے کی ہمت نہیں، میں آپ کو جان گئی ہوں حنین صاحب! آپ کی نظر میں میری صرف اتنی اہمیت ہوگی آپ کے گھر کے کام کرنے والی کی طرح۔“  
 ”بند کرو بکواس۔“ اس کے تو دماغ پر ہی لگ رہی تھی۔

”ساری زندگی یہ بکواس سنی پڑے گی۔“ پھر طنز کیا۔

”تم نے جانے میرے مذاق کا کیا مطلب لے لیا۔“

”مذاق ایسے ہوتے ہیں۔ ایک لڑکی کی بے عزتی کرتے رہے جب وہ زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہے تو صلح کا جھنڈا لہرانے آگئے کیونکہ کپڑا مائز بھی تو ضروری ہے۔“

”میں کوئی کپڑا مائز کرنے نہیں آیا۔ وہ بھی صاف گو تھا اسے فضول کی ڈائلاگ بازی بھی بری لگتی تھی۔“

”پھر یہ کیا ہے یا پھر اپنی امی کے کہنے پر آگئے۔“

”تم سے مجھے کچھ نہیں کہنا جا رہا ہوں۔“ وہ بہت دلگرفتہ ہو گیا تھا اور پھر یہ سب کیا دھرا بھی تو اس کا تھا آریکہ بہت حساس دل کی تھی۔ اس نے اپنے دل و دماغ میں جانے کیا کیا سوچ لیا تھا۔

”تم بے فکر رہو، آئندہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ وہ یہ کہہ کر سیدھا سیڑھیاں اتر گیا۔ آریکہ نے جھٹ دروازہ بند کر لیا۔ اس نے حنین کو جودل میں آیا سنا دیا تھا دل کا بوجھ ہلکا تو ہو گیا تھا اسے احساس تو دلایا تھا اس کی باتوں نے اس کے دل کو بہت ہرٹ کیا تھا۔

”حنین! میں بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ کام کرنے والی چاہیے۔ میں ویسی ہی بنی رہوں گی۔ آپ کی طرف توجہ تک نہیں دوں گی۔“ وہ اندر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ کافی دیر تک اسے ہی سوچے جا رہی تھی۔ پھر اسے تنہائی سے وحشت ہونے لگی۔ امی اب بھی ابھی تک نہیں آئے تھے اور شرمہ بھی لگتا تھا وہاں جا کے جم گئی تھی۔ اسے بلا بھی نہیں سکتی تھی۔ شادی میں صرف چند دن ہی رہ گئے تھے۔ اس کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو رہا تھا جانے کیوں اتنے دوسے ڈراتے رہتے تھے۔ لڑکیاں تو اپنی شادی پر خوش ہوتی ہیں یہاں تو اس پر قنوطیت سوار تھی۔



جب سے ماہانے اس سے رشتہ ختم کرنے کا کہا تھا وہ بہت ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

اگر ماہانے بشری سے یا منیب احمد سے رشتہ ختم کرنے کا کہہ دیا تو یہ تو ذرا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ منیب احمد نے اس سے بہت سی اچھی امیدوں کے ساتھ رشتہ جوڑا تھا وہ اسے کچھ خاص ہی سمجھتے ہیں اسی لیے تو اپنی اکلوتی بیٹی کو اسے سوچنے کا سوچا تھا۔

مگر ماہا کی خواہشات اور سوچیں سب جانتا اور سمجھتا تھا مگر جب تک اس کے گھر والے نہیں مل جاتے، وہ کوئی بھی خوشی ان سب کے بغیر منانے کا سوچ بھی نہیں سکتا مگر اس وقت اسے یہ پریشانی لاحق تھی، ماہا اس شادی والے گھر میں نیا ہنگامہ نہ کر دے اور اسے دینے کے لینے نہ پڑ جائیں وہ اپنے بھرے اعصاب کے ساتھ کمرے میں ادھر سے ادھر وحشت زدہ چکر کاٹ رہا تھا۔

صنوبر کی مایوں کے دن بھی آگئے تھے۔ وہ مایوں تو بیٹھ ہی گئی تھی۔ مہندی کا فنکشن بھی آج تھا دو دن سے ماہا بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یونیورسٹی بھی وہ ڈرائیور کے ساتھ جا رہی تھی۔ اسے بشری نے ہی بتایا تھا ورنہ اسے لانے لے جانے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ وہ نہادھو کے فریش ہوا اسکاٹی بلیو میض شلوار میں ملبوس وہ نکھر نکھرا نکلا تھا۔ ماہا کے کمرے کی طرف بھی کن انکھیوں سے دیکھا ایک جھلک تو اس کی نظر آ ہی جائے۔

”شہزیل بیٹا! جلدی آؤ لان کو ڈیکوریٹ کرنے والا آیا ہے۔ یہ فواد اور شیراز جانے کدھر نکل گئے ہیں۔“ تائی امی کی پکار پر اس نے چونک کے نیچے دیکھا تھا۔

”جی اچھا آتا ہوں۔“ وہ مودب بنا جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آیا۔

”بشری! ماہاٹھی یا نہیں۔“ شہزیل کے کان کھڑے ہوئے اسے واضح اشارہ لگ رہا تھا وہ کوئی بے وقوفی کر چکی تھی۔

”اٹھایا تھا کہہ رہی ہے بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

”ارے ایسے کیسے ہو سکتا ہے مہندی ہے اور بچیاں تو ایسے فنکشن کو انجوائے کرتی ہیں۔“ رخشندہ کو تشویش بھی تھی۔

شہزیل خان وہاں سے نکلا اور لان میں آ گیا۔ سارا رات جمعوت وغیرہ اس نے اپنی نگرانی میں کر دیا تھا۔ تایا ابونے بھی ساری تیاری دیکھی تو وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

”تم جاؤ کچھ کھاؤ پیو باقی میں دیکھتا ہوں۔“ انہوں نے شہزیل کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ پھر مسکراتا ہوا سر جھکا تا ہوا چلا گیا تھا۔

اندرا آیا تو وہاں کا ماحول ہی اسے عجیب لگا کیونکہ بشری تو سر پکڑے بیٹھی تھیں اور ایک تنقیدی نگاہ اس پر بھی ڈالی لیکن ماہانے الناسیدھا تو کچھ نہیں کر دیا کیونکہ بشری اسے اچھی نظروں سے تو نہیں دیکھ رہی تھیں۔

”شہزیل شہبیر کو کال کرو ابھی تک آیا کیوں نہیں۔ ہم تو کب سے کال ملا ملا کے تھک گئے ہیں۔“ تائی امی نے کہا۔

”جی اچھا۔“

”بشری! میں تو کہتی ہوں شہزیل کے ساتھ ہی اسے ڈاکٹر کے لئے لے جاؤ آخر اچانک سے اسے الٹیاں کیوں ہونے لگی ہیں۔“ شہزیل شہبیر سے رابطہ کرنے کی کوشش میں بھی تھا مگر ماہا کی ایسی بیماری کا سن کے پریشان بھی ہوا۔

”تائی امی اس کا نمبر بڑی جا رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم ایسا کر دفریش ہو کے آؤ۔ ماہا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو گا رات میں مہندی کا بھی فنکشن ہے کہیں اس کی حالت بگڑ نہ جائے۔“

”جی..... جی اچھا۔“ وہ بشری کا حکم سنتے ہی الرٹ ہوا۔ خود ہی اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا اس نے نیچے جھانک کے بھی دیکھا کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔

وہ جھٹ لاک گھما کے ماہا کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ اپنی اس حرکت پر حیران بھی تھا وہ تو سویر اور سنجیدہ رہتا تھا۔ اچانک سے ماہا کی اتنی فکر بھی ہونے لگی تھی۔

”تم اور یہاں.....! کیوں آجائے ہو۔“ وہ تو اسے دیکھ کر ناگواری سے مشتعل ہو گئی۔

”آپ کو ہوا کیا ہے؟“ وہ استفسار کرنے چلا آیا تھا اور ماہا بلیو سوٹ میں کچھ مضحل اور کمزور سی بھی لگ رہی تھی۔

”تمہارے بچے کی ماں بننے جا رہی ہوں۔“ اس نے گویا اس کی سماعتوں کے قریب بم ہی پھوڑا تھا۔

”ساری زندگی یہ بکواس سنی پڑے گی۔“ پھر طنز کیا۔

”تم نے جانے میرے مذاق کا کیا مطلب لے لیا۔“

”مذاق ایسے ہوتے ہیں۔ ایک لڑکی کی بے عزتی کرتے رہے جب وہ زندگی میں شامل ہونے ہے تو صلح کا جھنڈا لہرانے آگئے کیونکہ کپڑا ماز بھی تو ضروری ہے۔“

”میں کوئی کپڑا ماز کرنے نہیں آیا۔ وہ بھی صاف گو تھا اسے فضول کی ڈائلاگ بازی بھی بری لگتی۔“

”پھر یہ کیا ہے یا پھر اپنی امی کے کہنے پر آگئے۔“

”تم سے مجھے کچھ نہیں کہنا جا رہا ہوں۔“ وہ بہت دلگرفتہ ہو گیا تھا اور پھر یہ سب کیا دھرا بھی تو

آریکہ بہت حساس دل کی تھی۔ اس نے اپنے دل و دماغ میں جانے کیا کیا سوچ لیا تھا۔

”تم بے فکر ہو، آئندہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ وہ یہ کہہ کر سیدھا بیڑیاں اتر گیا۔

نے جھٹ دروازہ بند کر لیا۔ اس نے حنین کو جو دل میں آیا سنا دیا تھا دل کا بوجھ ہلکا تو ہو گیا تھا اسے

دلایا تھا اس کی باتوں نے اس کے دل کو بہت ہرٹ کیا تھا۔

”حنین! میں بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ کام کرنے والی چاہیے۔ میں ویسی ہی بن

گی۔ آپ کی طرف توجہ تک نہیں دوں گی۔“ وہ اندر آ کے بیٹھ گئی تھی۔ کافی دیر تک اسے ہی سوچے جا رہے

پھر اسے تنہائی سے وحشت ہونے لگی۔ امی اب بھی ابھی تک نہیں آئے تھے اور شرہ بھی لگتا تھا وہاں جا

تھی۔ اسے بلا بھی نہیں سکتی تھی۔ شادی میں صرف چند دن ہی رہ گئے تھے۔ اس کی دھڑکنوں میں اضافہ

تھا جانے کیوں اتنے سو سے ڈراتے رہتے تھے۔ لڑکیاں تو اپنی شادی پر خوش ہوتی ہیں یہاں تو

قنوطیت سوار تھی۔

☆.....☆

جب سے ماہانے اس سے رشتہ ختم کرنے کا کہا تھا وہ بہت ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

اگر ماہانے بشریٰ سے یا منیب احمد سے رشتہ ختم کرنے کا کہہ دیا تو یہ تو ذرا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔

نے اس سے بہت سی اچھی امیدوں کے ساتھ رشتہ جوڑا تھا وہ اسے کچھ خاص ہی سمجھتے ہیں اسی

اکلوتی بیٹی کو اسے سوچنے کا سوچا تھا۔

مگر ماہا کی خواہشات اور سوچیں سب جانتا اور سمجھتا تھا مگر جب تک اس کے گھر والے نہیں مل

کوئی بھی خوشی ان سب کے بغیر منانے کا سوچ بھی نہیں سکتا مگر اس وقت اسے یہ پریشانی لاحق تھی

شادی والے گھر میں نیا ہنگامہ نہ کر دے اور اسے دینے کے لینے نہ پڑ جائیں وہ اپنے گھر سے

ساتھ کمرے میں ادھر سے ادھر وحشت زدہ چکر کاٹ رہا تھا۔

صنوبر کی مایوں کے دن بھی آگئے تھے۔ وہ مایوں تو بیٹھ ہی گئی تھی۔ مہندی کا فنکشن بھی آج تھا

ماہا بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یونیورسٹی بھی وہ ڈرائیور کے ساتھ جا رہی تھی۔ اسے بشریٰ نے

ورنہ اسے لانے لے جانے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ وہ نہادھو کے فریش ہوا اسکا کافی بلیو میض

ملبوس وہ نکھرا نکھرا نکلا تھا۔ ماہا کے کمرے کی طرف بھی کن اکھیوں سے دیکھا ایک جھلک تو اس

جائے۔

”شہزہیل بیٹا! جلدی آؤ لان کوڈ یکوریٹ کرنے والا آیا ہے۔ یہ فواد اور شیراز جانے کدھر نکل گئے ہیں۔“ تائی امی کی پکار پر اس نے چونک کے نیچے دیکھا تھا۔

”جی اچھا آتا ہوں۔“ وہ مودب بنا جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آیا۔

”بشری! ماہا اٹھی یا نہیں۔“ شہزہیل کے کان کھڑے ہوئے اسے واضح اشارہ لگ رہا تھا وہ کوئی بے وقوف کر چکی تھی۔

”اٹھایا تھا کہہ رہی ہے بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

”ارے ایسے کیسے ہو سکتا ہے مہندی ہے اور بچیاں تو ایسے فنکشن کو انجوائے کرتی ہیں۔“ رخشندہ تشویش بھی تھی۔

شہزہیل خان وہاں سے نکلا اور لان میں آ گیا۔ سارا رات بھر وہاں اس نے اپنی نگرانی میں کر دیا تھا تاہم اب وہ بھی ساری تیاری دیکھی تو وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

”تم جاؤ کچھ کھاؤ پیو باقی میں دیکھتا ہوں۔“ انہوں نے شہزہیل کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ پھر مسکرا ہوا سر جھکاتا ہوا چلا گیا تھا۔

اندرا آیا تو وہاں کا ماحول ہی اسے عجیب لگا کیونکہ بشری تو سر پکڑے بیٹھی تھیں اور ایک تنقیدی نگاہ اس پر بھی ڈالی لیکن ماہا نے اٹھا سیدھا تو کچھ نہیں کر دیا کیونکہ بشری اسے اچھی نظروں سے تو نہیں دیکھ رہی تھیں۔

”شہزہیل شہیر کو کال کر دیا بھی تک آیا کیوں نہیں۔ ہم تو کب سے کال بلا ملا کے تھک گئے ہیں۔“ تائی امی نے کہا۔

”جی اچھا۔“

”بشری! میں تو کہتی ہوں شہزہیل کے ساتھ ہی اسے ڈاکٹر سے لے جاؤ آخر اچانک سے اسے الٹیاں کیوں ہونے لگی ہیں۔“ شہزہیل شہیر سے رابطہ کرنے کی کوشش میں بھی تھا مگر ماہا کی ایسی بیماری کا سن کے پریشان بھی ہوا۔

”تائی امی اس کا نمبر بڑی جا رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم ایسا کرو فریش ہو کے آؤ۔ ماہا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو گا رات میں مہندی کا بھی فنکشن ہے کہیں اس کی حالت بگڑ نہ جائے۔“

”جی..... جی اچھا۔“ وہ بشری کا حکم سنتے ہی الرٹ ہوا۔ خود ہی اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا اس نے نیچے جھانک کے بھی دیکھا کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔

وہ جھٹ لاک گھا کے ماہا کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ اپنی اس حرکت پر حیران بھی تھا وہ تو سو برادر بنجیدہ رہتا تھا۔ اچانک سے ماہا کی اتنی فکر بھی ہونے لگی تھی۔

”تم اور یہاں.....! کیوں آجائے ہو۔“ وہ تو اسے دیکھ کر ناگوار سے مشتعل ہو گئی۔

”آپ کو ہوا کیا ہے؟“ وہ استفسار کرنے چلا آیا تھا اور ماہا بلیو سوٹ میں کچھ مضحکہ اور کمزوری بھی لگ رہی تھی۔

”تمہارے بچے کی ماں بننے جا رہی ہوں۔“ اس نے گویا اس کی سماعتوں کے قریب ہی بم پھوڑا تھا۔



شہزیل تو زلزلے کے جھکوں کی طرح ہل کے ہی رہ گیا۔ ایسی غیر متوقع بات اس کے منہ سے سن کے وحشت زدہ بھی ہوا۔

”کیوں یقین نہیں آ رہا؟“ اسے شہزیل کی حواس باختگی پر ہنسی تو آئی مگر جھٹ چھپالی کیونکہ اسے شہزیل پر غصہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس کی عقل ٹھکانے لگانا چاہتی تھی۔

”ماہا آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں دماغ تو درست ہے۔“ وہ کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جھینپ بھی گیا۔

”میری دو تین دن سے طبیعت خراب ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ اسے ماہا سے اتنی بے باکی کی توقع نہیں تھی۔

”میں نے امی کو بھی بتا دیا ہے۔“

”کیا؟“ وہ تو کرنٹ کھا کے اٹھل ہی گیا۔

”ہاں کیوں تم کس کس کو یقین دلاؤ گے۔“ اسے شہزیل کی حالت مزادے رہی تھی۔

”پتا بھی ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ اس کے تو لگتا تھا طوطے اڑ گئے ہوں۔

”امی بہت پریشان ہیں یقیناً وہ تمہارا اور میرا نکاح آج پڑھوادیں گی۔“ وہ چلتی ہوئی شہزیل کے اتنے قریب آ گئی کہ اس کی پشت شہزیل کے بازوؤں کو چھو گئی اور اسے پسینے ہی آ گئے۔ ماہا اتنی پراعتماد اور نڈر لگ رہی تھی اسے خوف آرہا تھا جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ اس نے ناگواری سے چتون سکیڑ کے گھورا تھا۔

”میں جا کے ابھی سب بتاتا ہوں، آپ کی یہ شرارت ہے۔“

”تمہیں ذرا شرم نہیں آئے گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرائی۔ معنی خیزی سے آنکھیں بھی گھمائیں۔

”پلیز ماہا! کیوں آپ میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ کیوں ایسا کر رہی ہیں کہ میں گھر چھوڑ کے چلا جاؤں۔“

وہ تو تنفن ہو کے آگ بگولہ ہی ہو گیا۔

”ٹھیک ہے آپ کو جو کرنا ہے کریں آئی کو آپ نے بتا کے اچھا نہیں کیا۔“

”تم جیسے میرے ساتھ بہت اچھا کرتے ہو۔ ہر وقت طنز اور نفرت۔“ وہ بھی ترکی بہ ترکی اس سے دو بدو

ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر نکائے ہوئے تھے۔

”طنز میں نہیں، آپ کرتی ہیں۔“ اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”ماہا..... ماہا۔“ بشریٰ کی زوردار دستک پر شہزیل تو گھبرا ہی گیا۔

”آئی۔“

”امی کو ثبوت بھی مل جائے گا تم میرے کمرے میں ہو۔“ وہ دروازہ کھولنے جانے لگی۔ شہزیل نے سرعت کی تیزی سے اس کا بازو پکڑا تو وہ گرتے گرتے پچی۔ اگر بروقت وہ شہزیل کے کرتے کی کالر نہ پکڑ لیتی۔

”کیا کرتے ہو؟“ ان کی پکار بڑھ گئی تھی اس لیے کہ ماہا کی حالت جو ایسی دیکھ کے گئی تھیں۔

ماہا کو پھر مٹلی ہوئی وہ دواش روم میں بھاگی تھی اور وہ اس کے پیچھے پیچھے تھا واقعی اسے دو مینٹگ ہو رہی تھی۔

”آپ کو تو سچ میں دو مینٹگ ہو رہی ہے۔“ وہ فکر مندی اور تشویش بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ اسی وقت ذہن نے شرارت تراش لی۔

دروازے کی دستک رک گئی تھی شاید بشری چلی گئی تھیں۔

”ماہا آپ کا یونیورسٹی میں کسی سے اس حد تک افیئر چل رہا ہے۔ آپ نے جائز ناجائز کا سوچا تک نہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔

ماہا کی تو حیرانگی اور نہ سمجھی سے آنکھیں پھیل ہی گئیں۔ وہ اس کی معنی خیزی سمجھ گئی تھی۔

”فضول بکواس نہیں کرو میرا کسی سے کوئی افیئر نہیں۔“

”کون کیسے یقین کرے گا، ابھی میں منیب انکل سے جا کے کہوں تو وہ میری بات کا یقین کریں گے۔“

”تم..... تم.....“ وہ تو کھسیا ہی گئی۔

”جلدی سے آنٹی سے بولے جا کے کہ تم نے صرف شرارت اور مذاق میں یہ سب کیا۔“

”اوہ یو.....“ ماہا نے اپنی مٹھیاں غصے سے بھینچ لی تھیں۔

”میں واش روم میں ہوں آپ باہر دیکھیں کوئی ہے تو نہیں۔“ اس نے دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

ماہا نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ شہزیل نے دھمکی ہی ایسی دی تھی۔

”دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں۔“ بشری کے چہرے پر ہوا بھلاں اڑ رہی تھیں۔

اور شہزیل کے کان ان کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

”واش روم میں تھی۔“

”چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ لگتا ہے تمہیں فوڈ پوائزن ہوا ہے۔“ وہ بہت فکر مند ہو رہی تھیں۔

”ٹھیک ہوں صبح میں نے پراٹھا کھایا تھا آپ جانتی ہیں پراٹھے میں کھاتی نہیں ہوں۔ آج کھایا تو وہ

پراہم کر گیا۔“ اس نے انہیں باتوں سے بہلا کے تسلی اور اطمینان دلایا۔

”پھر بھی دوائی لے لو شادی کا گھر ہے۔“

”امی! ٹھیک ہو جاؤں گی آپ جوس بھیج دیں۔“ اس نے چہرے پر زبردستی کی بشارت بھی رکھی۔

بشری جیسے مطمئن نہیں ہو رہی تھیں۔

”ارے امی! آپ اتنا پریشان نہیں ہوں، ٹھیک ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”اچھا ٹھیک ہے تم آرام کر لو میں جوس بھیجتی ہوں۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی تھیں۔

ماہا نے بھی تشکر بھرا سانس لیا تھا امی کو مطمئن کرنا بہت مشکل کام تھا۔

شہزیل نے بھی شکریہ ادا کیا۔ ماہا نے ان سے کوئی الٹی سیدھی بکواس نہیں کی تھی۔

”زیسے بانی ڈاؤس آپ کو یہ دو مینٹگ کیوں ہو رہی ہے۔“ واش روم سے نکل کے وہ تفتیشی انداز میں

اس سے پوچھنے لگا۔

”سانپیں ابھی امی سے کیا کہہ رہی تھیں۔“ وہ اس کے پوچھنے پر تنک ہی گئی۔

”اچھا..... اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ ہنسا۔ ماہا بے بس جو دکھائی دے رہی تھی اس کی کمزوری جو ہاتھ آگئی

تھی۔

”ہر وقت بچی نہیں بنی رہا کریں۔ سمجھداری پکڑیں کسی دن آپ کی بے وقوفیاں آپ ہی کے گلے پڑ گئیں تو بچاؤ کا کوئی راستہ بھی نہیں ہوگا۔“ گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگہی دے رہا تھا۔  
 ”شہزاد! تم نے مجھے بھی سمجھا ہی نہیں صرف بچی بچی اور بچپنا ہی کرتے رہتے ہو۔ دیکھنا ایک دن تم خود میری صلاحیتوں پر حیران رہ جاؤ گے۔“  
 ”جیسے ابھی کی صلاحیت ملاحظہ کریں۔“ وہ تمسخر اڑانے کے ساتھ طنز کرنے لگا وہ جزبزی ہو کے اسے گھورنے لگی تھی۔  
 ”چلتا ہوں رات میں ملیں گے مہندی کے فنکشن میں۔“ وہ مسکراتی اور تمسخر اڑاتی نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ ماہیچ دتاب کھا کے رہ گئی تھی۔

☆.....☆

”فہر! کیا آج جانا نہیں ہے؟“ زہرہ نے اسے نوبے تک بھی بستر پر سوتے پایا تو اس کے روم کی کھڑکی کے پردے انہوں نے ہٹائے۔  
 ”امی! آج آرام کا موڈ ہے کام کام رات دن سے تھکن ہو گئی ہے۔“ اس نے کسلمندی سے آنکھوں کو بمشکل کھولا۔  
 ”کس نے کہا تھا اتنا کام کرو اور پھر خود کو بے آرام ہی کر لو۔“ وہ اس کے سر ہانے بیٹھ کے اس کے بالوں میں بڑے پیار ہاتھ پھیرنے لگیں۔

فہر نے اپنی آنکھیں کھول کے ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔  
 ”پورا دن آرام کرو اور اس کو اپنے قریب سے ہٹا دو۔“ انہوں نے اس کا سیل اٹھایا جو اس کے قریب ہی بیڈ پر پڑا تھا۔  
 ”اسے یہیں رہنے دیں کسی کی بھی کال آسکتی ہے اور اچانک سے چھٹی کر رہا ہوں ضرور وہاں پریشانی بھی لگ جائے گی۔“

”چھوڑو اسے۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ سے سیل لیا اور سائینڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا۔  
 ”ٹھیک ہے تم سو جب دل بھر جائے سونے سے آجانا میں ناشتر ریڈی کر دوں گی۔“ وہ اٹھنے لگیں۔  
 ”بیٹھے رہیے اچھا لگ رہا ہے آپ میرے یوں لاڈ اٹھا رہی ہیں۔“ اس نے مسکرا کے ان کی جانب کروٹ لی۔

”لاڈ اٹھانے والی لے آتی ہوں صبح وشام اٹھایا کرے گی۔“ انہوں نے معنی خیزی سے مسکرا کے کہا۔  
 ”دوسری کی کیا ضرورت ہے میری یہی ماں پرفیکٹ ہے۔“ وہ جان کے بھی انجان بنا۔  
 ”میں تمہاری بیوی کی بات کر رہی ہوں۔“

”امی صبح میرا موڈ خراب نہیں کریں۔“ وہ اس موضوع سے بچنا چاہتا تھا اور نیل فر کے علاوہ تو وہ کسی اور کو اس جگہ پر لانا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”بھابی! ابھی ضیاء کی شادی کی کرنا چاہ رہی ہیں کنول سے کہا ہے لڑکی دیکھنے کو۔“  
 ”گڈ! یہ تو اچھی خبر سنائی آپ نے ہر وقت بزنس کے جھیلوں میں پڑا رہتا ہے۔ اچھا ہے کچھ چنچ تو آئے

گا۔

”تمہاری لائف میں بھی پہنچ ضروری ہے کہاں تک پہنچی تمہاری کہانی۔“ زہرہ نے یکدم پوچھا۔

”کون سی کہانی۔“ وہ جیسے سمجھ کر بھی انجان بن رہا تھا۔

”مجھے سب خبر ہے میرے پیڈم اور ڈیشنگ بیٹے کی زندگی میں کوئی لڑکی تو ضرور ہے۔“ وہ شرارتی لہجے میں مسکرا کے اس کے رخسار تھپتھانے لگی تھیں۔

”میں آپ سے اور ابو سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں وہ لڑکی میری قسمت میں نہیں ہے اور رہا شادی کا سوال وہ تو میں ساری زندگی نہیں کروں گا۔“ اسے بھی خود سے ضد ہی ہو گئی تھی۔

”وہ لڑکی اتنی خاص ہے کہ تم نے ساری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ انہوں نے سنجیدہ سی آواز میں کہا۔

”پلیز امی اس ٹاپک کو صبح نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔“ وہ بے زاری اور کوفت میں مبتلا ہو کر گویا ہوا۔ لہجہ بھی اس کا رخ ہی ہو رہا تھا۔

”تمہاری ماں ہوں اور ماں اپنی اولادوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑ سکتی تم ہماری ذمہ داری ہو فرض ہو ہمیں وہ ادا کرنے دو ورنہ اللہ کے سامنے ہماری پکڑ ہوگی کہ تمہاری اولاد اس قابل بھی اس کی شادی کیوں نہیں کی۔“

”زندگی میں شادی کرنا ہی ضروری ہے۔“ اس کا ذہن منتشر ہو گیا تھا نیل فراس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔

”ہاں بہت ضروری ہے، جان بوجھ کے اگر شادی نہیں کرو یا ان کے والدین اپنی اولادوں کی نہ کریں تو یہ بہت غلط فعل ہے۔“ وہ اسے سمجھانے لگیں۔

”شادی کرنے کے لیے لڑکی کا ہونا ضروری ہے اور لڑکی تو ہے ہی نہیں۔“

”لڑکی بھی موجود ہے بس تم ہی بتانا نہیں چاہتے۔“ وہ آج اس سے اس کی پسند جانا چاہتی تھیں۔

کیا فائدہ بتانے کا۔“ وہ ٹال کے پھر کوٹ لے کے لیٹ گیا۔

”فہر! میری طرف دیکھو۔“ زہرہ نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

”امی! نہیں کر پس یہ شادی وادی کا ذکر مجھے سخت چڑھنے لگی ہے۔“ وہ ذرا غصے میں آ گیا۔

”میں تو کروں گی کیونکہ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے تمہاری حالت دیکھ کر کتنا چپ چپ رہنے لگے ہو۔

جاب پر سے آتے ہی کمرے میں بند ہو جاتے ہو میرا دل تو کڑھتا ہے نا۔“ وہ رو ہانسی ہو گئیں۔ ماں انھیں اولاد کی تکلیف تو وہ چہرہ دیکھ کر بھانپ جاتی تھیں اور پھر انہیں اندازہ ہو گیا تھا یہ کسی لڑکی کو کافی حد تک پسند کرتا ہے اسی لیے شادی کے نام سے چڑنے لگا ہے۔

”امی..... امی کیا ہو گیا ہے آپ تو رونے لگیں۔“ وہ گھبرا کے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ بکھرے بال بلیو نائٹ

ڈریس میں وہ الجھا الجھا پریشان بھی نظر آ رہا تھا۔

”میرا کیا قصور ہے جو مجھ سے بھی رخ دے کے بات نہیں کرتے ہو۔“

”میری پیاری امی۔“ اس نے انہیں اپنے گلے سے لگالیا اور آواز کو ذرا فریٹش بنایا۔  
 ”شرافت سے مجھے اس لڑکی کا بتا دو کون ہے جس نے تمہیں اتنا سنجیدہ بنادیا ہے۔“ وہ ذرا ڈپٹ کے خفگی سے گویا ہوئیں۔

”فرض کریں اگر بتا بھی دیا تو کیا کریں گی آپ پکڑ کے اس کا نکاح مجھ سے کروادیں گی۔“ اس نے ہنس کے شرارتی انداز میں ہی ماحول کی افسردگی اور سنجیدگی کو زائل کیا۔  
 ”مجھے بتاؤ تو ہے کون کیسی ہے؟“ انہیں بھی جاننے کا بحس اور اشتیاق تھا۔  
 ”آپ ابو کو کچھ نہیں بتائیں گی آپ جانتی ہیں وہ پھر میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور ہاں اس مہاد کو تو بالکل بھی نہیں۔“

”اچھا..... اچھا نہیں بتاؤں گی کنول کو بتا دوں۔“ وہ جیسے اسے چھیڑنے لگیں۔

”آئی کو سب خبر ہے۔“ اس نے جھینپ کے سر جھکایا۔

”یعنی تم دونوں بہن بھائی سب جانتے ہو اور یاں کو ہوا تک لگنے نہیں دی۔“ وہ پھر خفا سی ہوئے لگیں۔

”میں نے انہیں بھی کب بتایا تھا وہ تو خود جان گئیں۔“

”اچھا بتاؤ کون لڑکی ہے۔“

”امی، امی۔“ مہاد کی چچی پکارتی آواز آئی تو فہر نے بھی اپنے لب بھینچ لیے۔

”میں اندر آ سکتا ہوں۔“ وہ ناک کر کے پوچھنے لگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”تم اندر آ چکے ہو۔“ اس نے مہاد کو دیکھا جو اندر ہی کھڑا تھا۔

”آخا آج تو آپ بیڈ توڑ رہے ہیں۔“ اسے حیرانگی بھی ہوئی فہر کی موجودگی پر جو ابھی تک محو

استراحت تھا۔

”تم نے ناشتا کر لیا؟“ زہرہ پوچھنے لگیں۔

”میں نے تو کر لیا وہ آپ کے شوہر نامدار پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا بڑے بیٹے کے ساتھ لاؤ کرنے

گئی ہوں گی، آپ کی نیگم۔“

”بہت ہی فضول ہاں کتا ہے۔“ زہرہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

فہر نے بھی شکر ادا کیا وہ بیچ گیا بتانے سے۔

”سنو! تم بھی نہادھو کے جلدی سے آ جاؤ اور آج تو میں تمہیں ایسے چھوڑوں گی نہیں، ماں کو بے وقوف بنا

کر رکھا ہوا ہے۔“ وہ بیڈ سے اتریں اور ساتھ ساتھ فہر کو بھی ہدایت دینے لگیں۔

”خیریت کیا آپ کے راز افشاں ہو گئے امی کہیں وہ کال والی لڑکی کا تو آپ کو پتا نہیں لگ گیا۔“ وہ معنی

خیزی سے فہر کی طرف آنکھیں گھما رہا تھا جو مہاد کو جوابی گھور رہا تھا۔

”یہ ساری بکواس تو میں نکالوں گا۔ میں نے تمہیں زیادہ ہی چھوٹ دی ہوئی ہے، اسی لیے مجھ سے ہر

وقت فری ہوتے ہو۔“ زہرہ ان دونوں کو چھوڑ کر کمرے سے چلی گئی تھیں اور فہر کی توپوں کا رخ مہاد کی طرف

ہو گیا تھا۔

”میں نے ایسا کیا کر دیا۔“

”تم ہی امی کو الٹی سیدھی میرے متعلق لگاتے ہو۔“ اس نے مہاد کا کان ہی مروڑا۔

”اف بھائی! چھوڑ پس پلاسٹک کانٹیں ہے میرا پٹیا ہے۔“ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔

اور فہر نے اس کی اچھی خاصی درگت ہی بنا دی تھی۔ وہ اپنا بچاؤ کر کے تیزی سے بھاگ لیا تھا۔ فہر دوبارہ تکیے پر سر رکھ کے لیٹ گیا۔

نیل فر کے خیالوں سے وہ ذرا بھی نہیں ہٹا تھا۔ کنول کی زوردار تنبیہ اور سرزنش کی وجہ سے نیل فر کے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ کال بھی ایک دفعہ ہی کی تھی وہ بھی معافی مانگنے کے لیے مگر اس نے تو غصے اور نخوت سے اس کی کچھ سنی ہی نہیں تھی۔

”نیل فر! تم اتنی ظالم کیوں بن رہی ہو میری محبت اور وارفتگی کا ذرا اندازہ نہیں، میں کتنی شدتوں سے تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی غرض نہیں تم کون ہو میری سچی اور پاکیزہ محبت۔

میری محبت میں سچے جذبے ہیں

چاہت ہے دیوانگی ہے

صرف تمہاری چاہ کی تمنا ہے

مجھے جان لو میں صرف تمہارا ہوں

میں کسی کا ہو ہی نہیں سکتا

میری روح میں، تم شامل ہو

میری ہر سوچ اور خیال تم سے شروع ہوتا ہے۔ ہر وقت میں تمہیں اپنے آپس پاس محسوس کرتا ہوں۔

مجھے جس دن جان لوگی سمجھ لوگی تم خود میری پناہوں میں آؤ گی۔

مجھے یقین ہے کیونکہ میری پاکیزہ اور سچی محبت کا یقین ضرور آئے گا۔“

وہ آنکھیں بند کیے تصور جاناں کیے ہوئے تھا۔ آنکھیں کھولیں تو ایسا لگا وہ سامنے مسکراتی ہوئی اس کے قریب بیٹھی تھی۔

وہ بے اختیار ہی اٹھا ہاتھ بڑھایا اور وہ تصور خیال غائب۔

سر جھٹک کے وہ ہنسنے لگا۔

”بھئی تو تم اس روم میں میرے سامنے ہو گی۔“ وہ خود سے دل میں ہمکلام ہوا دروازے پر مہادی

زوردار دستک تھی، زہرہ اسے بلارہی تھیں وہ اٹھ گیا۔

☆.....☆

شہیر کی فیملی جب سے ان کے گھر آئی تھی۔ نگہت کچھ کچھ سمجھ گئی تھیں کیونکہ وہ رمضان سے مختلف قسم کے سوالات بھی کیے جا رہی تھیں اور شہیر کی بہن جیاء بھی رمضان سے بہت ہنس کے گفتگو کر رہی تھی۔ ذرا بھی ان کے انداز سے یہ نہیں لگ رہا تھا وہ اتنے بڑے اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سب سے بھی نارمل انداز میں ہی ملے تھے۔ نگہت تو ماں تھیں وہ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہر وقت دعا گورہتی تھیں۔ بیٹے کے کم ہو جانے کے بعد سے رمضان نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ ہی گھر کی ساری ذمے داریاں امن طریقے سے نبھا رہی تھی۔ وہ ایسی خود غرض ماں بھی نہیں تھیں جو بیٹی کی شادی کے بارے میں نہ

سوچیں، ان کی خواہش اور دعا تھی رمضان، شہیر جیسے لائق فائق لڑکے کو ہی ملے جو اسے سمجھے اور سنبھالے۔ اسجد بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا وہ پھر شہرہ کی بھی کر دیں گی۔  
مگروں میں جو بڑے بیٹے کھل جانے کی آس و امید ہر وقت رہتی وہ بھی معدوم ہونے لگتی۔ اتنے برس گزر گئے تھے اس کا کوئی اتنا پتہ نہیں تھا پرانے محلے میں اکثر اسی آس میں جاتی تھیں۔ شاید کبھی کسی سے پوچھنے آیا ہو۔

”امی..... امی!“ شہرہ نے گہری سوچوں میں مستغرق نگہت کو چونکا ہی دیا۔  
”آں..... ہاں.....“ وہ سنبھل گئی تھیں۔

”بہت گہری سوچ میں ہیں۔ حیرت تو کیا سوچ رہی تھیں۔“ وہ بھی تشویش بھرے لہجے میں فکر مندی سے پوچھنے لگی۔

”ارے کچھ نہیں۔“ وہ اپنے بچوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں۔  
”امی! کچھ تو ہے۔“ وہ توان کے پیچھے ہی بڑ گئی۔

”کہنا کچھ نہیں روٹی بنا لو، رمضان کھانا کھالے گی آفس میں کھاتی کب ہے۔“ الماری میں تہہ کیے کپڑے رکھنا اٹھ گئی تھیں۔

”آپی! نہار ہی ہیں جب تک میں بنا لوں گی۔“ وہ سمجھ گئی، امی نال رہی ہیں۔

نگہت دھلے ہوئے تہہ لگے کپڑوں کو الماری میں رکھنے لگی تھیں۔ شہرہ بچن میں چلی گئی تھیں اسجد بھی جانے آج کل کن چکروں میں لگا تھا۔ در سے گھر آنے لگا تھا۔ اس کی بھی انہیں رات دن فکر رہنے لگی تھی۔ ایک بیٹا تو کھو چکی تھیں دوسرے کی ہر وقت فکر رہتی۔

رمضان فریش ہو کے آگئی تھی۔ پر پل پر عذ ڈالان کے کپڑوں میں نوید احمد کے سامنے آ کے بیٹھ گئی تھی۔  
”ابو کیسی طبیعت ہے؟“ وہ ان کی دوائیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے بیٹا۔“ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ ہفتے میں تین دفعہ فزیو تھراپی کے لیے بھی بندہ آتا تھا۔ نوید احمد خود بھی واک کرتے تھے پھر رمضان ان کی خوراک پر بھی توجہ دیتی تھی۔

”شکر ہے اس مالک کا آپ کو صحت عطا کی۔“ رمضان تو ہر وقت شکرانے ہی بجالاتی تھی۔ شہیر فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا جس نے ابو پر اتنی توجہ اور محنت کی وہ اس قابل تھے خود سے اٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔

”آپی! کھانا کھا رہی ہیں۔“ شہرہ پوچھنے آئی۔

”ہاں آتی ہوں۔ یہ بتاؤ اسجد کہاں ہے تین دن سے وہ مجھے اس وقت گھر میں دکھائی نہیں دیتا ہے۔

نیوشن بھی وہ دن میں پڑھاتا ہے۔“ رمضان کو بھی اس کی غیر موجودگی حیران کر رہی تھی۔

”رات بھی بارہ بجے کے بعد آیا تھا۔“ نوید احمد بھی فکر مندی سے گویا ہوئے ان کے چہرے پر بھی ایک

سایہ سالہرا گیا۔

”بیٹا! اس کا پتا کرو کہاں جانے لگا ہے اگر میں کچھ بولوں گا تو کہیں دوبارہ میرا رویہ پہلے جیسا ہو جائے۔ ایک بیٹا تو میری سخت گیر طبیعت کی وجہ سے گھر سے چلا گیا۔“ ان کے لہجے اور آنکھوں میں دکھ و کرب پہچنتا ہوا تھا اس دن کے بعد سے ان کے مزاج میں ایسی تبدیلی آئی کہ ان کا غصہ اور تیز آواز کہیں دب گیا۔ چند سال



بعد فاج کا ایک ہوا تو سمجھو سدھ بدھ ہی کھو گئی۔ چلتا ہوا اسٹور بھی بند ہو گیا۔ کتنے کرائس میں گزرے دن پھر رمضان نے ہی اتنی چھوٹی عمر میں گھر کی ذمہ داریوں کو اٹھالیا وہ بھی کیا کرتے چپ رہے، کیونکہ گھر تو چلانا ہی تھا۔

”ابو! آپ اتنے پریشان نہیں ہوں میں پوچھوں گی آج۔“ رمضان نے انہیں اطمینان دلایا۔  
 شمرہ نے کھانا لگا دیا تھا نوید احمد کو نگہت نے ان کے کمرے میں ہی کھانا دے دیا تھا۔  
 رمضان کو اسجد کا انتظار تھا جو ابھی تک بھی نہیں آیا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ وہ مسلسل گھڑی کو بھی دیکھے جا رہی تھی۔

”بارہ سے پہلے نہیں آئے گا۔“ نگہت عشاء کی نماز پڑھ کے اپنے کمرے میں جانے لگی تھیں۔  
 ”امی! آپ ابو سے کچھ نہیں کہیے گا وہ بہت پریشان ہو رہے تھے۔“  
 ”مجھ سے انہوں نے پوچھا تھا میں نے زیادہ کوئی بات ہی نہیں کی کیونکہ ان کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہوں۔“ رمضان اپنی صبح کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ شمرہ اپنی پڑھائی کر رہی تھی۔  
 پونے بارہ کے قریب اسجد آیا تھا۔ وہ رمضان کو دیکھ کر گڑبڑا ہی گیا۔  
 ”کہاں سے آرہے ہو؟“ وہ تو اس پر غصہ ہی ہونے لگی تھی۔  
 ”ٹیوشن پڑھانے گیا تھا۔“ وہ نگاہ چرانے لگا۔  
 ”اسجد میں جانتی ہوں اتنی رات تک تو تم کوئی ٹیوشن پڑھا ہی نہیں سکتے۔“ اسے تو فکر ہو رہی تھی کیونکہ اسجد ابھی کم عمر ہی تھا اور ایسی عمر میں ہی لڑکے اکثر بگڑ بھی جاتے ہیں۔  
 ”آپنی! میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ یقین دلانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔  
 مگر رمضان بھی اس کی بہن تھی۔ وہ اس کا جائزہ لینے لگی۔ اسے کہیں تو کوئی گڑبڑ لگ رہی تھی۔ آج تو اس کے ہاتھ میں شاپر ز بھی تھے۔

”اس میں کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”وہ میرا کھانا ہے، ایک بچے کو پڑھا رہا تھا۔ اس کی امی نے باہر سے منگوا کے دیا تھا۔“ وہ نظریں ادھر ادھر کرنے لگا۔ رمضان نے دیکھا شاپر ز پر کسی مشہور ریسٹورنٹ کا نام لکھا تھا اور پارسل بکس تھے جس میں بریانی اور دوسرے میں سلاود وغیرہ تھی۔

”یہ پارسل ذرا مجھے بھی بتاؤ کون سا بچہ ہے۔“ وہ جانچتی پرکھتی نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔  
 اور اسجد کو جھوٹ پر جھوٹ بولنا وہ بھی اپنی بڑی بہن سے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چھ سے بارہ کسی ریسٹورنٹ میں جاب کرنے لگا تھا۔

”آپنی! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں کباب جی ریسٹورنٹ میں ریسپشن پر بیٹھنے لگا ہوں پانچ ہزار روپے مل رہے ہیں۔“

”کیا تم جاب کرنے لگے؟“ رمضان تو حیران رہ گئی۔  
 ”ہاں آپنی! آپ کب تک اکیلی ذمہ داریاں سنبھالیں گی۔ میرا بھی تو فرض ہے آپ سب کی ذمہ

داری سنبالوں۔“

”اسجد میرے بھائی ابھی تم بہت چھوٹے ہو، پڑھ رہے ہو۔“ رمضہ اس کے سنجیدہ اور پرسوج چہرے کو دیکھنے لگی جو کتنی جلدی اتنا سمجھدار ہو گیا تھا۔

”پڑھائی کے ساتھ جاب کرنا برائی نہیں۔“

”مگر تم ٹیوشن بھی تو پڑھا رہے ہو؟“ وہ اس کے ہاتھوں کو تھام کے افسردگی سے گویا ہوئی۔

”ٹیوشن بھی صرف دو ہیں اور شام سے رات تک کی یہ جاب بری نہیں ہے۔“

”تمہاری پڑھائی پر اثر پڑے گا۔ میں کرتوری ہوں تمہیں ابھی ضرورت کیا ہے۔“

”ایک دن آپ کو رخصت ہو کے چلے جاتا ہے۔ مجھے ہی ساری ذمہ داریاں سنبالنا ہیں۔ پڑھائی بھی میں کرتا رہوں گا اور آپ میں سے کسی کو بھی اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بھی تیز لہجے میں گویا ہوا۔

”اسجد! ابھی تم بہت چھوٹے ہو اور مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”آپی! بھائی چاہے بہنوں سے چھوٹے ہوں مگر مان ان کا بڑا ہوتا ہے۔ میں سمجھیے آپ دونوں سے ہی بڑا ہوں اور آپ دونوں کی شادی بھی میں کروں گا۔“ وہ یہ کہہ کر ان دونوں کے کمرے سے نکل گیا۔

شرہ اور رمضہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”اسے اچانک سے کیا ہو گیا ہے۔“ رمضہ تو حیرت و انبساط میں ابھی تک مبتلا تھی۔

”اچھا ہے نا ابھی سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگا ہے۔“ شرہ نے بھی تائید کی۔

”ابھی تو بہت چھوٹا ہے۔“

”مگر آپی! یہ آپ سوچتی ہیں مگر وہ ذہنی طور پر بہت بڑا ہو گیا ہے۔“ شرہ کو اسجد کی اس تبدیلی پر خوشی بھی ہوئی تھی۔ وہ بھی گھر کی ذمہ داریوں کو سنجیدگی سے سمجھنے لگا ہے۔

”رمضہ کو اپنے بھائی پر فخر بھی ہوا جو اتنا سمجھدار ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی خواہش تھی اسجد پہلے اپنی تعلیم پوری کر لے پھر ہی وہ جاب وغیرہ کی طرف آئے مگر گھر کے حالات تو وہ بھی جانتا تھا اسی لیے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔“

☆.....☆

نیل فرنے اچھی خاصی اپنی شاپنگ کر لی تھی مگر اس نے خالہ اور ان کے بچوں کے لیے ابھی گفٹ نہیں لیے تھے وہی سب لینے جا رہی تھی شہوار کو بلار ہی تھی۔

”جلدی کرو پھر شام ہو جائے گی۔“ نیل فراس کی تیاری دیکھ رہی تھی جو اپنے دراز بالوں کی چوٹی بنا رہی تھی۔

”ارے تھوڑا صبر تو کر لو۔“ اس نے اپنی تیاری پوری کی۔

”خالہ! گیٹ دیکھ بھال کے کھولے گا۔“ وہ جاتے ہوئے انہیں ہدایت بھی دے رہی تھی۔

پر پل کاٹن کے ٹراؤزر اور اس پر اسٹائلش شرٹ اور دوپٹہ میں نیل فراس کے کم نہیں لگ رہی تھی۔

نیل فرنے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ شہوار بھی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں شاپنگ مال کی طرف روانہ ہو گئی تھیں۔

”یاد سے سارا کچھ لے لو بار بار کے چکر میں نہیں لگا سکتی۔“ شہوار نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔  
 ”زیادہ اترنا نہیں۔“ گاڑی پارکنگ ایریے میں پارک کی اور دونوں لفٹ کی سائیڈ پر آ گئی تھیں۔  
 نیل فرنے کافی کچھ خالہ اور ان کے بچوں کے لیے لے لیا تھا۔ شہوار کو بھی زبردستی شاپنگ کروائی۔  
 دونوں کافی ڈھیر سارے شاپرز اٹھا کے نیچے جا رہی تھیں مگر نیل فردنگا ہوں کی زد میں تھی۔ شاپرز گاڑی میں رکھ دیئے تھے مگر شہوار پھر آج کہیں گم ہو گئی تھی وہ اسے ڈھونڈنے لگی۔  
 ”کہاں چلی گئی؟“ پارکنگ ایریے سے نکل کے وہ اطراف کا جائزہ لینے لگی اور روڈ پر آ کے کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا آج پھر کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔“ کسی کی گھمبیر آواز پر وہ چونک کے حواس باختہ ہو گئی۔  
 نیل فرنے جو وحشت زدہ ہو کے نگاہیں گھمائیں اس کا تو خون خشک ہو گیا۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا۔ فہر کے لب معنی خیزی سے مبرکار ہے تھے۔  
 ”آ..... آپ.....“ وہ تو سراسیمگی سے جو اٹے قدموں بھاگی اس نے یہ تک نہیں دیکھا۔ پیچھے دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کا ایک اٹھ دھام ہے۔  
 ”نیل فر۔“ وہ چیخا تھا۔

ایک گاڑی نے جو اسے ہٹ کیا تو وہ دور جاگری اور فہر اسے لگا اس کی دنیا ہی مر گئی۔  
 روڈ پر گاڑیوں کا ہجوم لگ گیا۔ ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔  
 گاڑی سے نکلنے والا ضیاء تھا جس کی گاڑی سے وہ ہٹ ہوئی تھی۔  
 ”ارے اٹھاؤ، اٹھاؤ۔“ لوگوں کا شور۔ فہر دوڑ کے گیا اور ضیاء تو وحشت زدہ حواس باختہ لڑکی دوسری گاڑی کے بونٹ پر جا کے گری تھی اور بے سدھ تھی۔  
 ”ضیاء یہ کیا کر دیا۔“

”اوہ مانی گاڈ۔“ فہر کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا ہو گیا۔  
 اور پھر شہوار بھی وہاں آ گئی۔ وہ تو برگر اور کوئلڈ ڈرنک لینے گئی تھی یہ کیا نیل فر اس نے تو چیخنا شروع کر دیا۔

”یہ پولیس کیس ہے۔“ وہ بولا۔

”ارے یہ سب بعد کی کارروائی ہے۔ اسپتال لے کے جانا ہے۔“ فہر نے جلدی جلدی ضیاء کی مدد سے گاڑی میں ڈالا۔ نیل فر کی حالت سیریس تھی خون بہہ رہا تھا۔  
 شہوار روئے جا رہی تھی۔ فوری طور پر اسے اسپتال میں ایڈمنٹ کیا گیا۔ دماغی چوٹ تھی، پچھلے حصے میں لگی تھی۔

(جاری ہے)

## فلم فیروزہ

سے پھسل گیا تھا وہ جیسے کسی آئل کی طرح تڑپ رہی تھی اس نے اس پر ترس کھا لیا تھا۔

☆☆☆☆

”جلدی اسائنمنٹ نہیں مل رہی یار“۔ وہ صبح گھر کی ایک ایک چیز کو نئے کھدرے کا اچھی طرح سے جائزہ لے چکی تھی آج اتوار تھا مگر اسائنمنٹ جمع کرانے کی کل آخری تاریخ تھی اپنا کام ہمیشہ مقررہ تاریخ سے پہلے کر لینے کی عادی تھی اس دفعہ بھی اس نے اپنی اسائنمنٹ وقت پر ہی تیار کی تھی مگر اب مل کے نہیں دے رہی تھی وہ ٹی وی لاؤنچ میں دھڑے صوفہ کم بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھی صبح فجر سے ہی اس کا سلسلہ تلاش اسائنمنٹ جاری تھی مگر معاویہ ابھی سو کر اٹھی تھی ہاتھ میں چائے کا گنگ پکڑے ٹی وی کے سامنے براجمان۔ خولہ جبران اور معاویہ سلطان میں زمین آسمان کا فرق تھا معاویہ بے حد کمزوری سانولے رنگ اور لمبے تڑنگے جسم کی مالک تھی وہ شاید قبول صورت لوگوں کی فہرست میں بھی کہیں بہت نیچے آتی تھی مگر خولہ جبران اس سے بالکل الٹ تھی سرخ و سپید رنگت، بھرا بھرا جسم ہاں مگر قد ان دونوں کا ایک ہی برابر تھا۔ ان ساری باتوں سے قطع نظر وہ بہترین سہیلیاں تھیں ایک دوسرے میں ان کی جان بستی تھی معاویہ سلطان خولہ کے پاپا کے بہترین دوست کی بیٹی تھی اس کی ساری فیملی کا ایک ایک سیکنڈ میں انتقال ہو چکا تھا وہ تب سے انہی کے ساتھ رہ رہی تھی یہ دو جڑواں کوٹھیوں والا گھر تھا جس میں ایک طرف خولہ کا خاندان رہائش پذیر تھا جبکہ دوسری

”تم میرا اعتبار کرو گے؟“ اس نے بڑی آس سے پوچھا تھا اور وہ حیران ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ جانتی تھی کہ اس کا جواب کیا ہونا چاہئے تھا یا پھر کیا ہوتا، وہ قدرے بے یقینی سے اس کے سامنے ایسا وہ تھا جو کچھ ہوا تھا وہ اس کے بعد بھی سمجھتی تھی کہ وہ اس پر یقین کرے گا وہ اس کی بات سننے کا تو شاید وہ بے وقوفوں کی جنت میں رہتی تھی یا پھر بے وقوفوں کی ملکہ تھی، مگر وہ ایک لچلے کے لئے رک سا گیا تھا سامنے نظر آتی سفید کٹنگی جو چاروں طرف سے سبزے سرخ گلابوں اور عشق پتیوں کی بیلوں سے گھری کسی شان و تمکنت سے کھڑی تھی جس کے عین وسط میں سفید ماربل سے سجافوارہ تھا اور فوارے کے پاس بڑی کین کی کرسیوں پر بیٹھے وہ دونوں جس میں سے ایک کے چہرے پر حیرانی اور الجھن تھی جبکہ دوسرے کے چہرے پر درج بے بسی اور آنکھوں میں اضطراب نمایاں تھا ایک عجیب سی بے چینی ہلکورے لے رہی تھی۔

”صرف ایک بار..... آخری بار“۔ وہ بے حد التجائیہ لہجے میں شاید اب منت پر اتر آئی تھی اس نے ایک ہنکارا بھرا تھا جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ حالات سازگار بالکل نہ تھے اب جبکہ اس کی شادی کو بھی محض دو ہفتے کا وقت بچا تھا اس طرح کا کوئی بھی ایڈونچر وہ انورڈ نہیں کر سکتا تھا مگر سامنے کھڑی وہ نجی سی لڑکی جس پر اسے بیک وقت بے حد غصہ بھی آرہا تھا اور ترس بھی وہ دو مختلف احساسات میں گھرا تھا ایک ترس اور ہمدردی کا دوسرا نفرت اور غصے کا۔

”ہاں مگر آخری بار“۔ جانے کیسے اس کے منہ



طرف والی کوٹھی میں اس کے تایا ابا رہتے تھے ان دونوں گھروں کو جس کی ڈیکوریشن ایک ہی جیسی تھی کو ایک مختصر سی پھولوں کی باڑ الگ کرتی تھی بے حد خوبصورت سرخ گلابوں کی باڑ۔

”تم نے کہیں دیکھی؟“ اب وہ اس مہم سے باقاعدہ تھک چکی تھی۔

”دیکھی ہوتی تو ضرور بتاتی۔“ اس کی نظریں ٹی دی رہیں اور لہجہ قدرے فکر مند لیے ہوئے۔

”تمہارے لیپ ٹاپ میں اس کی کاپی تو پڑی ہوگی وہاں سے دوبارہ پرنٹ لے لیتے ہیں یا۔ پھر

تمہاری یو ایس بی میں۔“ معاویہ کی بات پر اس نے سر پر ہاتھ مارا تھا یا خدا وہ کتنی بھگوانی وہ بھاگ کر اپنا

لیپ ٹاپ وہیں لے آئی تھی اس وقت وہ دونوں ہی گھر پر تھیں باپا کسی دوست سے ملنے نکلے تھے جبکہ مگی

مارکیٹ تک گئی تھیں لیپ ٹاپ آن کر کے اس نے سارا فولڈر چھان مارا مگر اسائنمنٹ نہ ملنی تھی نہ ملی ہو

ایس بی میں بھی نہیں تھی اب قدرے پریشان نظر آنے لگی تھی اب محض رونے کی دیر باقی تھی۔

”اب کیا کروں گی میں۔“ بے بسی سے بھرا لہجہ۔

”سرا حمر تو میری جان ہی نکال لیں گے پورے پندرہ نمبر ہیں اب اتنی جلدی دوبارہ کیسے بناؤں

میں۔“ ان کی اسائنمنٹ بنانا جان جو کھوں کا کام تھا اور ان سے نمبر لینا بے حد مشکل وہ تقریباً رو دینے کو تھی۔

”یہ تم جمع کر دینا میں کوئی اور جگاڑ لگا لوں گی۔“

معاویہ نے اپنی اسائنمنٹ ایسے دے دی تھی وہ ایسے ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں بے حد ہمتی دھوپ

میں جیسے خلیستان مگر اس وقت وہ تذبذب کا شکار تھی اگر اس کی محنت پر قابض ہو جاتی تو خود وہ کیا کرتی مگر

معاویہ نے یہ حد اصرار کیا تھا وہ اسے ٹالنا چاہتی تھی ٹال نہیں پاتی تھی۔

☆☆☆☆

وہ یونیورسٹی آف کولمبیا سے پڑھ کر واپس لوٹا تھا

عمر کا ہندسہ تیس تک بمشکل پہنچا ہوگا کہ اس نے پبلک پولیسی میں پی ایچ ڈی بھی کر لی تھی۔ وہ صرف ذہین

ہی نہ تھا بے حد ہنڈسم بھی تھا اونچا لمبا کڑیل جوان اس کی ماں اسے دیکھ کر ڈر جاتی تھی کہیں اس کے گھبرو کو

کسی کی نظر نہ لگ جائے دل ہی دل میں جانے لگتی سورتیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتی تھیں۔

”شالا نظر نہ لگے کسے دی میرے پتہ نوں۔“ وہ ہر وقت اسے نظر بد سے بچانے کے حیلے کرتی رہتیں

پورے پنڈ میں کوئی اس کی ٹکر کا نہ ہوگا وہ تو خود اسے جی بھر کر نہ دیکھتی تھیں۔

”میں وہی لاؤں گی ایسی جو سات پنڈوں میں نہ آئی ہوگی۔“ وہ بے مثال خوبصورتی والی بہو کی آرزو

مندھیں مگر ان کے بیٹے نے بڑی عجیب سی فرمائش رکھی تھی۔

”اماں! میں پڑھا لکھا ہوں یہی کافی ہے، بہو لانا جو زیادہ پڑھی لکھی نہ ہو اور اگر قبول صورت ہو تو یہ اس

کی ایک اور خوبی ہوگی مجھے اونچی آواز میں بولتی بحث کرتی عورتیں زہر لگتی ہیں مجھ سے کم ہوگی تو میرے

رعب میں رہے گی اور تیری خدمت بھی کرے گی۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا اور وہ تب بھی اس

کے واری صدقے ہی گئی تھیں امریکا سے پڑھ کر آیا تھا ان کا اکلوتا سپوت تھا مگر پھر بھی اسے کتنا خیال تھا

ماں کا اس کی پسند کے مطابق بہو ڈھونڈنے کی مہم کا انہوں نے آغاز کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

جانے کیسے معاویہ نے اپنی اسائنمنٹ اتنی عجلت میں تیار کی تھی مگر اسائنمنٹس بن بھی گئی تھیں اور جمع بھی

ہو گئی تھیں وہ ہمیشہ سے اپنی کلاس کے ٹاپرز میں سے رہی تھی پروفیسرز تا صرف اس کی اسائنمنٹس کو اچھے

ریمارکس دیتے تھے بلکہ وہ اکثر دوسرے طالب علموں کو کاپی کرنے کے لئے بھی دیتے تھے اس کے ٹاپکس

ہر لحاظ سے یونیک ہوتے تھے وہ بجا طور پر ایک

کہ وہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھی نہ وہ اتنی جلدی کسی بھی چیز سے شکست کھاتی تھی، بس یونہی کبھی کبھی دل چاہتا ہے ناں بندہ رک جائے دو گھڑی دو لمحے ایک لحظہ ٹھہر جائے۔

”میں اس وجہ سے پریشان نہیں ہوں کہ مجھے نمبر کم ملے وہ میری محنت تھی ہی نہیں اور جو کام میں نے اپنے ہاتھوں سے نہیں کیا اس کے لئے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی میں واقعی اداس ہوتی اگر میری محنت کا صلہ مجھے ایسا ملتا۔“ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی تھی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

”میں ہمیشہ اپنی چیزیں کم کر دیتی ہوں چاہے جتنی بھی سنبھال کر رکھوں۔“ پتا نہیں کیسی معنی خیزی تھی اس کے لہجے میں کہ ایک لمحے کے لئے وہ ٹھنک کر رک گیا تھا اس نے اپنی چائے کا کپ واپس میز پر رکھ دیا تھا بیگ اور فائل اٹھا کر عدی کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیئے بغیر وہ وہاں سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆☆

”پتا نہیں یہ کون مجھے لوکا پٹھا۔“ ابھی وہ فریش ہو کر زردام کو آکھ لگانے کے لئے لیٹی تھی ہی کہ اس کا موبائل بجنے لگا تھا وہ بلاشبہ کوئی راگ نمبر تھا وہ جتنے بھی اس کے نمبر بلاک کرتی وہ مختلف نمبرز سے فون کر کے اسے تنگ کرتا اتنا سلی تھا کہ محض Hi 150 پیغامات بھیج چکا تھا۔

”کیا ہوا؟“ معاویہ اپنے لپ ٹاپ میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

”پتا نہیں کون ہے بہت تنگ کر رہا ہے۔“ اس نے شرمندگی سے بتایا تھا معاویہ بھی جانے کیا سوچتی ہوگی کہ دنیا جہان کے سارے حادثے بس اسی کے ساتھ ہوتے تھے۔

”دفعہ کرو تم کوئی نوٹس نہ لو خود ہی جھوٹ دے گا۔“ وہ لاہروائی سے مخاطب تھی پھر کافی دن گزر گئے مگر یہ سلسلہ ٹھہرا نہیں تھا اب تو وہ سنجیدگی سے اس نمبر کو

انفرادیت پسند لڑکی تھی اتنی محنت سے بنائی گئی اسائنمنٹ نہ صرف کم ہو گئی تھی بلکہ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ پروفیسر احمر نے تقریباً اس کے منہ پر مارنے والے انداز میں اسائنمنٹ اسے واپس کی تھی۔

”اس پروجیکٹ کے پندرہ تو کیا زیرو بھی نہیں بننا مگر میں پھر بھی آپ کو آدھے نمبر دے کر پاس کر رہا ہوں۔“ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بانیوں سے بھر گئی تھیں وہ کلاس ختم ہوتے ہی باہر نکل آئی تھی کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر حتیٰ کہ معاویہ سے بھی کچھ کہے بغیر، ویسے بھی اس میں اس بے چاری کا کیا قصور تھا اس نے تو نیک نیتی سے ہی اپنا کام اسے دیا تھا آگے جو بھی ہوا اس کی قسمت تھی وہ سائپز میں پڑی کرسی ٹھسٹ کر چپ چاپ بے دھیانی سے ادھر ادھر کیکنے لگی تھی۔

”اداس ہو؟“ عدی کرسی دھکیل کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”وہ بخوبی جانتا تھا کہ کلاس میں کیا ہو رہا تھا۔“

”نہیں بس ایسے ہی،“ کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں ایسے جن سے ہم اپنے دکھ کھ خوش غم حتیٰ کہ دل کے نہاں خانوں میں چھپی باتیں بھی نہیں چھپا سکتے عدی سے وہ کچھ بھی نہیں چھپا سکتی تھی وہ اس کا دوست تھا، امد تھا، ہمز تھا۔ اس سے ایسے جڑ گئی تھی کہ جیسے کوئی بہت الٹو بندہ جن میں جڑے ہوں وہ دونوں وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیوں اس کا دل ہمک ہمک کر صرف عدی کی ہی خواہش کرتا تھا کیوں صرف اسی کے لئے دھڑکتا تھا حالانکہ ایسے کوئی عہد و پیاں بھی نہ ہوئے تھے ان دونوں کے درمیان۔

”تمہیں پتا ہے خولہ! کہ تم کتنی باصلاحیت ہو تو بھی کبھی اگر ہم اپنی امیدوں پر یا پھر کسی اور کی امیدوں پر پورا نہیں اترتے تو بالکل نارمل ہے، خیر ہے یا راب مجھے پتا ہے تم اگلی دفعہ اس سے اچھا کرو گی۔“ وہ محض اسے تسلی نہیں دے رہا تھا مگر وہ جانتا تھا



درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ چکی تھی اس نے بھی کی تقلید کی تھی۔  
 ”میں نے تمہیں کچھ نمبرز ایس ایم ایس کئے  
 یہ پچھلے کچھ دنوں سے میرا قلم بند کئے ہوئے ہیں  
 پلیز پتا تو کرو۔“ وہ بخور ان نمبرز کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆

اس نے جیسی لڑکی کی خواہش کی تھی ویسی ہی اس  
 ڈھونڈ لائی تھیں اور ملتی بھی کیوں ناں اس میں کوئی  
 نہیں تھی وہ عادات اطوار میں یکتا تھا اسے تو اچھے  
 اچھے خاندان بیٹی دینے کو تیار تھے جہیز سے خوبصورت  
 لڑکیاں اس کی ایک محض ایک نظر التفات کو ترستی تھیں  
 مگر وہ بے نیاز بنا گھومتا رہتا تھا جیسے وہ یہ سب  
 سے نہیں کسی اور کے لئے کرتی تھی وہ بس واجبی  
 شکل و صورت کی تھی گاؤں کے پرائمری اسکول۔

اس نے پانچ جماعتیں پڑھی تھیں پھر نہ گاؤں  
 اسکول تھا نہ کسی نے ضرورت محسوس کی ساتھ ہی گاؤں  
 والی آپاجی سے قرآن پاک بھی پڑھ لیا آپاجی  
 سے برتن دھولواتیں تو کسی سے جھاڑو لگوائی اور ساتھ  
 ساتھ سپارے کا سبق بھی پڑھاتیں یوں آپاجی کا کام  
 بھی ہو جاتا اور بچے کا بھی۔ اس کی ماں ہمہ وقت  
 کڑھتی رہتیں کہ جانے کیسے اس کا بیاہ ہوگا مگر جب  
 قسمت کھلی تھی تو ایسی نصیبوں والی بن کر ابھری تھی

سب کے لئے بچہ ہی تھا جانے رب نے کیا  
 چھپا رکھے تھے وہ جو کسی گنتی میں ہی نہ آئی تھی نہ تیرہ  
 میں نہ تیرہ میں اب ہر کوئی اسے رشک و حسد کے  
 جلع جذبات سے دیکھتا تھا اس کلوی کیا قسمت کھلی  
 جھٹ مٹنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا اور وہ محض  
 مہینوں کے اندر اندر ہی بیاہ کر پیدائیس سدھار گئی تھی  
 نت نئے رنگوں کے خواب بجوائے جانے کتنے ارماں  
 قید تھے اس کے دل کے نہاں خانوں میں مستقبل  
 کے اجالوں سے بھری آنکھیں مگر گھونگھٹ اٹھا  
 سے بھی پہلے اس کے خوابوں کو چور چور کر دیا تھا

ٹریس کروا کر اس بندے کو سبق سکھانے کا سوچ رہی  
 تھی اس نے سوچا تھا فون پر بتانا مناسب نہ ہوتا اس  
 لئے وہ عدی سے مل کر بات کرے گی اسی سلسلے میں وہ  
 کلاس سے نکلتے ہی معادیہ کو لاہری چھوڑ کر خود عدی  
 کو ڈھونڈنے نکلے تھی جو نجانے کلاس ختم ہوتے ہی  
 کہاں غائب ہو گیا تھا ابھی وہ اپنے بلاک سے نکل کر  
 ایڈمن کی طرف جا ہی رہی تھی کہ اسے عدی ایک  
 طرف سے حواس باختہ بھاگتا ہوا دکھائی دیا تھا۔

”تم کس کے ساتھ تھیں؟“ وہ محض دو چار جست  
 میں اس کے پاس تھا اس کا سانس پھولا ہوا تھا جیسے  
 وہ سر پٹ بھاگتے ہوئے آیا ہو۔

”میں کس کے ساتھ تھی؟“ الٹا وہ اس سے پوچھنے لگی۔  
 ”وہی تو میں پوچھ رہا ہوں؟“ وہ جھلایا تھا کوفت  
 کے مارے۔

”میں تو تمہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی۔“  
 ”مجھے کسی نے بتایا کہ تم اپنے منگیتر سے ملنے گئی  
 ہو اس لئے تو میں بھاگا بھاگا آیا خیر کسی نے مذاق کیا  
 ہوگا۔“ اس کی سانس بحال ہوئی تھی دل کے نہاں  
 خانوں میں جیسے سکون اتر آیا تھا یہ خبر سن کر تو جیسے اس  
 کے اندر تک مردنی چھا گئی تھی۔  
 ”اتنا گھٹیا مذاق۔“ وہ چیخی تھی۔  
 ”کس نے کیا تم سے؟“

”میں تو یہ خبر سنتے ہی حواس باختہ ہو گیا کہ میں  
 شکل و دھیان سے دیکھتا کہ کون کہہ رہا ہے۔“ واقعی  
 اس وقت اس کا سارا دھیان بات پر تھا بات کہنے  
 والے پر نہیں۔

”تم بھی ناں۔“ وہ ہنوز غصے میں تھی۔  
 ”کم از کم شکل تو دیکھ لیتے میں خوب لے لیتی۔“  
 وہ دل موس کر رہ گئی اسے شاید پتا تھا مگر اسے بتانا  
 نہیں چاہتا تھا وہ کچھ سوچ کر چپ کر گئی تھی۔

”تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟“ وہ یونہی  
 راستے میں کھڑے تھے خولہ آہستگی سے چلتی ہوئی

نے“ کرچی کرچی اس کی آنکھوں میں جھپٹے لگی تھی یوں جیسے وہ تپتے صحرا میں آکھڑی ہوئی تھی، اس کی پائیں ”میں“ سے شروع ہو کر ”میں“ پر ہی ختم ہوئی تھیں، جانے کتنے آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں سے ہوتے ہوئے اس کے بھاری کاندانی لہنگے کی ریشمی نقابوں میں گم ہوئے تھے بے حدود بے حساب بے تعداد۔

☆☆☆☆

وہ دونوں اپنا اپنا چالان فارم بھر رہی تھیں، سرمئی شام اپنے پورے جوہن پر تھی، لاؤنچ کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں، ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا کی وجہ سے پردے سرسرا رہے تھے، مٹی کل وقتی ملازمہ کے ساتھ کچن میں تھیں جبکہ پاپا اس وقت اپنی لائبریری میں ہوتے تھے، دی وی چل رہا تھا اور وہ دونوں اپنی مخصوص جگہ صوفے کم بیڈ پر بیٹھ کر اپنے نئے سیکسٹر کی فی اور دوسری معلومات بھر رہی تھیں، خولہ نے اپنا چالان فارم مل کرنے کے بعد اپنے بیک کونکالا تھا جس میں اس نے اپنی منی رکھی تھی، مگر اگلے ہی لمحے اسے ہزار والٹ کا جھٹکا لگا تھا کیونکہ اس کے والٹ میں پیسے نہیں تھے اس نے پاگلوں کی طرح اپنے بیک کا ایک ایک کونہ جھان مارا تھا مگر پیسے ہوتے تو ملتے ماں۔

”کیا ہوا؟“ معاویہ نے فارم ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں“۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی مگر کچھ سوچ کر خاموش رہ گئی، اس نے نفی میں سر ہلایا تھا آج کل ’ہائے عجیب عجیب سے واقعات محض اسی کے ساتھ کیوں ہو رہے تھے، جتنی بھی بری خبریں تھیں وہ اندکی طے کئے بیٹھی تھی کہ خولہ جبران ہی کے ساتھ توڑ پڑ ہو نا تھیں، کل ہی پاپا نے اسے اور معاویہ کو ہسپتال کے پیسے دیئے تھے اس نے خود بڑے احسان سے انہیں سنبھال کر بھی رکھا تھا مگر اب مل کر لکھن دے رہے تھے وہ اپنا بیک اٹھا کر بنا کچھ بھی

کہے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔  
”ہیلو عدی“ ایک مسئلہ ہو گیا۔“ اس نے عدی کو فون کیا تھا۔

”جی بتاؤ۔“ وہ بھی ہمہ تن گوش تھا۔  
”یار میری فیس کے پیسے گم ہو گئے ہیں۔“ اس نے شرمندگی سے بتایا تھا گویا وہ مسائل کا پنڈورا باکس ہو کوئی لڑکی نہیں، آئے دن کچھ نہ کچھ اس کے ساتھ ایسا ہوتا ہی رہتا تھا، جو نہ صرف عجیب و غریب ہوتا اور اس کی مشکلات میں اضافہ کرتا بلکہ وہ اکثر سوچتی ایسی کوئی نئی دشمنی پال لی تھی اس نے۔  
”میں کچھ بندوبست کروں؟“ وہ سنجیدہ تھا مگر خولہ نے انکار کر دیا۔

”میں پیاسے دوبارہ مانگ کر ڈانٹ نہیں کھانا چاہتی۔“ اصل ذرا سی چیز کا تھا۔

”میری چھین ہے میں نے خود پیسے جمع کر کے خریدی تھی میں سوچ رہی ہوں وہ سیل کردوں اتنے پیسے تو آ ہی جائیں گے۔“ اس نے اپنے دل کا خیال عدی کو بتایا تھا جو اسے ذرا نہیں بھایا تھا وہ اسے ٹوکنا چاہتا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ بلاشبہ خولہ کی خودداری اسے اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ عدی سے اتنے سارے پیسے لے کر وہ سوچ رہا تھا کہ جہاں بھی جا کر وہ چین بیچے گی وہ وہاں سے خرید کر اپنے پاس محفوظ کر لے گا اور پھر کسی مناسب موقع پر اسے واپس کر دے گا خولہ نے جب اسے خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا تھا تو اسے دروازے پر ایک کھٹکا سامسوس ہوا تھا، وہ موبائل بیڈ پر پھینک کر دروازے کی سمت بھاگی تھی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆☆

پھر اس کی چین بھی بک گئی تھی، اس نے فیس بھی ادا کر دی تھی، مگر یہاں عدی سے چوک ہو گئی تھی وہ وقت پر جا کر چین نہیں خرید پایا تھا اور وہ کسی اور نے خرید لی تھی اور اب یہ خولہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی

کہ چین اس کے اپنے پایا جبران احمد نے ہی خریدی تھی ایک عدالت لگی تھی اس گھر میں۔  
 ”یہ کیا ہے؟“ وہ انتہائی خشکیوں نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے وہ ایک ٹائیٹ کے لئے اتنی حواس باختہ ہوئی تھی کہ اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔  
 ”چین“۔ ان کا غصہ دو چند ہوا تھا۔

”وہ مجھے بھی بتاے مگر چور کے پاس کیا کر رہی تھی؟“ اب وہ بچ نہیں سکتی تھی سو مجبوراً ساری کہانی انہیں سنانی پڑی تھی، اقرار جرم کے بعد اس نے سر جھکا کر پایا کی لعن طعن سنی تھی اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا مگر وہ مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی کہ آخر پایا کو بتایا کس نے ہوگا؟ کیونکہ اس نے تو عدی کے علاوہ اور کسی کو بھٹک بھی نہیں لگنے دی تھی حتیٰ کہ عدی کو بھی کہہ دیا کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی مگر پھر بھی پایا کو پتا چل گیا یعنی ان کی سی آئی ڈی بے حد اسٹرونگ تھی۔  
 پھر بہت سارے دن یونہی گزر گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ خولہ کی زندگی قدرے ڈگر پر آگئی تھی سکون اور خیریت جیسا احساس تھا مگر یہ شاید طوفان سے پیشتر والی خاموشی تھی۔

☆☆☆☆

”معاویہ میں کیا کروں کوئی نیکی نہیں مل رہی آج ہڑتال ہے اور میرا یونیورسٹی پہنچنا بھی بے حد ضروری ہے میں اپنا مڈ ٹرمس نہیں کرنا چاہتی ہوں تمہیں پتا ہے ناں ورنہ میں قتل ہو جاؤں گی۔“ وہ بے حد روہا سی بی بول رہی تھی وہ معاویہ کے ہی کام سے یہاں آئی تھی مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ آج ہڑتال تھی ورنہ وہ ڈرائیور کو ہی روک لیتی مگر اب وہ بھی پایا کو لے کر جا چکا تھا ان لوگوں کو جانا بھی انک تھا ورنہ شاید اتنا وہ نہ ڈرتی۔

”تم رکو میں کچھ کرتی ہوں۔“ معاویہ نے اس سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔  
 ”میری دوست کا بھائی ہے وہ F-7 میں ہی ہے

وہ تمہیں وہاں سے لے کر یونیورسٹی چھوڑ دیے گا۔“ کچھ ہی لمحے بعد معاویہ نے دوبارہ کال کر لی تھی اس نے اس آدمی کا نمبر بھی نیسٹ کر دیا تھا تو اس نے سکون کی سانس لی تھی کچھ ہی ثانیے میں گاڑی ایک اس کے سامنے یوں آ کر کھڑی ہوئی تھی جیسے وہ مدت سے شناسا ہو اس کا وہ قدرے حیران تھی۔

”پلیز آگے آ کر بیٹھے۔“ وہ پچھلا دروازہ کھولنے ہی لگی تھی جب اس نے فرنٹ ڈور کھول کر بڑے شائستہ انداز میں کہا تھا، اس نے چند ثانیے کھڑے رہ کر کچھ سوچا تھا اس کے بعد وہ آگے بیٹھ گئی تھی۔ جب یونیورسٹی پارکنگ میں گاڑی داخل ہوئی تھی تو عدی اور معاویہ پہلے سے وہاں موجود تھے معاویہ نے شکر کا سانس لیا تھا کہ وہ پیر سے پہلے ہی پہنچ گئی تھی مگر عدی کی آنکھوں میں واضح الجھن تھی جو اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی یہ وہی آدمی تھا جس کا نمبر خولہ نے اسے دیا تھا جب اس نے بس ٹریس کروایا تھا تب اس کی لاتعداد وارننگز کے باوجود یہ ذہین شخص مان کر نہیں دے رہا تھا تب اس نے اس کی ٹھکانی کی نیت سے اس سے ملاقات کی تھی، اور خدا گواہ تھا کافی مار بھی پڑوائی تھی اور اب خولہ اسی کی گاڑی سے اتر رہی تھی ماجرہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆☆☆☆

”خولہ! مجھے یقین نہیں آ رہا تم مجھ سے جھوٹ بولو گی۔“ وہ ڈھابے میں بیٹھ کر اپنی پسندیدہ چائے سے ابھی لطف اندوز ہونے ہی والی تھی کہ عدی اس کے سر پر آ پہنچا وہ اب خشکیوں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔  
 ”میں نے کیا کیا؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس معصومیت سے شاید کچھ بھی جانتا مگر آج معاملہ کوئی اور تھا۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔“ اس کی آنکھوں میں دکھ تھا، یہ ایک چیز وہ کبھی بھی خولہ سے امید نہیں رکھتا تھا۔

”کیا جھوٹ؟“ اس کی آنکھوں میں حیرانی اتری تھی کل وہ عدی سے یونیورسٹی میں ہی ملی تھی اس کے بعد نہ اس نے کوئی فون یا میسج کیا تھا اور نہ ہی دوبارہ ملاقات ہوئی تھی کجا کے جھوٹ۔

”کیا مسئلہ ہے بھئی؟“ وہ سختی سے بولی تھی آئے دن کے مسئلوں سے وضاحتوں سے وہ واقعی تھک گئی تھی اسے بھی احساس نہیں ہوا تھا اپنے لہجے کی تندگی کا۔

”کچھ نہیں۔“ کچھ ٹانے وہ رکا تھا شدت جذب سے اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں

پوست ہو گئے تھے پھر وہ تیزی سے ڈھابے سے باہر نکل گیا تھا اس نے کل شام کو خولہ کو ٹیکسٹ کیا تھا کہ آیا وہ اگر شام کو فارغ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے وہ اس

سے ملنا چاہتا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ اسے اپنے انکل کے پر سے کے لئے جانا ہے مگر پھر

جب وہ کسی کام سے F-8 گیا تو اس نے خولہ کو وہاں شاپنگ کرتے دیکھا تھا اگر وہ فارغ نہیں تھی یا وہ ملنا نہیں چاہتی تھی تو اسے جھوٹ پونے کی کیا ضرورت

تھی وہ اس کے لئے بہت خاص تھی بہت انمول بہت پیاری وہ اپنی ڈگری ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا

کیونکہ وہ دوران تعلیم نہ خود ڈسٹرب ہونا چاہتا تھا نہ ہی خولہ کو کرنا چاہتا تھا مگر اب اسے لگتا تھا کہ اسے خولہ

کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دینا چاہئے کیونکہ وہ ایسے ہی جذبات اس کی آنکھوں میں بھی دیکھ رہا تھا

مگر پھر بہت سارے دن گزر گئے اور وہ دونوں ایک دوجے سے منہ پھلائے پھرتے رہے نہ اس نے بلایا

نہ وہ پاس آئی نہ کوئی وضاحت دی نہ کوئی شکوہ کیا بعض اوقات ہمارے پاس دلائل کے ڈھیر ہوتے

ہیں مگر ہم پھر بھی چپ کر جاتے ہیں کیونکہ اگلا سننے کے موڈ میں نہیں ہوتا یا پھر شاید وہ بندہ ہمیں ہمارے

پراؤڈ سے ہمارے دلائل سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ اسے اپنے خولہ کے بیچ ایک نام تمام ہونے والی

دیوار دکھائی دیتی تھی اسے لگتا فاصلے اتنے گہرے تھے کہ وہ انہیں پاٹ نہیں پائے گا مگر دل ایسی بلا کا نام ہے کہ ایسی جگہ لاکھڑا کرتا ہے کہ آگے کنواں پیچھے کھائی نظر آتی ہے محبت کن من برستی برکھا کی طرح ہوتی ہے آہستہ آہستہ مگر نامعلوم من کی دھرتی کو سراب کر ڈالتی ہے محبت روشنی کی طرح ہوتی ہے ہمیشہ آس پاس وہ جو مسکوں کا پڑا بھی جس کے ساتھ جانے کب کیا ہو جاتا تھا وہ اس کی محبت میں پور پور ڈوب رہا تھا دنیا کی کوئی چیز اسے اس سے بدگمان نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆☆

وہ جب پہلی دفعہ ماں بننے جا رہی تھی تو اسے واشگاف الفاظ میں بتا دیا گیا تھا کہ اسے صرف بیٹے

کی ماں بننا ہے بیٹی کے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی اور بیٹی کی ماں بننے کی صورت میں اس کے لئے

بھی مگر اس کے لئے زمین ابھی تنگ تھی وہ یکے بعد دیگرے پانچ بیٹیوں کی ماں بنتی چلی گئی اور دائرے

رہے قسمت کے وہ بھی صورت میں بھی اس پر ہی پڑ گئی تھیں شکل و صورت تو خیر جو بھی جیسی بھی مگر وہ

قسمت کی دھنی بھی اسی کی طرح نکلی تھی وہ کبھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹیاں اسی کا پوتہ ہوں مگر یہ بیچ تھا

وہ پیدائش سے ہی اپنی ماں کو چٹنے ہوئے دیکھتی آرہی تھیں تب انہیں لگتا ان کا باپ کوئی بہت بڑا

جابل ہو گا جس نے کبھی کسی درسگاہ کی شکل تک نہ دیکھی ہوگی مگر وہ جانتی نہیں تھیں کہ کبھی کبھی جو نظر آتا ہے ویسا ہوتا نہیں۔

☆☆☆☆

چڑیا بار بار اپنی چونچ ہلا رہی تھی پتیل کے پیڑ کی ڈال اچانک بے ہنگم سے ہلنے لگی تھی جیسے اس سے

کچھ کہنا چاہتی ہو اس نے پیالے میں پانی بھرا تھا اور دوسرے میں باجرے کے دانے اور دونوں چیزیں

ایک ترتیب سے منڈیر پر رکھ چھوڑی تھیں چڑیا اب

پڑھتے ہی اس نے دوسری طرف ڈائل کیا تھا مگر نمبر بند آیا تھا، ڈر خوف بے بسی غصہ جانے کتنے جذبول نے بیک وقت اس پر حملہ کر ڈالا تھا، وہ رات اس نے انتہائی بے قراری سے گزاری تھی اگلی صبح وہ انتہائی بددلی سے یونیورسٹی گیا تھا اگر اہم کلاس نہ ہوتی تو شاید وہ جاتا ہی نہ۔

”کیسے ہو؟“ وہ اسے پارکنگ میں ہی ٹکرا گئی تھی۔ انتہائی نارمل اسے جھٹکا لگا تھا۔  
”کیسے بے نیاز بنے پھرتے ہیں یہ ستم گر؟“ وہ جھنجھلا سا گیا تھا جیسے خود سے ہی لڑ رہا تھا۔

”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ اس کے خوابوں کا شہزادہ بالکل اس کے سامنے ایستادہ تھا، وہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھنا چاہتی تھی، وہ تھک گئی تھی انتظار کرتے کرتے وہ جذبے جو اس کی آنکھوں سے عیاں تھے اگر وہ انہیں بول نہیں رہا تھا یا شاید بول پاتا نہیں تھا تو وہی ہمت کر لیتی اور اس نے وہ ہمت نیچا کر بھی لی تھی، مگر وہ آج ایسے کیوں بول رہا تھا، اکھڑا اکھڑا بے زاری اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی۔

”مجھے کچھ نہیں سننا اور ہٹو میرے راستے سے۔“ وہ بے حد درشت تھا۔

”کیا ہوا عدی؟“ وہ حیران تھی۔  
”دوبارہ کبھی میرے راستے میں مت آنا سمجھیں۔“ اس نے اس کو دونوں کندھوں سے سختی سے پکڑا تھا وہ محض ٹپ کر رہ گئی تھی۔

”کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا، نفرت ہے مجھے تم سے۔“ وہ اس کے دو غلے پن پر چراغ پاتا، جیسے سختی سے پکڑا تھا، لگتا تھا اسے ماری ڈالے گا مگر یک لحظ ہی اس نے اسے چھوڑ دیا تھا، اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا تھا، شہر تنہا بننے سے پہلے ہی لٹ گیا تھا۔

☆☆☆☆

مطمئن سی دانا چنگے میں منہمک ہو گئی تھی عدی نے گہرا سانس خارج کیا تھا، کوئی راستہ کوئی سبیل دکھائی نہیں پڑتی تھی اسے لگتا جیسے وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو جیسے کوئی نادیدہ طاقت اسے کھینچ کھینچ کر خولہ جبران سے دور لے جاتی ہو، جیسے کسی چھوٹے بچے کی طرح ہمک ہمک کر وہ اس کی طرف بھاگتا ہو جیسے بچپن میں ہم اپنی پسندیدہ چیز کی طرف بے قراری سے بھاگتے ہوں اور وہ ہم سے اتنا ہی دور ہو جاتی ہو یا پھر ماں ہمیں کھینچ کر اس سے فاصلے پر لے جاتی ہو۔ وہ اپنے ہی اندر جاری اس جنگ سے قدرے گھبرا سا گیا تھا اس لئے اس نے کھل کر خولہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور وہ شاید قبولیت کی ہی گھڑی تھی کہ اسے خولہ کے نمبر سے ہی پیغام موصول ہو گیا تھا یہ نمبر اس نے تھوڑا عرصہ پہلے ہی لیا تھا اور شاید اس کے علاوہ کم ہی لوگوں کے پاس تھا۔  
”خولہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“  
”ہاں کہو!“ دوسری طرف سے فوراً جواب آیا تھا۔

”ایسے نہیں مل کر۔“ وہ کوئی بھی ایسی بات موبائل پر نہیں کرنا چاہتا تھا۔  
”نہیں یار! ایسے ہی بولو ناں۔“ وہ بے صبری سی ہوئی تھی۔

”پلیز یار!“ اس نے التجا کی تھی۔  
”بتاؤ ناں۔“ وہ اصرار کر رہی تھی۔  
”تم ہی ہو میری فیری لینڈ کی فیری، تم ہی ہو جسے دیکھ کر میری سانسیں رک جاتی ہیں، تم ہی ہو جسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بند ہو جاتا ہے تم سے پوری شدت سے مجھے محبت ہے خولہ۔“ اچھا خاصے لمبے پیرائے میں لکھا ہوا پیغام موصول ہوا تھا دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی وہ بے حد ڈر گیا تھا۔  
”کچھ تو کہو پلیز۔“

”میرے دل میں ایسا کچھ نہیں ہے۔“ جواب

کہ اسے کیا ہوا تھا یا پھر وہ کیوں رورہی تھی؟ اس کے ذہن میں ایک عجیب سا چھنا کا ہوا تھا پل میں بہت سارے منظر روشن ہو گئے تھے۔

☆☆☆☆

میرا نام خولہ جبران ہے، جبران احمد کی اکلوتی دختر نیک اختر بچپن سے ہی میں نے اپنے ماما پاپا کا بے تحاشہ پیار لاڈ مان سب پایا، میں نے جس چیز پر بھی انگلی رکھی وہ مجھے میری خواہش سے بھی پہلے ملی اور اب میں ایسے مقام پر شکست خوردہ کھڑی تھی کہ وہ ضرب اللہ آج درست لفظوں میں سمجھ آئی تھی وہ جو کہتے ہیں نا آگے کنواں اور پیچھے کھائی تو میں اسی کیفیت میں کھڑی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا، اور بے یقینی کا عالم میں نے وہاں سے مات کھائی تھی جہاں سے میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ مات میرا مقدر ہوگی مگر میں ہار چکی تھی جب معاویہ کی شکل دیکھتی ہوں تو میں مزید بے یقینی کی کیفیت سے گزرنے لگتی تھی وہ لہسا کرے گی، معاویہ سلطان جو میری بہترین دوست تھی جو میری ہمارا میری دوست تھی جو میری نمکداس تھی وہ میرے پیچھے ایسا کھیل کھیل رہی تھی جب پاپا اسے لے کھائے تھے تب میں خوش ہوئی تھی، اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہ کر بھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ میرا بھی کوئی بہن بھائی ہوتا میں اس سے سب کچھ شیر کرتی اور میری یہ دعائیں مجھے لگا تھا معاویہ کے روپ میں سند قبولیت سے نوازی گئی تھیں مگر یہ میری خام خیالی تھی شدید خام خیالی۔ میں اس رخ پر تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی اگر اس دن کسی کام سے سراسر کے دفتر نہ جاتی تو شاید میں کبھی نہ سمجھ پائی جو میرے ساتھ ہو رہا تھا جو میرے لئے محض اتفاق سے زیادہ کچھ نہ تھا اس اتفاق کی باقاعدہ اس نے پلاننگ کی تھی، مجھے سراسر سے کچھ پوائنٹس ڈسکس کرنے تھے جب میں ان کے آفس گئی تو یونہی ان کے منہ سے پھیل اٹھا۔

”وہ مر گیا ہے“۔ معاویہ نے ہلکی سی سرگوشی کی تھی شاید وہ خود کو یقین دلارہی تھی گھر میں بڑی باقی چھ لاشیں جو اس کی ماں اور بہنوں کی تھیں کہیں غائب ہو گئی تھیں یاد رہا تھا تو بس یہ کہ وہ جو بے رحمی سے ہر روز بلاناغہ اس کی ماں کو چاٹو روں کی طرح مارتا تھا، وہ مر گیا تھا، اس کے پاپا نے اپنے دوست کی طرف مجبوراً جانے کا پروگرام بنایا تھا، انہوں نے از حد اصرار کے ساتھ اپنی بیوی اور بچیوں کو بھی لانے کا اصرار کیا تھا ورنہ وہ بھی ساتھ نہ لے کر جاتا، لمبے سفر کے لئے دین ہار کی گئی تھی مگر راستے میں ہی سیلنڈر پھٹنے کی وجہ سے جیسے معاویہ کا سنسار ہی اجڑ گیا تھا۔ وہ ہی واماں تھی دست رہ گئی تھی، جب اس کے سگے ماموں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا، سب کی نظریں اس کی جائیداد پر تھیں تب ہی خولہ کے پاپا جو اس کے پاپا کے دیرینہ دوست تھے نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا تھا، حویلی کو تالا لگ گیا تھا، زمینیں ٹھیکے پر دی گئیں اور وہ اپنے پوریا بستر سمیت اسلام آباد۔

☆☆☆☆

اس دن وہ یونیورسٹی سے گھر آ کر بہت روئی تھی، شہر تنہا کے لئے کی کک، جتنی عمر کے خوابوں کے ٹوٹنے کا دکھ اور ہزار کونے اپنے لئے کہ کیوں محض مدی کی وقت گزاری کو اس نے محبت کا نام دے لیا تھا، اس نے کتاب پر سے نظر ہٹا کر آنکھیں بند کر لی تھیں ایک خوبصورت باب شروع ہونے سے ہی پہلے اپنے انجام کو جا پہنچا تھا، وہ اک دعا جو میری نامراد لوٹ آئی زبان سے روٹھ گیا پھر سوال کا موسم گرم سیال مادہ اس کے گالوں پر پھیل رہا تھا جیسے آنکھیں کھول کر اس نے بے دردی سے مسلا تھا، آدھ کھلی آنکھوں سے اس نے سامنے سنگل صوفے پر بیٹھی مطمئن سے لبوں پر ہلکی سی مسکان سجائے بیٹھی معاویہ کو دیکھا تھا اس نے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا تھا

”یہاں کچھ پرنسپل پڑے ہیں ان میں دیکھو تمہارے ٹاپک سے متعلق تمہیں کافی کچھ ملے گا۔“

اور سوئے اتفاق جو فائل انہوں نے میری جانب بڑھائی تھی وہ وہی پروجیکٹ تھا جو مجھ سے کم ہو گیا تھا اور میں نے معاویہ سے لے کر جمع کروایا تھا اس فائل پر معاویہ سلطان کا نام لکھا تھا وہ پروجیکٹ میرا تھا اس پر لکھا ہوا لفظ لفظ میرا تھا جو اس دن میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہوئے جا رہی تھی وہ اسمنٹ معاویہ کے نام سے اس ٹیبل پر پڑی تھی میرا دماغ حد درجہ کنفیوژڈ تھا اس وقت مجھے سب کچھ بھول گیا تھا حتیٰ کہ سراج کی کہہ رہے تھے وہ بھی میں سن نہیں پا رہی تھی مگر مجھے یہی لگا تھا کہ وہ محض ایک اتفاق تھا شاید اسے مل گئی ہوگی اور اس نے ہڑبگ میں اپنے نام سے جمع کروادی ہوگی میں نے اپنے دل کو ہزار تسلیاں دی تھیں میں معاویہ سے پوچھنا بھی چاہتی تھی مگر پوچھ نہیں پانی تھی۔ ہر دفعہ میرے لب کا نب جاتے تھے اگر یہ سب محض اتفاق ہوتا تو اس کو کیا لگتا؟ یہی سوچ کر میں چپ کر جاتی تھی ابھی میں اسی شش و پنج میں تھی کہ مجھے دوسرا جھکا تب لگا تھا جب یونہی ممانے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

”اگر معاویہ نہ بتاتی تو ہمیں کبھی پتا نہ چلتا کہ تم نے اپنے فی سے کتنی شاپنگ کی تھی اور پھر نی بھرنے کے لئے تمہیں اپنی چین دینی پڑی تھی۔“ وہ معصومیت سے بول رہی تھیں اور میرا سر گول گول دائرے میں گھوم رہا تھا معاویہ اور ایسے معاویہ پر یہ سب؟ میں اب بھی بے یقین تھی۔

”مجھے تمہاری یہ رشتے دار Inferity complex کا شکار لگتی ہے۔“ وہ شاملہ تھی تو سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ سے مگر پھر بھی ہم میں بہت اچھی دوستی تھی یونہی ایک دن اس نے معاویہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا وہ ہم سے ذرا دور گھاس پر بیٹھی شاید اپنے نوٹس بنا رہی تھی موسم اچھا تھا۔

”ایسے کیوں لگا تمہیں؟“

”وہ شاید تمہیں خود سے بہتر سمجھتی ہے۔“

”تم شاید میری لکس کی بات کر رہی ہو مگر اسے ایسا کوئی پمپکس نہیں ہے شکل میں شاید میں اس سے بہتر ہو سکتی ہوں مگر بانی ہر چیز میں ہم ایک دوسرے کے برابر ہی ہیں۔“ میں حیرانی سے اسے بتا رہی تھی۔

”ہوسکتا ہے مگر میں نے اسے کافی ڈیپلی اسٹڈی کیا ہے اور جو مجھے لگا وہ میں نے بتا دیا۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے تھے مجھے لگا تھا کہ وہ اس کا وہم ہوگا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ خود کو مجھ سے کمتر سمجھتی ہوگی لیکن بعض اوقات شاید جو ہم سوچتے ہیں ویسا ہوتا نہیں ہے یا پھر شاید یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز بالکل ویسی ہو جیسا ہم سوچیں عدی کے معاملے میں بھی میرے سارے اندازے غلط نکلے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ صرف میرا تھا مگر وہ میری خام خیالی تھی وہ ہمیشہ مجھ سے الجھتا رہتا تھا ان ساری باتوں پر مجھ سے لڑتا تھا جو سرے سے میں نے کی ہی نہیں ہوتی تھیں آدھی بات کرتا اپنی سنانا اور میری سنے بغیر چلا جاتا مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے خفا ہے پر مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ میں جو بھی جانتی تھی وہ محض آدھا سچ تھا۔

☆☆☆☆☆

میں عدی عبدالرحمن ہوں خولہ سے لڑ کر میں ڈھالے میں آ بیٹھا تھا پتا نہیں میں کتنی دیر وہاں بیٹھا خلاؤں میں خالی خالی گھورتا رہا تھا مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں آخر سوچ کیارہا تھا یا پھر آخر مجھے سوچنا کیا چاہئے تھا۔

”تم یہاں ہو اور میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔“ معاویہ دھپ سے آ کر میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔

”اداس ہو؟“ میری خاموشی کو اس نے فوراً پہچان لیا تھا ابھی مجھے کچھ کہنا ہی تھا کہ اسے یاد آیا تھا تبھی وہ ٹھوڑی دیر بعد میں آنے کا بول کر اپنا بیگ



وہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی جیسی میرا دل چاہا تھا کہ میں خولہ سے کوئی شکوہ کروں، کوئی شکایت یا پھر صرف اتنا ہی پوچھ لوں اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا، میں نے جیب سے اپنا فون نکال لیا تھا۔

”ایسا کیوں کیا تم نے خولہ؟“ بہت دیر سوچنے کے بعد بھی میں محض اتنا ہی لکھ سکا تھا اسی لمحے معاویہ کے بیگ میں ٹوں ٹوں ہوئی تھی میں چونک گیا تھا، میں نے دوبارہ خالی پیغام اسی نمبر پر بھیجا تھا میں صرف تصدیق کرنا چاہتا تھا جو میں سوچ رہا تھا کہ وہ درست تھا اور میرے سارے اندازوں کی تصدیق ہوگئی تھی۔ میں نے خولہ کے نئے نمبر پر فون کیا تھا مگر فون معاویہ کے بیگ میں بچ رہا تھا میں نے پھر خولہ کے پرانے نمبر پر بھی کال کی تھی جو چند ثانیے کے بعد ریسپونڈ کر لی گئی تھی اور دوسری طرف جو آواز ابھری تھی اس نے میری آنکھوں کو ایک نیا رخ دے دیا تھا، وہ خولہ تھی اور میں چواتنے عرصے سے Texting

کر رہا تھا وہ معاویہ تھی کیوں میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ کبھی خولہ نے میرے اس نمبر پر کال کیوں نہیں ریسپونڈ کی تھی وہ جب بھی کال کرتی تھی پرانے نمبر سے ہی کرتی تھی اور میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ شاید منیٹ ورک ایک ہے اس لئے اور اب اس ساری صورتحال کو کیسے سنبھالنا تھا فی الحال میری عقل دنگ تھی مجھے کسی کو کچھ بھی جتنا نہیں تھا نہ ظاہر کرنا تھا جو جیسا چل رہا تھا مجھے چلنے دینا تھا، میں معاویہ سے کچھ بھی کہے بغیر سیدھا اس لڑکے کے پاس گیا تھا جو خولہ کو تنگ کرتا تھا اور جو خولہ کو یونیورسٹی ڈراپ کرنے بھی آیا تھا میں خولہ کو اس کے ساتھ دیکھ کر کافی بدگمان بھی ہوا تھا کہ مجھے تو کہہ رہی تھی کہ ”رائٹ نمبر“ تھا اور اب اچانک سے وہ رائٹ نمبر ”رائٹ نمبر“ کیسے بن گیا تھا، لیکن میری ایک عادت تھی کہ میں جلد بازی میں کچھ نہیں کرتا تھا سو اس وقت بھی میں چپ کر گیا تھا میں نے بال برابر بدگمانی اپنے اندر نہیں آنے دی تھی

وہ لڑکا فون پر مانا نہیں تھا اس لئے مجبوراً مجھے اپنے تعلقات استعمال کرنے پڑے تھے اس لئے مجھے اس کے ٹھکانے کا پتا نہیں تھا اس وقت تو میں نے اسے بس ذرا دھک کیا تھا مگر اب مجھے پوری گیم بھنی تھی اس لئے میں اس سے ملنے گیا تھا میرے ذرا سے دھک کانے اور پولیس کی دھمکی پر اس نے سب کچھ اگل دیا تھا۔

”میں یہ سب معاویہ کے کہنے پر کر رہا تھا“۔ وہ بتا رہا تھا اور میں دم بخود اسے سن رہا تھا۔

”اسی نے اس دن مجھے فون کر کے خولہ کو یونیورسٹی چھوڑنے کے لئے بلایا تھا“۔ اور جیسی وہ مجھے بار کنگ میں لے کر آئی تھی وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتی تھی وہ مجھے اپنے حساب سے سب کچھ دکھا رہی تھی اور میں دیکھ بھی رہا تھا مگر جانے کیوں ہر بار میرا دل ہلک ہلک کر خولہ جبران کی طرف چلنے لگتا تھا وہ مجھے دنیا کی سب سے بڑی جھوٹی لگتی تھی مگر جب بھی اسے میرا دل کی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے سب کچھ خود ہی جھوٹا ثابت ہو جاتا تھا، اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر میرا دل دوڑ دوڑ کر مہر ثبت کرتا کہ یہ محض میرا وہم ہی ہے خولہ جبران ہی سچی ہے، وہی سچ بولتی ہے باقی سب جھوٹ مگر ہر بار میرے قیاس میرے اندازے غلط ثابت ہوتے تھے وہ میرے ہر خیال پر پانی پھیر دیتی تھی مجھے اس کے گیم کو اس پر ہی لگنا تھا اس لئے میں بھی اس کے التفات کو مثبت انداز میں لے رہا تھا، بلکہ میں خود بڑھ چڑھ کر اسے سراہتا تھا مجھے معلوم تھا یہ سب خولہ کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا مگر کچھ وقت کے لئے تکلیف برداشت کر لینا ہمیشہ کی تکلیف سے بہتر تھا۔

☆☆☆☆

اس دن معاویہ نے میرے پاپا سے بے حد بدتمیزی کی تھی وہ ان سے لڑ جھگڑ کر اپنے ماموں کی طرف چلی گئی تھی کیونکہ پاپا نے عدی سے اس کی

میں اڑ گئی تھی۔  
”معاویہ تو کبھی ہمارے بیچ تھی ہی نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

”میں تمہیں بتاتا ہوں شانلہ نے ٹھیک کہا تھا معاویہ کے بارے میں اور میں نے اس کے پورے کیس کو اسٹڈی کیا ہے شاید تمہیں انکل نے نہ بتایا ہو مگر معاویہ کے گھر کے حالات ہی ذمہ دار ہیں اس کی ٹوٹی اور احساس کمتری کی شخصیت کے۔“ وہ اسے دھیرے دھیرے ہر چیز کے بارے میں بتا رہا تھا اور وہ دم بخود اسے سنے جا رہی تھی تو یہ بھی کہانی۔

”وہ بے پناہ دوستی محض ایک دکھاوا تھی۔“ اس نے تنہی سے سوچا تھا اور عدی نے پیار سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لئے تھے۔

”تمہیں خولہ! اسے علاج کی ضرورت ہے اسے ہمارے پیار تو جہ مان کی ضرورت ہے وہ نفرت کی پیداوار ہے اسے محبت سے پکارو گی تو تمہارے کام آئے گی۔“ اس نے بڑے پیار سے سمجھایا تھا۔

”اور وہ شادی؟“ وہ اب بھی کنفیوژڈ تھی۔  
”وہ تو اپنے ماموں کے پاس محض تم سے شادی کرنے گئی تھی۔“

”اس کے ماموں کی نظریں صرف اس کی جائیداد پر ہیں بس کچھ دن اور پھر تم اسے خود جا کر لے آنا تب تک ماموں کی محبت کا بت بھی پاش پاش ہو چکا ہوگا۔“ اس کے پاس ہر چیز کا حل ہوتا تھا اس لئے تو کلاس میں سب اسے نو مسجوسی کہتے تھے خولہ نے بے حد مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

”نو مسجوسی؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے پھسلا تھا اور پھر وہ خود بھی کھلکھلا کر ہنسی دی تھی اسے پتا تھا اسے غصہ ہوتا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ غصہ ہوتا تھا یہ نام سن کر مگر اس کی ہنسی بھی ہر طرف خوبصورت جلتی رنگ بجا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شادی سے انکار کر دیا تھا وہ معاویہ کی شادی دیکھ بھال کر کسی اچھے گھر میں کرنا چاہتے تھے مگر اس نے ہمارے اتنے سالوں کے مان پیار سب کو ایک حرف بھیج کر گاؤں کا رخ کیا تھا میں بھی واماں تھی میں تہی داماں ہی رہ گئی تھی میں اکثر عیدی اور معاویہ کی شادی کے بارے میں خبریں سنتی رہتی تھی مگر میں نے ایک بار صرف آخری بار اپنی قسمت کو آزمانے کا فیصلہ کیا تھا میں نے عدی سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ میرے سامنے کھڑی تھی وہ سفید بنگلہ اس کے عین وسط میں لگا ہوا رہ سب کچھ جیسے غائب سا ہو گیا تھا اگر کچھ رہ گیا تھا تو ہمارے دو دو مگر مجھے ابھی کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دینا تھا مجھے صرف اسے سننا تھا میں نے اسے جھوٹ کہا تھا کہ معاویہ سے میری شادی میں دو ہفتے رہ گئے ہیں میں صرف معاویہ کا اصلی چہرہ سب کے سامنے لانا چاہتا تھا کہ وہ کتنی دلیو کرنی تھی ان کے پیار کو ان کی توجہ عزت اور مان کو کہ میرے صرف ایک بار کہنے پر میں رشتہ اس کے سگے رشتے داروں میں ڈالوں گا وہ ان کے برسوں کے پیار کو بے مول کر کے چلی گئی تھی باقی کچھ معاویہ نے افواہیں پھیلا رکھی تھیں محض خولہ کو تکلیف دینے کے لئے اور مجھے اب خولہ کو ان ساری تکلیفوں سے باہر نکالنا تھا۔

☆☆☆☆

”ادھر آؤ بیٹھو یہاں۔“ اس نے خولہ کو کندھوں سے پکڑ کر سامنے پڑے کئی بیچ پر بٹھایا تھا وہ بلاشبہ بے حد ٹوٹی دکھائی دے رہی تھی۔

”میں صرف تم سے پیار کرتا ہوں بلکہ مجھے تم سے عشق ہے عقیدت کی حد تک تم ہی میری فیری لینڈ کی ڈریم گرل ہو تم ہی میری ہیر ہو۔“ وہ نیچائے کیا کیا کہہ رہا تھا وہ بنا پلکیں جھپکے اسے تنک رہی تھی۔

”اور..... اور..... وہ معاویہ۔“ وہ اپنی ہی باتوں

# سوکھا آسمان

رہنے لگے ہیں۔“  
”مائی سکھاں کہیں نظر نہیں آرہی؟ کیا اپنا پنڈھ  
بھی بھول گئی؟“ مائی نے نتھنوں میں گول نتھ ذرا سا  
ہلایا۔

”راول! سکھاں کہاں پنڈھ بدلتی ہے۔ وہ تو  
بھٹائی کی والی ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ کمر پر  
مٹکا رکھے سر پر دھرے وہ اپنی سریتوں سے خوش  
گیبوں میں مشغول ہوگی۔“ راول ہنس دیا۔

”ہاں وہ اکثر ہنس دیا کرتا ہے۔ سکھاں کا نام  
آتے ہی آپوں آپ اس کے لب کھٹنے لگتے ہیں۔ وہ  
مسکراتا نہیں، بس یہ نام ہی امرت ہے۔

سکھاں بھی ایسی ہی تھی کہ غصے سے بل کھا کے،  
نتھنے پھلا کے، دلکشی سے مسکرا دے۔ تھری چولی  
گھا گھرے پہنے، گندی ہاتھوں میں تھرے چوڑے  
چڑھائے، ناک کی بھنگ کے عین نیچے نتھنوں کے  
درمیان گول نتھ پہنے جب وہ بھٹوں میں بھاگی جاتی  
تھی تو سب تلبوراس کے ساتھ اڑاں بھرتے تھے۔

خوشی من میں سمائے یہ تھری واسی ہے، صابر، شاکر۔  
مٹکا ایک کمر پر رکھے تریاں سے یا پھر کسی کنوئیں  
سے پانی بھرنے آتی تو ہمیشہ سے وہاں پکھوں سے  
آگے۔ ایک بدحال مندر میں، مندر کے میڑھیوں پر  
بیٹھے اسے راول نظر آ جاتا اور وہ ہنس دیا کرتی اور  
ساتھ چلتی سوٹھ کے کمر پر ٹوکا مار کے کہتی۔

”چریا..... دھنارنا ہو تو!“ اور اس کی سرتیاں  
رک کے ہنسی سے لوٹ پھوٹ ہو جایا کرتی تھیں۔  
راول اسے دیکھ کے ہنستا نہیں تھا مسکراتا بھی نہیں

”تھر واسی ”موت“ کے ”محبوب“ ہیں اور  
سوکھا آسمان پیاسا ہے۔“

جولائی میں سورج کی السائی دھوب میں انگڑائی  
کے شمار کا فقدان تھا۔ جھڈو اور ننگر پارکر کے پہلے  
زینے پر اترتا نو کوٹ قلعہ صحرا کی طرح بکھرا اور اجڑا  
بد حال تھا۔ جھاڑیاں، خشک سالی، خالی پن اور  
ریت کے سنہرے سنہرے ذرے اب اوپر کو اٹھتے  
ہیں اور ”سوکھا“ سکار میں بدلنے کا خواہاں ہے مگر  
کیسے؟ ابر باراں تو آئے۔ جل تھل تو ہووے،  
آسمان اپنا سینا بھاڑ دے اور تھر کی پیاسی زمین اور  
اس کے پیاسے لوگوں کو سراپ کر دے۔ کیسا ہے یہ  
آکاش۔

مائی بھاگی آسمان کی اور رخ موڑے، تھریے  
چوڑے پہنے میالے ہاتھ کا جھجھکا بنائے دیکھ رہی تھی  
کہ اس بار تو مند مہار سے پہلے مینہ برسے اور  
سارے تھر کو جل تھل کر دے۔

”مائی! کیا دیکھ رہی ہو ابر باراں، نہیں آئے  
گا۔“ مائی نے افسوس سے ہاتھ جھٹک دیا۔  
گھا گھرے کا کونا پکڑ کے، چڑی کو ذرا پیچنے کے وہ  
مڑ کے آشفٹگی سے مسکرائی۔

”اللہ سائیں ہی تھروے!“ اس کے پاس  
سے گزرتے ہوئے مائی بولی۔

”مند مہار گائے عرصہ ہوا ہے۔ جو ماسو میں تھر  
کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں مگر اب.....  
آکاش پر بادلوں کا دھبہ تک نظر نہیں آتا۔ تریاں  
سوکھ چکی اور اب سہانگوں کے لوڑ بھی سونا سونا



بلکہ ایک تک اس کے مٹا لے تھری حسن کو تکتے جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ راول سکھاں کی ماں سیکندہ مائی کے سامنے اسے نہکتا نہیں تھا۔ اس کی ماں ہی ایسی تھی خزانہ قسم کی۔ یہاں کسی نے ان پر پھبتی کسی تو وہاں مائی گج کو پھینک کے تھوہڑ بن جایا کرتی۔

اب مائی کے ساتھ کھڑے ہو کر جب وہ مسکرا رہا تھا تو سامنے ہی منکا سر پردھرے، گھونگھٹ نیچے کیے، آہستہ آہستہ چلی آرہی تھی۔ اس کے کمر کا منکا نہیں تھا۔

”ہائے اللہ سامیں! سکھاں کیا ہوا؟“ سکھاں رک گئی۔

”مائی! چنگو نہیں ہوا!“ یہ کہتے ہوئے تھر کا قحط اور موت کا ذائقہ سانسٹ آیا تھا اس کے لہجے میں۔

”چنگو مائی! اللہ واپسی۔“ راول نے اجرک لپیٹ کے کہا اور صحرا کی ریت میں سکھاں کے

قدموں کے نشانوں پر چلتا گیا۔ اور یہ پندھ بھی کتنا خوب صورت تھا۔ سکھاں کے قدم نشان تاتھے کہ

جیسے آسمان میں قسمت کے ستارے تھے جس پر قدم دھر کے وہ اپنی محبت کو عروج تک لے جانا چاہتا

ہے۔

ملکے ملکے سروں میں وہ گارہا ہے اور یوں جیسے مائی بھاگی کی ماکھی ٹھہری آواز اس کے سروں میں

عواد آئی ہو۔

راول نے سماں پر بھٹائی والی کا خسار ملفوف کر دیا۔ بھٹوں میں اڑتے تہوہر گنج کے آگینوں میں محور

قصاں ہوئے اور کچے میں چار پائی پر لیٹی، منہ پر اجرک لپیٹ سکھاں نے ایک اور سسکاری بھری آہ۔

اش آہ اٹھ!!!

مائی بھاگی کا مرید، گا تا ہوا کے سنگ اٹھکیلیاں کرتا یکدم ٹھک گیا اور سارے میں جم جانے کی بازگشت پھیلی۔

بول کے درخت نے صحرا کے ایک ذرا سی جگہ کو

اپنے بے بس سائے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہاں مورقص کرتے تھے مگر اب صرف ان کے پنکھ گرتے ہوئے، خزاں رسیدہ پتے جو جناح پارک میں کسی کے قدموں تلے روندھ جانے کے لیے درخت سے باغی ہوئے ہوں، کی طرح تھے اور ببول کے ساتھ بھٹوں میں ریت کے ذرے اڑے جارہے تھے۔

یہاں بھی وہاں بھی۔

اور ایسے میں ببول کے سائے کے عین وسط میں سکھاں کے کمر کا منکا ٹوٹ کے بکھرا ہوا تھا۔ بے

بس سا اور قدرے حنوط زدہ بھی ایسے ملنے عموماً محبوب کو بہرہ پیا دیکھ کے، دوپٹہ منہ میں داب

کے ”ہائے اللہ“ کہہ کر منکا گرانے والی دوشیزہ کی کتھا ہے مگر ایسے تو نہیں ہوتا اور ہوگا بھی نہیں کیوں

کہ سندھو ماما کی کرپا تو ہر کسی پر نہیں ہوتی اور نا ہی ہر کوئی ”سہتی“ مرجانی ہو سکتی ہے جو سندھو ماما کی کرپا

کے لیے پانی دیوتا سے بھی بغاوت کرے مگر پھر بھی اسے سامیں عنایت نالما اور بتاؤ ملتا بھی کیسے؟

سہتی مرجانی یہاں مندر کے پیچھے ہی ایک بد حال پکھے میں رہتی تھی۔ سانولی سلوٹی صحرا جیسی

تھی۔ مندر کے احاطے میں سرخ پھول چنتی تھی۔

جب ماں کے سامنے کھڑی ہو کے، چولی ریگستانی گھاگھر سے سارے پھول پکھے میں پھینک دیتی تھی

تو ماں اس کی چٹیا پکڑ کے ایسے دور سے پچتی کہ مرجانی سہتی کو اپنے حلق میں پسپی ہوئی مرجوں کا

ذائقہ سامحوس ہونے لگتا تھا۔

”ارہی کلمو ہی! چری۔ نبھاگی۔ مندر سے ایسے پھول توڑتی ہے تو کو شرم نا ہی آوت اڑے بابا! لہی

نبھاگی پرکا سے سندھو ماما کی کرپا ہو۔“ وہ چیختی چلائی مگر ماں زبردستی سارے پھول زبردستی مندر میں

پھینکوا کے چھوڑتی۔ اگلے روز وہ سحر کی سپیدی اترنے سے پہلے ہی مندر کا احاطہ پھلانگ کے آئی

اور سارے پھول چن کے اپنی جھولی میں بھر لیتی

جہاں تھر کے موسم کے برخلاف بہارتھی۔ سوکھا نہیں ایسے لوگ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ آدھی رونی اور اس کے پورے درد۔

سہتی کو عنایت سے پیار ہو گیا۔ اشاروں، کناہوں، چہ میگوئیوں میں یہ خبر نوراں کے ویڑھے سے لگی اور مور کے پنکھ میں سمٹ کے سارے تھر میں پھیل گئی۔

ماں تک خبر آئی تو لگا لیا چار پائی سے۔ تین تھپر منہ پر بار، چٹیاں کھینچ اور چیخ کے خبردار کیا۔ ”خبردار! جو گئی تو“ اگلے ہفتے تک وہ ٹھرے رہے مگر پیر کے روز مزے کر کے وہ چلے گئے۔ مصنوعی تریاں خاک بنی تھیں بنی بھی نہیں۔ محبوب کے دھچوڑے (جدائی) میں اب وہ نیم یاگل ہو گئی۔ مندر میں پھول توڑ کے، جھولی میں بھر کے، گھٹنوں تک خالی آنکھیں لیے آسمان کی اور دیکھتی رہتی تھی۔ ماں سارا دن رونی مگر اسے عنایت سائیں ملتا کیسے؟ سارا تھر اس کے پیار سے باخبر تھا اور اس کا پریت کھٹا لوگ کھٹا بن گئی۔

☆.....☆

جس دن تھر کے بہت سے موردوں نے پنکھ پھینک دیے۔ مورد کا رقص معدوم ہوا اور موت کے رقص نے دھوم مچائی تو شروع ہی سہتی سے کی۔ اس دن سورج موت اگلتا تھا۔ سارے میں دھول ہی دھول تھی۔ مندر کا احاطہ تب بھی خاموش تھا اور آسمان میں ایک دیوانہ گدھ مندر کے اوپر چکرارہا تھا۔ جب بہت سے پھول جو کہ مرجھائے ہوئے تھے۔ اکھٹا کر کے وہ میڑھیوں پر لیٹی تو چند لمحے بعد گدھ کی چیخیں بلند ہوئیں اور سہتی کی ماں نے واویلا مچا کے سارے تھر کو اکھٹا کر لیا۔

سوکھا تو بہت تھا۔ آسمان پر یکدم بادل اکھٹے ہوئے، دامن تر ہونے لگا۔ سہتی کے لحد میں اترتے ہی سوکھا آسمان ایک بار پھر اچانک سے کسی بیوہ کی

اچاٹے میں پھسکڑا مار کے ایسے زور زور سے ہنسی تھی۔

مندر کی میڑھیوں پر سارے پھول پھینک کے بھٹوں کی اور نکل جاتی۔ ماں اپنی دیتی آواز کے ساتھ چلاتی ”اری اودھ جری! مٹکا بھراؤ۔“ سہتی پیچھے مڑ کر دیکھتی۔ ہنسی اور گھونگھٹ کھینچ کے یہ جاوہ جاہوتی۔

مندر کے علاوہ اس کی پسندیدہ جگہ بھٹوں کے درمیان بوڑھا ببول کا درخت تھا۔ مندر میں ذرا سا وقت گزار کے بہت کے لیے یہ یہاں آوارہ ہوا کرتی تھی۔ خربوزے تربوز، نڈے، گوار کی پھلیاں، باجرہ، چاول نہ رہے تو ایسے میں شہر سے چند لوگ آئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ این۔ جی۔ اودالے ہیں اور یہاں مصنوعی تریاں لگانے کے کارن آئے ہیں۔ سارا تھر سوکھے میں بھی مہارنگلتا رہے تھے۔ سوکھے، لاغر کمزور بچے تھر کی ریت پر ایسے بھاگتے تھے کہ جیسے اوباما کا نکل ہو اور ایران کے اعلیٰ زبائش اور آرائش والے قالین پر بھاگتے ہوں۔ ببول کے درخت کے نیچے وہ بھی کھڑی تھی۔ دراصل مندر سے پھول آج ببول تک لائی تھی۔ سنا تھا کہ پھولوں والیوں پر ہمیشہ سندھو ماتا کی کرپا ہوتی ہے۔ اسی بات پر اعتقاد کر کے وہ ببول کے نیچے کھڑی تھی مگر پھر اچانک سے ایسے افتاد پڑی کہ سارے تھر کے لوگوں پر ایک بار پھر سے سوکھا پڑ گیا۔ سوکھے پر سوکھا، قحط در قحط۔

سارے سرخ پھول اس سے گر گئے۔ اس کے پھول ہمیشہ سے ہی گرتے تھے۔ عنایت نامی ایک شہری سائیں ایک بڑا سا ہیٹ پہنے۔ سیاہ پیٹ پر نیلا شرٹ پہنے ہوئے وہ سائیں سہتی کے من کا سائیں بن گیا۔ سہتی بھی بڑی مستقل مزاج تھی۔ صبح سویرے آئی۔ ببول کے درخت کے نیچے پھسکڑا مارے وہ بس سامنے کیسپس کو دیکھتی رہتی تھی۔

طرح رونے لگا۔

تھی۔ سیکنہ مائی کا کہنا تھا کہ سکھاں کے ماما ننگر پار کر  
میں اپنے اکلوتے بیٹے جبل کے لیے اس کا ہاتھ مانگنا  
چاہتے ہیں۔ اس نے گھونگھٹ بھینچ کے پیچھے مڑ کر  
ہنستے ہوئے سہتی سے کہا۔  
”ہائے رام!“ سیکنہ مائی نے نہ کو سا۔ بس ہنس  
دی۔

بول دھوڑے (جدائی) کا پیامبر سمجھا جانے  
لگا۔ اور اسی درخت کے نیچے سکھاں کا منکا گر کے  
ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے عین سامنے خیمے ایسا تھ تھے  
اور جنرل کی آواز تھر کے صحرا میں کسی بیوہ کی طرح  
بین کر رہی تھی۔

منکا، سکھاں اور خیمے سے نکلتا وہ گورا چٹنا شہری  
سائیں۔

سورٹھ کے وہاں جانے سے پہلے اس نے کئی  
مرتبہ سوچا کہ آج بس ایک دفعہ وہاں بھٹوں میں  
نئے بول کے لیے جاتا ہے۔ سورٹھ مان نہ جائے تو  
بہتر ہے۔ سورٹھ اب کھلا گئی تھی  
پکھے میں داخل ہو کر وہ کھلکھلائی۔  
”سورٹھ! چلو نا۔“ سورٹھ نے سوکھے آسمان  
سے آنکھیں اٹھا کے بس ایک نگاہ ڈالی۔  
”چلو نا سورٹھ!“

”مائی! پگھو نہیں ہوا!“ آسمان پر گرمی کی ایک  
کثیف تہہ جی تھی۔ صحرا کے وادی بہت صابر، شاکر  
بھی، مشکور اور ممنون بھی۔ مہار میں مشکور اور سوکھے  
میں منتظر مہار کی سائیں بڑی سحر ہوتی ہیں۔ جب  
سوکھا آسمان، بادلوں سے ڈھک کے اپنا دامن تر کر  
کے تھر کے واسیوں پر دامن چھید دیتا تو خربوزے،  
تربوزے، ٹنڈے، گوار کی پھلیاں، باجرہ چادل سب  
اتنے وافر مقدار میں آگے کہ قحط کی فکر لگ جاتی۔ قحط  
کی فکر کے لیے وہ اپنا مہار سبک تیاگ کر دیتے۔ تسلی  
ڈھک جاتے، بج کے ششے خیرہ کیے دیتے۔

”سکھاں! مجھے غم منانے دو۔“  
”مجھے شریک نہیں کر دو گی؟“  
”سکھاں! اعم تمہارے لیے نہیں ہے۔“  
”تو محض تم تھر جاتی ہو میں نہیں؟“  
”سکھاں! میرا ایک بار پھر حمل ضائع ہوا۔  
آسمان تو سوکھ چکا ہے۔ اب تو نگدی نشیوں کی نیت  
ان کے دل میں رحم بھی سوکھ گئے ہیں سکھاں! ماٹھوں  
تو ماٹھو اب بکری بے چارے بھی موت سے لڑ رہی  
ہیں۔ میرا دوسرا بچہ بھی ضائع ہوا۔“

خربوزے وغیرہ توڑ کے کھڑوں میں پھینک  
دیتے۔ جب تھر کے تاجدار سورج میں یہ بچ سوکھ  
جاتے تو اس تسلی میں رکھ لیا قحط میں کھاتے۔  
توے پر سینک کر دودھ کے پیئر بناتے ہیں۔ ململ  
کے جھولے میں باندھ دیتے ہیں۔

”خدا رحم کرے گا۔“ اور سورٹھ نے اجرک منہ  
پر لپیٹ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہاں سے چلی جاؤ۔  
گھاکھرا اٹھائے وہ ببول جانے ہی لگی تھی کہ مائی کا  
حکم یاد آیا۔ پانی بھرانے کا۔

ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے کئی برس  
تیاگ کرنا، خوشی کے سہ دامن میں غمی کی عبادت  
کرنا، برستے آسمان کی اور رخ کیے قحط کے دنوں  
”تھروے“ کی دعائیں مانگنا ان تھر واسیوں کا  
معمول ہے۔

منکا اٹھائے جا رہی تھی۔ جب اس نے ببول  
کے ساتھ گزرتے دیکھا تو تاجدار سورج عین  
سامنے ہوا۔ سائے کھسک گئے اور ریت ایک بار پھر  
سا ہو کار ہوئی۔ اس کا منکا ایک دھڑاک سے زمین  
بوس ہوا تھا۔ سہتی نے غور سے سائیں عنایت کو

سکھاں سکار کے دنوں میں بھی اور سوکھے میں  
بھی مٹھری سکھاں رہتی تھی۔ تھری چولی ریگستانی  
گھاگرے میں مگھتی، سورٹھ کو ٹھوکا مارنی اور جن کے  
بیٹے راول پر پھتی کستی سکھاں اس دن بڑی خوش



رقص ہے گریزاں تھے اور وہ سامنے خیموں میں دیکھ رہی تھی۔

اچانک سے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے شہری سائیں ببول کے سائے کی طرف آنے لگا۔ تھر جانی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”ہیلو! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ سائیں کے لہجے میں شائستگی رچی بسی تھی۔ ایسے لوگوں کا لب و لہجہ بھی ان کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی شائستہ، کبھی خستہ۔ جہاں کسی نے دعا دی، وہاں انہوں نے اکبر بادشاہ کی طرح سر کو خم دے کر مہربانی ادا کی۔ ان کے ہر انداز نرالے، محبت سے گندھے ہوتے ہیں۔

سکھاں کی کھکھی بندھ گئی، سہتی بن کے سکھاں نے سائیں حمایت کو پوجا، تھر کے صحر پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

”آپ کا نام؟“  
سکھاں نے ٹھوٹھٹھٹ کھینچا۔ ”جی۔“  
”میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں۔“  
”سکھاں۔“

وہ مسکرایا۔ ”میرا نام حماد ہے۔ اکثر مجھے ہوئی کہتے ہیں مگر مجھے صرف اپنا نام پسند ہے۔ ویسے سکھاں مجھے تمہارا نام بھی پسند آیا۔“

اس کی سائیں بے ربطی ہو رہی تھیں۔ اسے یقیناً اپنی بصارت پر شبہ ہو رہا تھا کیا سائیں عنایت لوٹ آیا؟ کیا اس پر سندھو پاتا کی کرپا ہے؟

رات پورے چاند کی تھی۔ گدھوں کی دیوانگی چاروں اور پھیلی تھی۔ چیچ پکار سب کچھ تھا۔ سکھاں نے کچھ نہ کہا گھاگھر استنجائی اٹھ کھڑی ہوئی اور بھاگ گئی۔ سائیں ہنسا، ہنستے ہوئے اس نے دوبارہ ملنے کی آرزو کی۔

سکھاں پر لمبا رٹھنہرا، محبت کی دیوی کا سایہ اس پر برام ہوا۔ حماد سے پہلی ملاقات کے بعد تیسری

دیکھا۔ اس کے پھول گر گئے جو وہ مندر سے توڑ کے لائی اور یاں کے بہت مار پیٹ کے باوجود بھی وہ پھول لائی تھی۔ سکھاں وہاں سے کھٹکنے لگی۔ جب سائیں اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو اس کی چال مدہم ہوئی۔

”مائی! چیکو نہیں ہوا!“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تھر کا قحط اور موت کا ذائقہ سانسٹ آیا۔ محبت کا قحط اس کی سکار زندگی پر آن وارد ہوا۔ سہتی کے قبر کے عین ساتھ میں ایک سرخ گلاب مر جھا گیا۔

☆.....☆

کچھے میں لپٹی وہ آج بہت سکاریاں بھر رہی تھی۔ نیلے واما ندہ ہونٹ، دھنسی آنکھیں، نیالہ روپ، سوکھے کو لہر تھر کا حسن اجڑ گیا اور محبت کی دنیا میں وہ مزید حسین ہو گئی۔

”سکھاں! آج کل بڑی اداس رہ رہی ہو؟“

ماں نے پوچھا۔

”نہیں تو کس نے کہا؟“

”میں کوئی چری ہوں کیا۔“

”نہیں تو۔“

”تمہارا سکار پن کہاں گیا؟ دیکھو تمہارے ہاتھ میں تھریے چوڑے آدھے ہو گئے کیا ٹوٹ گئے؟“

”نہیں تو۔“

”تو آدھے کیسے ہو گئے؟“

”چنانچہ۔“

”اچھا سورتھ کے یہاں چلی چلو۔“

”ہوں۔“

ماں اٹھ گئی۔ جب وہ بھی اٹھ گئی تو اس نے خود کو ببول کے تنے سے ٹیک لگائے خود کو پایا۔

☆.....☆

فضا صحرا کی دھول سے اتنی ہے، چاروں اور دھول زدہ ذرے ہیں۔ آسمان کی اور چوچ کیے مور

بھی ہوئی اور دسویں بھی۔ وہ تھر میں مصنوعی تریاں لگانے انہیں آئے تھے۔ وہ اور اس کے ساتھی صحرا میں خاک چھاننے آئے تھے۔ آوارہ گردی۔ ایسی آوارہ گردی میں اس پر محبت کا جوگ نازل ہوا اور وہ تپتیا کرنے والا پریم دیدار بن گیا۔  
وہ صبح بہت گھانٹل تھی۔

تریاں تو ویسے بھی سوکھ چکی تھیں، مور کے پنکھ اب جا بجا ملتے، پنیر، خربوزوں کے بیج، سکھاں مندر کے اندر بیٹھی تھی اور وہ اس کے سامنے دوزانو تھا۔  
”سکھاں..... میں دو دن بعد شہر جاؤں گا۔“  
سکھاں کی نظریں زیر سایہ ہوئیں، اٹھ جانا محال ہوا۔ اسے ہمیشہ سے سہتی کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ بس شہر مستقل جہر تھا مگر اظہار کے بعد آجائے تو محبت کی عبادت کہلاتا ہے۔

”مگر میں ایک عہد کرتا ہوں سکھاں.....“  
”عہد نبھانے کو گئے سائیں۔“

”میں تم سے عہد کرتا ہوں سکھاں! کہ اس ملہار میں ملہار گاتا ہوا تمہیں اس تھر میں نکاح کر کے لے جاؤں گا۔“ تھر کی آنکھوں سے آنسو چھلک گئے۔  
صحرا سے دھول اٹھنے لگی۔

”مگر..... میں اس نکاح سے پہلے سکھاں کو منکوحہ بنا لوں گا، اے شہری سائیں۔“ مندر کے احاطے میں اجرک باندھے راول تلوار کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔  
”اٹھو سکھاں۔“

سکھاں بیٹھی رہی۔ تب بھی اور پھر بھی..... حماد نے جاتے سے اسے گہرا لال لاکٹ دیا، یہ اس کی محبت کی پہلی نشانی تھی۔ سکار نہ آیا، سوکھا رہا۔ ایک سال تو جمع کیے ہوئے اشیائے طعام پہ گزرا ہوا۔ بکریوں نے دودھ دینا بھی بند کیا اور مور کے پنکھ پہلے سے زیادہ جھرنے لگے۔

☆.....☆

سکھاں اب سہتی بنی، سپیدگی، سحر صحرا کے سینے پر اشران کرتے سے وہ مندر کے احاطے میں اس جگہ چبھتی تھی جس جگہ حماد سائیں نے اس سے عہد کیا تھا۔ عہد شاید توڑنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ایک سال گزر گیا، سکار نہ آیا ملہار ویسا رہا۔ جہاں آیا تھا لوٹ کے نہ آیا۔

شام ہونے کو تھی، صحرا کا دوزخ سماں اب ٹھنڈا ہونے کو تھا۔ اکا دکا گھروں کے ویڑھوں میں تھر جائیاں ٹھوہ زمین میں دفنائے ہوئے تھے جو سوکھ چکے تھے۔ ان کا کڑا کسلا آنا بن چکا تھا اور تو بے پروئی سیتی جارہی تھی۔ بوڑھا بول آج بھی خاموش تھا اور بجر کا استعارہ تھا۔ مندر کے احاطے میں خاموش فضا ٹھہری تھی اور سکھاں بازوؤں کے گرد اجرک لپیٹے ہوئے تھی۔

راول سیڑھیاں چڑھتا آیا۔  
”سکھاں! مانی ڈھونڈ رہی ہے تمہیں اٹھو۔“ وہ دھیرے سے اٹھی اور اس کے پاس سے گزری مگر.....!

راول نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑا۔  
”بہت منتظر ہوا اس شہری سائیں کی، دیکھو میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“

وہ رک گئی۔ ”راول! تم محبت نہیں کرتے، تمہاری ضد ہے اور انا کی جنگ میں تم فاتح کہلانا چاہ رہے ہو۔“ راول ہنس دیا۔

پکھے میں بیٹھی سکھاں رو دی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ جس محبت کے بت کی وہ پوجا کرتی رہی وہ سب کذاب تھا۔ دروغ، جھوٹ منافقت۔

☆.....☆

ایک سال سکار نہ آیا تو دوسرے سال کیسے آتا۔ تھر کی فضا میں گدھوں کے پروں کی پڑ پڑا ہٹ گونجتی تھی۔ پورے چاند میں دیوانگی حد پر ہوتی اور سارے میں موت کی خوشبو پھیلی ہوئی۔ اس سال

خاموش صبح اتر رہی ہے، گدھوں کے پروں کی  
پڑپڑاہٹ ایک بار پھر گونج رہی ہیں۔ مندر پر  
خاموشی کی گرد آلی ہے۔ سہتی کی قبر پر تھوہر کے  
نشانات ہیں۔ ایسے میں اگر ناک کی سیدھ میں دیکھو  
تو صحرا کے ریت کے ذرے اڑتے جا رہے ہیں۔

نو کوٹ کی بد حالی میں چھپے گدی نشینوں کا  
اسراف منہ کھولے کسی اثر دھے کے مانند پھن  
پھنکارتا ہے۔ مٹی اور اسلام کوٹ سے اوپر ریت  
کے سنہرے ذروں تپتے شمس کے بالکل عین اوپر  
مورا آہستہ آہستہ پرواز کرتا ہے۔

اس نے جاتے سے عہد کیا تھا۔ عہد نبھانے کے  
لیے کئے جاتے ہیں توڑنے کے لیے نہیں۔ پھر جب  
اس پر ہجر کا عذاب عبادت بن کے اترا تو اس نے  
عہد نبھانے کے لیے کہا تھا مور کا پنکھ ہاتھ میں پکڑے  
اونٹ پر بیٹھے ہمارے گنگنا تا، اس نے چیخ کے کہا۔

”سکھاں.....!“

گھاگھا اسٹھالتے وہ مندر سے بھاگتی گئی۔

”میں نے عہد پورا کیا۔“ حماد اونٹ سے اترا۔

سکھاں کے ہاتھ پکڑے وہ مسکرایا۔

”میں نے تمہارا بہت انتظار کیا سائیں۔“

”انتظار محبت کی رنج ہے۔ اس کے ساتھ

ساتھ رواں دواں۔“

”تم نہ آئے تو سکار بھی نہ آیا اب اوپر دیکھو

آکاش پر یہ برکھا کے دھبے ہیں۔“

جب پلھے میں حماد اور سکھاں کا نکاح ہوا تو

سوکھا آسمان کا دامن چھید گیا۔ تھر پر پانی دیوتا کی

کرپا ہوئی، بچے تنگ دھڑنگ باہر کو بھاگے اور حماد

نے سرگوشی کی۔

”محبت اڑتے، بچھڑیوں کا وہ گیت ہے جو ہوا

دھن اور من کا ساز ہے۔ فاخر بھی مغرور اور عاجز

بھی۔“

ہجر کے دوسرے سال ماں نے اس کا سنگ (رشتہ)  
جھن کے بیٹے راول کو دے دیا۔ شاید وعدہ کرنے  
والے بھول جایا کرتے ہیں۔ شام کے سایوں میں  
موت کا سایہ سارے تھر پر برام تھا۔

سورٹھ اس بار پھر حمل سے تھی۔ سوکھا ڈھانچہ،  
سوکھا پیٹ، دھنسی آنکھیں، گہرے حلقے۔ صحرائے  
تھر کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ چریا سے بچے، جو سارے  
تھر میں ادھم بجائے رکھتے تھے، خاموش آسمان کی  
اور پانی دیوتا کو دیکھتے۔

غربت، افلاس انسان کو کم عمری میں جوگی بنا  
دیتا ہے اور ایک جوگی ایک بزرگ کا کام بھی تو بس  
یہی ہوتا ہے۔ اس فانی دنیا کے رمز و رموز جاننا۔

جوگی بچے خاموش تھے۔ سکھاں مندر کے  
احاطے میں نیم اٹنا غفیل تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر  
صبح تک وہ نہ آیا تو وہ اسے بھلا دے گی۔ سائیں  
عنایت بھی تو سہتی کے لیے نہ آیا تھا۔

کیا میں ہر دفعہ تمہیں اس مندر سے لے جایا  
کروں گا؟ میری مٹھوی سکھاں۔“ سینے پر ہاتھ  
باندھے، اجرک لپیٹے، بول سی آنکھوں والا اسے  
دیکھ رہا تھا۔

”راول! وہ آئے گا ضرور، محبت کے وعدے

کرنے والے، اسے کرنے سے پہلے اس کے ایفا

ہونے کی قسمیں کھاتا ہے۔ میرے ایتان کا بت

سمار کرنے سے پہلے بس ایک دن کی مہلت دے

دو، اگر وہ آیا تو میں اس کی اگر.....“ سکھاں

خاموش ہو گئی۔

”مجھے منظور ہے میری مٹھوی سکھاں..... خیر وہ

نہیں آئے گا چلتا ہوں۔“ وہ چلا گیا۔

سکھاں رو دی تھی۔ پہلے برہا کے عذاب پر،

پھر اپنی قسمت پر۔ یہاں تو سوکھا پڑتا ہے، شہری کیا

جانے، ان کا دکھ؟ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی چاروں

اور اس میں سوکھے آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

ریحانہ آفتاب

# عشق کی دلاستہ ہمدردی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ: آنور غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ چار بہنوں میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ وہ سب میں حسین تھی۔ خود سے پہلے اپنے والدین اور بہنوں کی خوشی کا سوچتی تھی۔ کم عمری میں ہی اس نے گھر کی تنگدستی دور کرنے کے



لیے محبت کرنا شروع کر دی تھی۔ اپنے لیے خریدی چیزیں بہنوں کے پسند آ جانے پر انہیں دے دیتی تھی۔ وہ اپنی رونی بلکتی زندگی سے عاجز تھی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ کسی امیر کیر بندے سے شادی کر کے اپنے گھر والوں کی زندگی سنوارے گی۔ دونوں چھوٹی بہنیں اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس سے بڑی درخشاں کی آنسو سے ٹھنی رہتی تھی۔ وہ طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ قدوس صاحب جو آنسو کے والد ہیں اولاد نرینہ نہ ہونے پر اپنی بیوی ہاجرہ کو ساری زندگی باتیں سناتے رہے۔ انہیں آنسو کا کالج جانا پسند نہیں تھا۔ ہاجرہ، آنسو کے پارلر (جو اس نے گھر میں ہی کھولا ہوا تھا اور میلے کی عورتیں بڑے پارلر میں بیٹھے بچانے کی خاطر اس کے پاس آتی تھیں کہ وہ کم پیسوں میں بہترین کام کرتی تھی) اور کوچنگ سے ملنے والی آمدنی کے گن گاتیں تو قدوس صاحب کی اتا بلبلا جاتی تھی۔ آنسو بھی ان کی جلی کٹی کی زد میں رہتی تھی۔ عرفشان ولی خدی پشتی رئیس ہے۔ Perfection اس کی پہچان ہے۔ ذرا بھی نقص اسے برداشت نہیں خواہ وہ چیز اسے کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو۔

## فسطا نمبر 8



وہ اپنے کمرے سے ملحق کمرے کی زینت بنادیتا تھا مگر خود سے جدا کرنا گوارا نہیں تھا۔ عرشان ولی وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ بے حد ہمدرد دل رکھتا تھا۔ ماہ پارہ بے حد تک چڑھی اور ماڈرن خاتون ہیں۔ عرشان ولی کی والدہ محترمہ، فرہاد صاحب، ماہ پارہ کے مزاج کے بالکل برخلاف بہت اچھے انسان ہیں۔ ماہ پارہ اور فرہاد صاحب کی تین اولادیں ہیں۔ اسارا بڑی بیٹی ہے جو اپنے شوہر راہیل اور تین بچوں کے ساتھ شارجہ میں رہتی ہے۔ راہیل لاپچی انسان ہے۔ اسارا، ماہ پارہ کی طرح تنگ مزاج ہے۔ اسارا سے چھوٹا شاہ میر ہے۔ محنی، شاہ میر کی بیوی ہے جسے کم صورتی کے باعث اکثر ماہ پارہ جلی گئی سالی تھیں۔ محنی کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے وہ ابھی تک بے اولاد کی شکار تھی۔ محنی سلجھے مزاج کی لڑکی ہے۔ ماہ پارہ کی بیسٹ فرینڈ واصفہ کی دو اولادیں ہیں۔ کاشان اور زویا۔ کاشان بھورا صفت انسان ہے۔ فلرٹ اس کا من پسند مشغلہ ہے۔ زویا تک چڑھی لڑکی ہے۔ وہ عرشان ولی کو پسند کرتی ہے۔ اس کی نظر کرم حاصل کرنے کے جتن کرتی رہتی ہے۔ تینوں بچپن سے دوست ہیں۔ آنسور نے زویا سے بڑے جتن کر کے دوستی کی تھی۔ کاشان کی صورت میں محروم زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ زویا نے کاشان کو چیلنج کیا تھا کہ وہ آنسور سے فلرٹ کر کے دکھائے تو وہ استاد مان لے گی۔ کاشان نے چیلنج قبول کر لیا تھا جلد ہی اس نے آنسور سے دوستی کر لی۔ اسے سوٹ اور سیل فون گفت کیا۔ جدید اسارٹ فون استعمال کرنا آنسور کو مشکل لگ رہا تھا۔ عرشان ولی، کاشان کو اس کی حرکتوں پر بے نقط کی سناتا رہتا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر غصہ آتا تھا جو کاشان کا شکار بنتی تھیں۔ وہ اپنی محبت اور جذبے اس کے لیے سنبھالے بیٹھا تھا جو صرف اس کی ہوتی۔ ولید عرشان ولی کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ (اب آپ آگے پڑھیں)

☆☆☆

قدوس صاحب غصے سے ٹہل رہے تھے۔ ہاجرہ کے چہرے پر پریشانی تھی۔  
 ”گیارہ بجنے والے ہیں۔ کب آئے گی تیری بیٹی؟“ قدوس کا لہجہ تیز تھا۔ کمرے میں موجود روبی اور سونی پریشانی سے ایک دوسرے کی شک دیکھنے لگیں۔  
 ”آنے ہی والی ہوگی۔ گاڑی لینے آئی تھی۔ چھوڑ بھی دے گی۔ آپ ٹینشن نالیں شادی میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ بارہ ایک سے پہلے کون سی تقریب ختم ہوتی ہے۔“ ہاجرہ منمنائی۔  
 ”تو یعنی وہ ایک بجے آئے گی۔ آفس کے نام پر یہ اچھا ڈرامہ چل رہا ہے تیری بیٹی کا۔“ قدوس صاحب کو تو موقع چاہیے ہوتا تھا جو انہیں قسمت سے مل گیا تھا۔  
 ”خود موبائل لے کر گھومتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک گھر میں بھی لا کر رکھ دے۔ تاکہ اس کو کال تو کی جاسکے۔“  
 اب ان کا نشانہ موبائل بن گیا تھا۔ ہاجرہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے سر ہی تھام لیتی تھیں۔

☆.....☆

”اتنی دیر لگادی تم نے آنے میں؟“ ولید کو فرصت ہوئی تو وہ عرشان ولی سے ملتے ہوئے گلہ کر بیٹھا۔  
 ”میں تو کب کا آیا ہوا ہوں۔ تمہیں ہی اب فرصت ملی ہے۔“  
 ”آؤ تم لوگوں کو وریشہ سے ملواؤں!“ ولید کے اصرار پر آنسور پریشانی سے سیل فون پر ٹائم دیکھنے لگی۔  
 ”بہت دیر ہو رہی ہے مجھے گھر جانا ہے۔“ وہ پریشانی سے بولی۔  
 ”آؤ پہلے بھابی سے مل لیں پھر میں ڈراپ کر دوں گا۔“ عرشان ولی اسے دیکھتے آگے چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔  
 ”ڈرائیور پہلو میں ہے اور آپ ٹینشن لے رہی ہیں۔“ ولید بے ساختہ ہنسا ہے۔ عرشان ولی نے اس کے

شوئڈر پر مکامارا۔ دونوں گاڑی کی طرف واک کرنے لگے۔

☆.....☆

”جانے ابانے گھر میں کتنا ہنگامہ مچا رکھا ہوگا۔ بے چاری اماں صلو اتیں سن رہی ہوں گی۔ بہت دیر ہوگئی۔“ کار چل رہی تھی۔ عریشان ولی، آنسوؤں کے ٹکڑے چہرے کو بار بار دیکھ رہا تھا۔

”اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہوا بھی گیارہ بجے بھی نہیں بجے۔“ وہ اس کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔

”اکیلی اتنی رات تک بھی باہر نہیں رہیں بھی۔“ وہ فکر مند تھی۔ فردوس صاحب کے غیض و غضب کا احساس اسے ہر اسان کر گیا تھا۔

”تم اکیلی کب ہو؟“ وہ مسکراتے ہوئے ڈھارس دے رہا تھا۔

”میرا مطلب گھر والوں سے ہے۔ میری فیملی۔“ وہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی لیکن وہ چاہنے کے باوجود بھی اپنے گھر کا ماحول اسے ناہتا سکتی تھی لیکن وہ اتنا نا سمجھ بھی نہیں تھا کہ اس کے ہر اسان چہرے کو دیکھ کر کچھ سمجھنا پاتا۔

”یہ مراحل بھی جلد طے ہو جائیں گے پھر تمہیں میرے ساتھ ہوتے ہوئے کسی کا خوف نہیں ہوگا۔“ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر نظر پھیرنا بھول گیا۔ وہ ابھی ابھی سی بی ٹی سے بھی الجھا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی ہتھیلی کی کیکروں کو دیکھنے لگی تھی۔ گاڑی میں خوب صورت سالاب پہلے تھا۔

”آنسو!“ اس نے دھیرے سے پکارا تھا۔

”جی!“ اس نے صدا پر بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی پکار غیر معمولی تھی۔

”اپنی فیملی کو کب بھیجوں تمہارے گھر؟“ وہ اجازت طلب کر رہا تھا۔ آنسو اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

عریشان ولی کی نظریں بھی اس کی نظروں سے الجھی ہوئی تھیں۔

”آپ واقعی serious ہیں؟“ وہ محتاط نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”what rubbish! تو تمہارا کیا خیال ہے flirt کر رہا ہوں۔“ وہ خفگی بھرے انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ جس کلاس سے ہیں وہاں پر کچھ معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔“ جانے انجانے میں اسے اپنی تذلیل یاد آگئی تھی۔ وہی ڈرا سے عریشان ولی پر مکمل بھروسہ کرنے سے روک رہا تھا۔

”میں نے بڑی صاف ستھری زندگی گزارا ہے۔ کوئی ایک برا حوالہ ڈھونڈنے نا ملے گا۔ میں نے اپنے تمام جذبے، محبت صرف ایک ہستی کے لیے بجا رکھے تھے اور جب تمہیں دیکھا تو اللہ نے دل کو مختلف انداز سے دھڑکا کے احساس دلادیا کہ میں جس کا منتظر تھا۔ وہ ہستی تم ہو۔ اب جب تم مل گئیں تو میں کیونکر دیر کروں۔“ عریشان ولی ایک جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ آنسو ایک دم سے چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”اتنی حیرانی کیوں؟“ وہ متحجب ہوا۔ اس کے انداز پر۔

”مجھے لگا میں یہ باتیں پہلے بھی کہیں سن چکی ہوں یا نہیں آ رہا کہاں۔“ وہ ذہن پر زور دے رہی تھی مگر باوجود کوشش کے اسے کچھ یاد نا آ سکا۔

”پلیز رفتار بڑھائیں۔“ وہ وقت کی بڑھتی رفتار پر اتنی ہر اسان تھی کہ سفر کو بھی ٹھیک سے انجوائے نہیں کر پارہی تھی۔



”میں چاہتا ہوں یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ تم یونہی میرے سامنے بیٹھی رہو۔“  
 ”ابا سے جوتے پڑوا میں گے؟“ وہ فکر مند سی اسے دیکھنے لگی۔  
 ”یہ بات ہے تو چلو اب تمہیں جلدی گھر چھوڑ دوں۔“ عریشان ولی نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی۔  
 ”مجھے زندہ سلامت گھر پہنچنا ہے۔ رفتار نارمل کریں پلیز۔“ وہ تیز رفتاری سے دھل گئی تھی۔

☆.....☆

”آپ کی کافی!“ شاہ میر LED پر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھ رہا تھا۔ حمزہ کافی لے کر انٹر ہوئی تھی۔  
 ”Thanks تم نے کیوں زحمت کی ملازم ہیں نا۔“ ایک نظر اس پر ڈال کنگ سائیڈ پر رکھتا وہ دوبارہ  
 اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔  
 ”اور میں نے کتنی بار بتا دیا ہے کہ مجھے ایسے چھوٹے چھوٹے کام کر کے خوشی ملتی ہے۔“ حمزہ اپنی جگہ پر  
 آکر بیٹھ گئی تھی۔

”جیسی تمہاری مرضی!“ وہ ذرا سا مسکرا رہا تھا۔  
 ”شاہ میر مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی۔“ وہ بات کرنے کے لیے کب سے موقع کی تلاش میں تھی۔  
 ابھی موقع ملا تو لفظوں کو ترتیب دینے لگی۔  
 ”ہاں کرو!“ نظریں بدستور اسکرین پر تھیں۔  
 ”بائچ سال ہو گئے ہماری شادی کو لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ لوگوں کی باتوں سے  
 تنگ آ کر میں نے اپنا چیک اپ کروا لیا ہے اب اگر تم.....“ وہ دھیمی آواز میں اسے سمجھا رہی تھی مگر اس کی  
 بات مکمل ہونے سے پہلے ہی شاہ میر تیز آواز میں اس کی بات کاٹ گیا۔  
 ”کیوں فضول باتیں سوچتی ہو۔“ انداز میں حد درجہ ناگواری تھا۔  
 ”اولاد کی خواہش فضول کیسے ہو گئی؟“ حمزہ کو دکھ ہوا۔

”میں چیک اپ کی بات کر رہا ہوں۔ جب اللہ نے دینا ہے دے دے گا۔ صبح و شام ایک ہی لکیر نا بیٹھی  
 رہا کرو۔“ شاہ میر نے ناگواری سے کہا۔  
 ”کیسے نا بیٹوں، تم تو صبح کے گئے رات کو لوٹے ہو گھر میں لوگ ہی کتنے ہیں آنٹی سیدھے منہ بات نہیں  
 کرتیں۔ میں اکیلی بور ہو جاتی ہوں۔ بچہ ہوگا تو سارا دن اس کے ساتھ مصروف رہوں گی۔“ حمزہ کو اس کی  
 لالچلی کھل رہی تھی۔

”تم کوئی مصروفیت تلاش کرو۔ گھر بیٹھی ہو فیلڈ میں آؤ گی تو فضول باتیں ذہن میں نہیں آئیں گی۔“ شاہ  
 میر جانتا تھا اولاد کی کمی نے اسے زور دینا دیا تھا۔ ہر گھڑی وہ اسی ایک کمی کا رونا روتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ  
 سے اب اسے اس ٹاپک سے چڑھی ہونے لگی تھی اور اب چیک اپ کی بات کر کے حمزہ نے جیسے اس کی  
 مردانگی پر شک کر کے اسے چراغ پا کر دیا تھا۔

”تم چیک اپ.....“  
 ”میں نہیں کرواؤں گا چیک اپ..... تمہیں نا ہو مگر مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔“ اس کی بات کاٹ کر شاہ میر  
 نے اٹل لہجہ میں کہہ کر جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔ حمزہ خاموشی سے شاہ میر کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆.....☆

”بس ادھر ہی اتار دیں مجھے۔ کار آگے جانیں پائے گی۔ راستہ خراب ہے۔“ حسب معمول لوڈ شیڈنگ کے باعث پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ آنسو نے شکر ہی ادا کیا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکے گا مگر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے جگہ جگہ ٹولیوں میں بیٹھے مردوں، لڑکوں کو دیکھا تو گلی سے پہلے ہی گاڑی رکوالی۔ گلی بھی اتنی تنگ تھی کہ کار کا رگزر ممکن نہیں تھا۔

”کار اندر نہیں جاسکتی تو کیا ہوا۔ میں گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔“ کار کا انجن بند کر کے عریشان اترنے لگا۔ ”نہیں لوگ دیکھ لیں گے۔ کیوں پٹوانے کے در پر ہو رہے ہیں۔ ابا نے دیکھ لیا تو میری خیر نہیں۔“ وہ گھبرا سی گئی۔ تمہاری پٹائی بھی ہوتی ہے؟“ عریشان دلی کو جیسے صدمہ ہونے لگا۔ وہ تشویش بھری نظروں سے آنسو کو دیکھنے لگا۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ یوں ہی زبان سے نکل گیا جملہ۔“ وہ اس کی تشویش پر ہنس پڑی تھی۔ دوپٹہ سلیٹے سے سر پر لے کر اترنے لگی تھی لیکن اسے رکنا پڑا تھا۔ عریشان دلی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ بے ساختہ مڑ کر اس کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی تھی۔

”جاری ہو؟“ وہ جیسے اس کے جانے پر افسردہ تھا۔

”جی نکل پھر ملنے کے لیے آج جانا تو پڑے گا۔“ اس نے جیسے سمجھا یا۔

”تم چوڑیاں، بریسلٹ نہیں پہنتی؟“ وہ سر ہلا کر اس کی سوئی کلائی کو دیکھتے بے ارادہ پوچھ بیٹھا۔

”زیادہ شوق نہیں ہے۔ اب بھن ہوتی ہے ان چیزوں سے۔“ ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں اس کا لہجہ بارحیا سے دھیمہ ہو گیا تھا۔

”مجھے بریسلٹ بہت پسند ہیں اب سے عادت ڈال لو اب بھن نہیں ہوگی۔“ وہ کہہ رہا تھا اور آنسو بے دھیانی میں سر ہلا کر ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایریا کافی سنسان تھا۔ جس کی وجہ سے کوئی انہیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ اندھیرے کے باعث گاڑی بھی چھپ سی گئی تھی۔

”جی میں خیال رکھوں گی۔“ اس نے مطمئن کرنا چاہا۔

”ارے رکو۔ تمہاری ایک امانت ہے میرے پاس۔“ اُسے جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔ وہ ڈپش بورڈ کے خانے میں تلاش کرنے لگا۔

”میری امانت.....؟“ وہ حیران تھی۔ عریشان دلی ایک کیس نکال چکا تھا۔ کیس کے اندر نازک سا شکارے مارٹنیر بریسلٹ برآمد ہوا۔ جس کے ساتھ نازک سی رنگ بھی جڑی ہوئی تھی۔

”یہ!“ آنسو حیرانی سے بریسلٹ کو دیکھ رہی تھی۔ نگوں کی صوفشانی نے ظاہر کر دیا تھا کہ یہ چمک ڈائمنڈ کی ہے۔ اس کی آنکھیں حیر سے پھٹی جا رہی تھیں۔ عریشان دلی اس کی طرف گھوم کر اس کی نازک کلائی میں بریسلٹ پہنا رہا تھا۔

”کچھ عرصہ پہلے ایک فرینڈ کے ساتھ جیولری شاپ اسے گفٹ دلوانے گیا تھا۔ پسند آ گیا تو تمہارے لیے لے لیا۔ اتفاق سے کار میں ہی پڑا رہ گیا اور دیکھو کیا موقع پر یاد آئی اس کی۔“

”آپ تو مجھ سے پہلے ملے نہیں تھے۔“ جھک کر کلائی چھینتے وہ حیر سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بھلے تم نہیں ملی تھیں مگر میں نے اپنی سز کے لیے لیا تھا اور وہ تم ہی بنو گی۔ انشاء اللہ!“ وہ اس کے ہاتھ پھینچنے پر رک سا گیا تھا۔

”برانا لگے تو پہنا دوں؟“ وہ اجازت طلب کر رہا تھا۔  
 ”یہ بہت قیمتی بے عریشان!“ وہ اتنا مہنگا تحفہ لیتے ہوئے ہچکچاہے تھی۔  
 ”تم سے زیادہ نہیں۔“ اس کے دو ٹوک جواب نے اسے چپ کر دیا تھا۔ اس نے بریسلٹ اس کی  
 کلائی میں پہنا دیا۔

”بہت دیر ہو گئی۔“ اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ اتر آئی تھی۔  
 ”تو میں چلوں؟“ وہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
 ”جی..... لیکن رش ڈرائیو نہیں، نارمل رفتار ہو۔“ وہ فکر مندی سے تنبیہ کر رہی تھی۔ عریشان ولی کو اس کا  
 انداز جہاں کیمرنگ لگا وہیں عجیب سی خوشی بھی محسوس ہونے لگی۔  
 ”جو حکم آپ کا اور کچھ؟“ وہ مسکراتے ہوئے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم جاؤ گلی سنان ہے۔ میں تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔“ وہ سر ہلا کر دوپٹے سے چہرہ کو رکرتی گلی کی  
 سمت بڑھ گئی تھی۔

”سمیارہ بج گئے لیکن تمہاری چیپٹی نہ آئی ابھی تک۔“ قدوس صاحب پلنگ پر بیٹھے چنگھاڑ رہے تھے۔  
 ہاجرہ پریشانی سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”تب سے اب تک میرا خون ہی خشک کر رہے ہیں۔ دعا مانگیں خیر کی..... خدا خواستہ کوئی حادثہ نہ پیش  
 آ گیا ہو۔ ورنہ روشنی اتنی غیر ذمہ دار نہیں کہ ٹائم کا دھیان نہ ہو اسے۔“ ہاجرہ خود متفکر تھیں۔ اس پر سے قدوس  
 صاحب کی باتیں مزید دل جلا رہی تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ہاجرہ نے لپک کے دروازہ کھولا تھا۔  
 آئینہ داخل ہو گئی تھی۔

”اتنی دیر لگا دی۔“ ہاجرہ نے اسے دیکھ کر جہاں شکر کا سانس لیا وہیں استفسار بھی کرنے لگیں۔  
 ”تقریباً تو ابھی چل رہی ہے مگر میں لوٹ آئی۔ پھر راستہ بھی لمبا ہے تو دیر ہو گئی۔“ اس نے غیر ارادی

طور پر کلائی کو دوپٹے سے چھپا رکھا تھا۔  
 ”پریشانی تو نہیں ہوئی آنے میں؟“ ہاجرہ ہی پوچھ رہی تھیں وہ مارے ڈر کے قدوس صاحب کی طرف  
 دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

”سرنے پک اینڈ ڈراپ کی بات کی تھی تو.....“  
 ”میں بتا دوں آگے سے کسی تقریب میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گئی تو ٹانگیں تو زودوں گا۔“ قدوس  
 صاحب شاید زیادہ جھاڑ کے موڈ میں نہیں تھے۔ اس لیے حکم سن کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ ہاجرہ  
 نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔

”سوری اماں! میری وجہ سے آپ کو باتیں سننی پڑی ہوں گی۔“ وہ ہاجرہ کے چہرے کو فکر مندی سے دیکھ  
 رہی تھی۔

”رہنے دو۔ کون سی نئی بات ہے۔ قدوس صاحب کو اللہ موقع دے۔ تم کپڑے بدل کر آرام کر لو۔ میں بھی  
 کمر سیدھی کر لوں۔ صحن کا چکر لگا کر اکڑ گئی ہے۔“ ہاجرہ بھی کمرے کی طرف چلی گئی تھیں۔ اس نے دوپٹے

میں لپٹی کھائی پر غیر ارادی طور پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔  
 عرثمان ولی ڈرائیور کر دیا تھا۔ خوشی، کچھ پالینے کے احساس سے سرشار تھا۔ اسی اثناء میں اس کا سیل فون  
 بجنے لگا تھا۔ سیل فون ڈش بورڈ سے اٹھا کر اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور خوشگوار تاثرات سے کال پک کر  
 لی۔ "Dad"

"کیسے ہو ڈیڈ کی جان؟" فرہاد صاحب محبت سے استفسار کر رہے تھے۔  
 "بہت خوش ڈیڈ!" بھرپور مسکراہٹ سے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال رکھی تھی۔  
 "وہ تو محسوس کر رہا ہوں۔ وجہ نہیں بتاؤ گے؟" وہ شاد تھے۔  
 "Dad i am in love!" مسکراتے لہجے میں کہہ کر وہ لب دانتوں تلے دبا گیا تھا۔  
 "what?" فرہاد صاحب کو بے حد حیرانی ہوئی۔

"yes Dad!" اس نے بھرپور مسکراہٹ سے اقرار کیا۔  
 "Its a sizzling news!" ان کے لہجے میں خوشگوار حیرت تھی۔

"Its a unexpected lovely accident in my life, unfortunately. I  
 am already surprised but I can,t never ever forget this special  
 fell, That called love!"

اپنے جذبات و احساسات کو بیاں کرنے میں وہ بے ربط سا ہو رہا تھا۔ فرہاد صاحب دھیمے سے مسکرا رہے  
 تھے۔ انہیں اپنے لخت جگر کا یہ روپ بے حد خوشی میں مبتلا کر رہا تھا۔ ان فیکٹ آج سے پہلے انہوں نے کبھی  
 اسے اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ کسی لڑکائی کے لیے اس طرح کے جذبات کا اظہار بھی ان کے لیے نیا تھا۔ ورنہ تو  
 وہ صنف نازک سے دوری ہی بنائے رکھتا تھا۔

"Dad you happy na?" اسے ان کی خاموشی محسوس ہوئی۔

"of course!" ڈیڈ کی جان تمہاری خوشی سے بڑھ کر اور کیا ہے۔ پہلی بار تمہیں اتنا خوش دیکھا  
 ہوں۔ مجھے تو اپنی بہو سے ملنے کا اشتیاق ہو رہا ہے۔ کب ملو رہے ہو؟ انہوں نے اشتیاق سے کہا۔  
 "جب آپ کہیں۔" وہ مودب تھا۔

"پندرہ دن کا کام ہے لیکن میں ایک ہفتہ میں ہی مکمل کر کے آنے کی ڈیٹ کنفرم کرتا ہوں۔ تم نے اپنی  
 مام کو بتایا؟" انہیں ماہ پارہ کی کال یاد آگئی۔

"نہیں..... آپ آجائیں پھر بات کرتا ہوں۔" اس نے اپنا پلان بتایا۔

"اوکے چاہو تو بہو کی تصویر وائس اپ کر دو۔ دیکھوں تو کس نے پتھر میں جونک لگا دی۔" فرہاد صاحب

چھیڑ رہے تھے۔

"Come on Dad" وہ جھینپ گیا۔ فرہاد صاحب ہنس پڑے۔

"Miss you Dad! گا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

"Miss you to Dad" اس نے مسکراتے ہوئے کال ڈسکنکٹ کر کے سیل فون

ڈیش بورڈ پر رکھ دیا تھا۔ انگلیوں سے بالوں کو سنوارتے اس نے بے ساختہ فرنٹ سیٹ کو دیکھا جہاں کچھ دیر

قبل وہ اس کے ساتھ براجمان تھی۔

☆.....☆

قدوس صاحب کو صحن میں نہ دیکھ کر دونوں آنسور کی خیریت کے لیے دعا گو تھیں۔ قدوس صاحب نے سستے میں جان چھوڑی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ آنسوران کی فکر مندی پر محبت سے مسکرائی تھی۔ وہ چیخ کر کے آئی تو دونوں اس کے سر ہو گئیں۔  
”کیسی رہی تقریب؟“

”اچھی رہی۔“ وہ ہنسی کے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔  
”آپ کے پاس آئے تھے۔“ وہ کنوارے والے۔“ زوبی اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔  
”وہی ڈراپ کر کے گئے ہیں۔“ وہ ہنسی دبا کر بولی۔  
”کیا؟“ زوبی چیختی اٹھ بیٹھی۔

”کیوں اب اسے جوتے کھانے کا شوق ہو رہا ہے۔ آواز کو قابو میں رکھو۔“ دھیمی آواز میں سرگوشی کرتے اس نے احساس دلایا۔ زوبی سمجھ کر بے ساختہ اپنے منہ پر انگلیاں رکھ گئی۔  
”پھر!“ اب کے زوبی آواز میں سوال ہوا۔

”کیا پھر؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کوئی چالس ہے نا دل والے سین کی طرح۔“ زوبی نے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

”وہ جلد ہی اپنی ٹیملی کو بھیجیں گے۔“ اس نے دھیمی مسکان سجاتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ اب کے زوبی کے ساتھ سوئی کی چیخ بھی بے ساختہ تھی۔ آنسور نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔

”سچ کہہ رہی ہو؟“ سوئی بے یقین تھی۔

”دیکھا میں نہ کہتی تھی۔ ناؤلز میں سچی کہانی ہوتی ہے۔“ زوبی اپنا فلسفہ صحیح ثابت کرنے کو ٹٹلی بیٹھی تھی۔

”تم تو چپ کرو، فضول راگنی لیے بیٹھی ہو۔ دیکھنے میں کیسے ہیں۔“ سوئی نے زوبی کو گھورتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔

”نام کرو جیسے؟“ زوبی نے میگزین میں تصویر دیکھ رکھی تھی۔ آنسور ہنس کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”راج پال یادو، جیسے تو نہیں؟“ زوبی کو افسوس ہوا۔

”ہائے اللہ نہ کرے۔“ سوئی نے جلدی سے دہل کے کہا۔ ان کے اندازوں پر آنسور ہنسنے لگی تھی۔

”بتاؤ نا آپ! مجھے تو نام کروڑ سے زیادہ ابھی تک کوئی بندہ ہینڈل نہیں لگا۔ گڈ لکنگ بھی راج کے ہے۔“

”نام کروڑ سے تھوڑا زیادہ!“ آنسور نے شرارت سے کہا۔

دونوں چھٹائیں لگانے لگی تھیں۔ آنسور نے بریسلیٹ دونوں کو دکھایا۔

”ڈائمنڈ ہے؟“ سوئی کی آنکھیں تھیر سے پھیل گئی تھیں۔ آنسور نے سرشات میں ہلایا۔

”wow کیا ان کے پاس بل کیس سے زیادہ پیسہ ہے۔“ زوبی کا بس نہیں چل رہا تھا ڈانس کرنا شروع

کر دے۔

”یہ اتنے مشہور لوگوں کے نام کہاں سے یاد کر رکھے ہیں تم نے؟“ آنسور اس کے سر پر چپٹ لگا کر مسکرائی۔



عرشان ولی کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ جب دائیں بائیں کر کے تھک گیا تو سیدھا لیٹ کر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے پیچھے کر لیا۔ چند ثانیے آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔ پھر بھی چین نہ آیا تو سیل فون اٹھا کر بے ساختہ آنسو کا بھر ڈال کر بیٹھا۔

آنسو بھی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وابرنیشن موڈ پر رکھا سیل فون وابرنیٹ کرنے لگا۔ عرشان ولی کا نام دیکھ کر اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔ روہی اور سونی پر نظر ڈالی دونوں کتنی ہی دیر اسے چھیڑنے کے بعد پلنگ پر لیٹی تھیں۔

”جی!“ اس نے دھیمی آواز سے کال ریسیو کی۔

”یہ کیا بلا پیچھے لگا دی تم نے میرے؟“ عجب جھنجھلایا ہوا لہجہ تھا۔

”میں نے؟ کون سی بلا؟ آپ نے شاید غلطی سے مجھے کال کر دی ہے۔“ وہ چونک کر حیرانی سے کہہ رہی تھی۔

”میں نے بقائمی ہوش و حواس میں تمہیں فون کیا ہے اور یہ جو بلا ہے محبت میں اس کے متعلق تم سے پوچھ رہا ہوں۔ حد ہو گئی یا ر۔ کروٹ بدل بدل کر تھک گیا ہوں۔ نیند ہے کہ آکے نہیں دے رہی ہے۔“ اس کے لب و لہجے کی دلکشی اپنی جگہ۔ آنسو کے لبوں پر بے ساختہ شرمیلی مسکان پھیلی گئی تھی۔

”تو یہ ہے، آپ نے تو ڈرا ہی دیا۔“ وہ آواز دبا کر بول رہی تھی۔

”تھوڑا تیز بول لو۔ ہم باتیں نہیں سن رہے۔ ہم سو رہے ہیں۔ چادر منہ سے ہٹا کر روہی سونی نے سر باہر نکالا تھا۔ عرشان ولی کا قبضہ بے ساختہ تھا۔ آنسو پٹپٹا گئی تھی۔ دونوں نے دھماکہ منہ پر چادر ڈال لی تھی۔

”یہ کس کی آوازیں تھیں؟“ وہ استفسار کر رہا تھا۔

”چھوٹی بہنیں ہیں۔ آپ سے ملنے کا شوق ہے انہیں۔“ وہ غائبانہ متعارف کروا رہی تھی۔

”اچھا! میں نے بھی ڈیڈ کو تمہارے متعلق بتایا ہے۔ دیکھنے کی خواہش ظاہر کر رہے تھے۔“

”عرشان! مجھے یہ سب آسان نہیں لگ رہا۔ آپ نے اپنے ڈیڈ کو میرا بیک گراؤنڈ بتایا ہے۔“ وہ لگزمندی سے اپنی کم مائیگی کا اظہار کر گئی۔ جس کا احساس اسے ٹھیک سے خوش ہونے بھی نہیں دے رہا تھا۔

”ابھی تو نہیں لیکن تم ٹینشن نہ لو۔ عرشان ولی نے پیچھے ہٹنا نہیں سیکھا۔ تمہیں یوں ہی اپنا نہیں کہا۔ بس تم فوڈ کو میری امانت سمجھو۔“ مضبوط لہجے میں اسے یقین دلا رہا تھا۔ اس کی پرفسوں باتیں اور لب و لہجے نے آنسو کے دل کی دھڑکنوں کو منتشر کر دیا تھا۔



قدوس صاحب گھر سے نکلے تھے۔ چند قدم ہی چلے تھے کہ انہیں پڑوسی وہاں بل گئے۔

”ارے کیا حال ہیں بھائی قدوس!“

”کرم ہے مالک کا۔ تم سناؤ۔“ قدوس صاحب مصافحہ کر رہے تھے۔

”کیا ہوا نوکری کا۔ کہیں بات بنی؟“ وہ ہمدرد بنے بیٹھے تھے۔

”نہیں بات تو کئی جگہ کی ہے مگر بلا دائیں آیا ابھی۔“ بے زاری سے تذکرہ کیا۔

”ہاں آنسو ریٹی نوکری کر رہی ہے۔ پھر کاہے کی فکر ہوگی تمہیں۔ ہانڈی روٹی تو چل ہی رہی ہوگی۔“

وہاب کا لہجہ ذومعنی تھا۔ قدوس صاحب چونک گئے۔

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“ غصے سے انہیں دیکھا۔

”میں نے کیا کہنا ہے بھائی۔ رات آنسو راتناج سنور کر کاروالے کے ساتھ آئی تھی۔ اپنی چھت سے مجھے کاروالے کی شکل تو نظر نہ آئی مگر اسامی اوپچی تھا۔ کار کی قیمت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“ وہاب کالب و لہجہ قدوس صاحب کو چھریا تھا۔ ان کا فون اپنے کان سے لگا تھا۔

”آنسو شادی میں گئی تھی اپنے باس کی۔ آفس کی گاڑی تھی وہ۔“ غصہ ضبط کرتے کرتے انہوں نے جواب دیا۔

”مجھے کیا پتا، سچ جھوٹ کا بھائی۔ تم باپ ہو تم کہہ رہے ہو تو سچ ہی ہو گا مگر دیکھنے والے تو کوئی اور ہی معنی نکالیں گے نا۔“

وہاب صاحب بڑے آرام سے کہتے قدوس صاحب کے قدم واپس گھر کی طرف موڑ گئے تھے اور خود وہاب صاحب استہزائیہ مسکراہٹ سجا کر اپنی راہ ہو لیے۔

☆.....☆

آنسو چائے پی رہی تھی۔ ہاجرہ پاپے چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھیں۔ تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ مارے ڈر کے ہاجرہ کا پاپا چائے میں گر گیا۔

”کیا آفت آگئی؟“ ہاجرہ وہل گئیں۔ آنسو بھی چونک گئی تھی۔ قدوس صاحب غیض و غضب سے سر نہ چہرہ لیے داخل ہوئے۔

”وہ بھی آجائے گی۔ پہلے اپنی لاڈلی سے پوچھ رات کس کے ساتھ کار میں آئی ہے۔ محلے والے مجھے ذلیل کر رہے ہیں۔“

قدوس صاحب غصے سے دھاڑ رہے تھے۔ آنسو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”بتا کب سے ہماری آنکھ میں دھول جھونک رہی ہے۔“ قدوس صاحب آنسو کی طرف بڑھے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو کر دیوار سے لگ گئی۔

آنسو دیوار سے لگی شا کدھی۔ قدوس صاحب بگڑے تیور سے گھور رہے تھے۔

”رات بتایا تو تھا اس نے، آفس کی گاڑی تھی۔“ ہاجرہ نے اسے کٹہرے میں دیکھا تو مدد کو آئیں۔

”چپ کیوں ہے بول، ورنہ زبان گدی سے پھینچ لوں گا۔“ قدوس صاحب بھڑکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”ابا.....! وہ..... باس آئے تھے چھوڑنے۔“ آنسو نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”اس کی تو مایوں تھی۔ وہ مایوں چھوڑ کر تجھے ڈراپ کرنے آ گیا۔“ قدوس صاحب غضب ناک ہو رہے تھے۔

”دوباس ہیں، شازبہ کے ابو کی طبیعت خرابی کی کال آگئی تو وہ وہیں نزدیکی اسپتال چلی گئی۔ مجھے سرنے ڈراپ کر دیا۔“ وہ ہکلا گئی تھی۔

”کیوں بچی کے سر پر سوا ہو۔ کہہ تو دیا اس نے سچ..... محلے والے آنے جانے پر نظر رکھتے ہیں تو انہیں ہانڈی روٹی کا بھی کہہ دو۔ بٹھالیتی ہوں اسے گھر پر۔ زنجیر پیروں میں ڈال کر۔“ ہاجرہ خشکیں نظروں سے قدوس صاحب کو دیکھتے غصے سے کہہ رہی تھیں۔ آنسو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ قدوس صاحب



دونوں کو گھورتے ٹھوکر سے دروازہ کھولتے باہر چلے گئے تھے۔  
 ”چپ کر، چتا تو ہے، کیسا باپ اللہ نے متھے ڈالا ہے۔ چائے پی، دین آنے والی ہوگی۔“ باجرہ دکھ سے  
 اس کے آنسوؤں کو دیکھ رہی تھیں۔ اچھا کر کے بھی وہ بری بن جاتی تھی۔

☆.....☆

واصفہ نے کئی بار دروازے پر دستک دی مگر جواب نہ دار د تھا۔ واصفہ کو تشویش ہونے لگی۔ زویا صبح سے  
 کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ اب تو شام بھی ڈھلنے لگی تھی۔ واصفہ بے ساختہ چابی لیے آگئی۔ اس سے پہلے وہ  
 کئی بار زویا کا سیل نمبر چیک کر چکی تھیں۔ سیل جاری ہی تھی مگر وہ کال پک نہیں کر رہی تھی اسی تشویش نے  
 واصفہ کو اس کے کمرے کا لاک کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

لاک کھول کر واصفہ نے کمرے میں قدم رکھا مگر پیروں تلے کوئی چیز آجانے پر ان کے قدم بے ساختہ  
 ڈمک گئے۔ کمرہ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ انہوں نے اندازے سے دائیں جانب ہاتھ مار کر سوچ  
 بورڈ تلاش کیا اور سوچ بورڈ پر ہاتھ پڑے ہی انہوں نے سارے بدن آن کر دیئے۔

کارپٹ فلور کشن پر ہر طرف سگریٹ کے ٹوٹے بکھرے پڑے تھے۔ کشن جگہ پر نہیں تھے۔ قدموں تلے  
 کشن کو اٹھا کر سائیڈ پر رکھتے انہوں نے ناگوار مہک کو سونگھنے کی کوشش کی۔ سگریٹ کے ٹوٹے کو اٹھا کر  
 سونگھا۔ زویا دھت الٹی بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ ٹوٹے کو سونگھتی واصفہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ  
 گئیں۔ وہ دوسری نظر بے سدھ پڑی زویا پر ڈالتی اس کی طرف بڑھیں۔ زویا کے سر ہانے بیٹھ کر واصفہ نے  
 اس کے بکھرے بالوں کو اس کے چہرے سے ہٹایا۔ زویا کا سستا ہوا چہرہ ان کے سامنے تھا۔ سیاہی مائل  
 ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ واصفہ دکھ سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔

”زویا!“ بیٹی کے گال دیکھ سے تھپتھاتے واصفہ کا لہجہ دگرگت تھا۔  
 ”ہو!“ زویا نے پلکیں جھپک جھپک کر مسلسل پکار کر آنکھیں کھولنے کی سعی کی مگر مسلسل کوشش پر چند  
 سیکنڈز سے زیادہ آنکھیں نہیں کھل پاری تھیں۔ نشہ سرچڑھ کے بول رہا تھا۔  
 ”بہت دیر ہو گئی ہے، اٹھ جاؤ زویا۔“ واصفہ اس کی مخمور آنکھوں پر افسردہ تھیں۔ ان کی بیٹی یہ کس ڈگر پر  
 چل پڑی تھی اگر وہ حقیقت کی نظر سے اس کی آزادانہ فطرت کا جائزہ لیتیں تو انہیں اپنی کوتاہی بھی بخوبی نظر  
 آ جاتی جو انہوں نے بچوں کی پرورش کرتے وقت برتی تھی۔  
 ”کیا ہے۔ جائیں آپ۔ مجھے سونے دیں۔“ نشے میں پورا آواز سے کہہ کر وہ کشن دیوچ کے رخ پھیر  
 کے سو گئی۔

☆.....☆

یہ دنیا جب تک باقی ہے  
 میں تیرا ساتھ نہ چھوڑوں گا  
 تیرے آپچل کے اک جھونکے سے  
 رخ طوفان کے موڑوں گا

انٹرکام مسلسل بج رہا تھا۔ ولید راؤنڈ پر تھا۔ آنسو رنے پریشان نظروں سے انٹرکام کو دیکھا۔  
 ”اٹھا کیوں نہیں رہیں۔“ شازیہ نے اسے حیرانی سے دیکھ کر انٹرکام اٹھایا۔ اس کے والد کی طبیعت

آنسور نے انک انک کر اسے اپنی مشکل سمجھائی۔ چند ثانیے عریشان ولی اس کے لفظوں کو تواتر رہا۔  
 ”کہہ دیتیں میں نے پہنایا ہے۔“ پھیڑنے والا انداز تھا۔

”میرے لیے یہ کہنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ مرد ہیں۔ آپ کے پاس پاد رہے، آپ سے کوئی نہیں پوچھے گا اگر کسی کو بھنگ بھی پڑ گئی تو لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ میرے کردار پر باتیں بنائیں گے۔“  
 آنسور کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیکھا ہو گیا تھا۔  
 ”ادھر دیکھو۔“ عریشان ولی اس کے لفظوں کی آج کو محسوس کرتا رہا۔ پھر ہولے سے کہا۔ آنسور چپ بیٹھی رہ گئی۔

”آنسور! میری طرف دیکھو۔“ عریشان ولی کا محبت بھرا اصرار اسے مشکل سے دوچار کر گیا تھا مگر مانتے ہی بنی۔  
 ”جی!“ ایک نظر اس کے وجہیہ چہرے پر ڈال کر وہ سر دوبارہ جھکا گئی۔

”کوئی ٹینشن ہے؟“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے چند قدموں کے فاصلے پر میز سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ آنسور نے ٹپٹی میں سر ہلایا۔  
 ”ادھر دیکھو میری طرف۔“ اسے آنسور کا انداز پریشان کر رہا تھا۔ اس کے اصرار پر آنسور کے دل کی دھڑکن متوش ہو گئی تھی۔ آنسور نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ ذہانت سے چستی آنکھیں اس کی آنکھوں سے لڑی تھیں۔

”تم روئی ہو؟“ عریشان ولی کے لہجے میں حد درجہ تحیر آ گیا تھا۔ آنسور نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔  
 ”آنسور!“ اپنا ہاتھ اس کی ٹھوڈی کے نیچے رکھ کر وہ پکار رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر چھلکنے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔ یہ شخص چند دنوں میں اتنا عزیز ہو گیا تھا کہ اس کے چھن جانے کے خوف سے اسے سانس لینا بھی محال لگنے لگا تھا۔ معاشرتی ڈراوے اسے بھوت بن کر ڈرانے لگے تھے۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہہ نکلے۔

”فارگا ڈسک! بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟“ اس کے ایک دم سے رونے پر وہ استعجاب کے ساتھ پریشانی میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔  
 ”بولو! کیا ہوا ہے؟“ اس کا ہاتھ تھامے وہ آنسو صاف کر رہا تھا۔ آنسور سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بس روئے جا رہی تھی۔

”میری برداشت کی خدمت آزماؤ، بتاؤ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔“ اب کے عریشان ولی کو اس کی خاموشی غصہ دلانے لگی۔ آنسور کی چپ برقرار تھی۔ عریشان ولی نے سخت طیش کے عالم میں منکا میز پر مارا۔  
 ”ارے!“ آنسور روتے روتے اسے دیکھنے لگی۔ مضبوط میز پر دراڑ پڑ گئی تھی۔ ممکن تھا دوسری بار کوشش پر میز زمین بوس ہو جاتی اور ایسا جلد ہی ہوتا کیونکہ عریشان ولی اگین پھر عمل دہرانے کا ارادہ کر رہا تھا مگر اس سے پہلے آنسور نے اس کی کلائی سختی سے تھام لی۔

”پلیز یہ نہ کریں۔“ وہ روئی روئی آواز میں کہہ کر اس کے ہاتھ کا جائزہ لینے لگی جس پر سرخی چھلکنے لگی تھی۔  
 ”میری وجہ سے خود کو اذیت نہ پہنچائیں۔“ وہ کرب محسوس کرنے لگی۔  
 ”اگر تم مزید روئیں اور مجھے وجہ نہیں بتائی تو میں اس سے زیادہ خود کو نقصان پہنچاؤں گا۔“ وہ سختی سے گویا

رات سنبھل گئی تھی۔ رات ہی گھر شفٹ ہو گئے تھے جس کے باعث شازیہ آفس آگئی تھی۔  
 ”یس سر!“ شازیہ انٹرکام اٹھا کر دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ دوسری طرف ولید کے روم سے عثمان  
 ولی تھا جس نے آنسوؤں کے چہرے پر پھیلی پڑمردگی آتے ہی دیکھ لی تھی۔ رات وہ اسے ٹھیک ٹھاک ڈراپ کر  
 کے لوٹا تھا پھر کیا وجہ تھی افسردگی کی۔ شازیہ کے باعث وہ اس سے پوچھ نہ سکا۔ آنسوؤں نے اسے دیکھ کر جس  
 طرح نظریں چرائی تھیں وہ بھی اسے عجب سے احساس سے دوچار کر گیا تھا۔ آنسوؤں کو بھی خبر ہو گئی تھی عثمان  
 ولی کا سامنا کرنا ہی پڑے گا تب ہی بجتے انٹرکام نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ اس وقت اس کا سامنا نہیں  
 کرنا چاہتی تھی۔ قدوس صاحب کے کیے سلوک نے اسے ملول کر دیا تھا۔ دل بوجھل تھا، آنکھیں بار بار گیلی  
 ہو رہی تھیں۔

”مس آنسوؤں کو اندر بھیجیں!“ عثمان ولی نے پروفیشنل انداز میں شازیہ کو ہدایت دی تھی۔  
 ”جی سر!“ شازیہ نے انٹرکام رکھتے آنسوؤں کی طرف نظر ڈالی جو سہی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔  
 ”سر عثمان بلارہے ہیں تمہیں۔“ شازیہ نے اسے پیغام دیا۔  
 ”کس لیے؟“ آنسوؤں کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”What do you mean about that?“  
 آنسوؤں ہم یہاں ایمپلائز ہیں اور باس ہمیں کام کے سلسلے میں کسی بھی وقت کال کر سکتے ہیں۔ اپنے دماغ  
 میں بٹھا لو یہ بات۔“ شازیہ کو اس کا سوال عجیب لگا جس پر اس نے یکپھر جھاڑ دیا۔ آنسوؤں خود کو کوس کر رہ گئی۔  
 وہ کون سا ان کے درمیان موجود جذبوں سے آگاہ تھی۔ اس نے پروفیشنلی جواب ہی دینا تھا۔  
 ”Go! سرویٹ کر رہے ہیں۔“ اسے اپنی جگہ پر جما دیکھ کر شازیہ نے زور دے کر کہا۔ آنسوؤں روتی  
 سے ولید کے روم کی طرف بڑھ گئی۔

”Yes!“ آنسوؤں نے تھکے انداز میں دستک دی جس پر عثمان ولی کا جواب موصول ہوا تھا۔ آہستہ  
 آہستہ چلتی اس کی میز تک آئی۔ عثمان ولی نے باریکی سے اس کے انداز کو دیکھا تھا بلیک کلر کے سوٹ میں  
 ابھی ابھی نظریں چرائے اس کے سامنے انگلیاں پٹخانی کھڑی تھی۔

”بیٹھو!“ خود وہ اپنی چیئر پر بازو موڑے کھڑا تھا۔ اسے بیٹھنے کا حکم دینے لگا۔ آنسوؤں نے ایک نظر اس پر ڈالی  
 اور اگلے ہی لمحے نظر پھیر کر اس کے سامنے براجمان ہو گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی پرہیز کر رہی تھی۔ وہ  
 جو اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ عثمان ولی چند ثانیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر چلتا ہوا میز کی دوسری طرف آکر اس کے  
 قریب میز سے کمر کا کرہا تھ سینے پر باندھے اسے دیکھتا رہا۔ آنسوؤں اس کی خاموشی پر کچھ پزل سی ہو رہی تھی۔  
 اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی کہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکے مگر نظر سینے پر بندھے ہاتھ سے آگے نہ  
 جاسکی۔ مضبوط کلائی میں بلیک روٹیکس پڑی ہوئی تھی۔ بلیک شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک فولد تھیں۔

”بریسلیٹ کیوں اتار دی؟“ وہ اس کی سونی کلائی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ گھمبیر خاموشی کا پردہ چاک  
 ہوا تھا۔

”پرس میں ہے۔“ آنسوؤں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔  
 ”پرس میں رکھنے کی چیز ہے؟“ وہ الٹا استفسار کر رہا تھا۔ آنسوؤں لب کچلنے پر مجبور تھی۔  
 ”میں کیسے پہن کر رکھ سکتی ہوں۔ کسی نے دیکھ لیا تو سوال کریں گے اور میں کیا جواب دوں گی سب کو۔“

تھا۔

”کچھ لگائیں اس پر، سو جن آجائے گی۔“ نفی میں سر ہلاتے آنسو اس کے ہاتھ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ لہجہ روہنا تھا۔

”سب ہو جائے گا پہلے تم رونے کی وجہ بتاؤ۔“ اس کی بھیگی پلکوں پر نظریں جمائے وہ ضدی لہجے میں گویا تھا۔

”رات پڑوسی نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیا۔ ابا نے بہت غصہ کیا۔“ آنسو کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ عثمان ولی کے چہرے پر تردد کی لکیریں گہری ہونے لگیں۔ اسے آنسو کے بیک گراؤنڈ کا انداز تھا، جہاں کسی کے ساتھ دیکھے جانے کا کیا مطلب لیا جاتا تھا یا لڑکی کو کتنی باتیں اور کیسے رویے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آنسو رسکی بھرتے آنسو صاف کر رہی تھی۔

”رونیں پلیر، ورنہ میں جانے کیا کرگزروں۔ مجھے تمہاری آنسو تکلیف دے رہے ہیں۔“ وہ اس وقت خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس کی اذیت تکلیف دے رہی تھی۔ وہ اس کی کلاس سے نہیں تھی جو اس کے ساتھ گھومتی پھرتی آزادانہ ہولٹنگ کرتی۔ وہ اس طبقے سے تھی جہاں لڑکی کسی سے ضرورتاً بات بھی کر لے تو فسانہ بن جایا کرتا ہے۔

”ابا نے مارا ہے؟“ وہ اس کے مسلسل رونے پر تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ آنسو نے نفی میں سر ہلادیا۔

”پھر رو کیوں رہی ہو؟“ اسے حیرانی ہوئی۔

”پہلے ابا کے ہاتھوں ہوئی اپنی بے عزتی پر رونا آرہا تھا۔“

”اور اب.....“ سوال ہوا۔

”اب آپ کے ہاتھ کی تکلیف محسوس کر کے رونا آرہا ہے۔“ وہ ایک بار پھر رو پڑی تھی۔

”یا اللہ! کیسی جھلی لڑکی ملی ہے۔“ اس کے سر پر چپٹ لگاتے وہ ہنس پڑا تھا۔



واصفہ نڈھال انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر دکھ ورنج کے تاثرات تھے۔ زویا کے کمرے کا منظر یاد کر کے وہ بے ساختہ اپنا سر تھام کر بیٹھیں۔ خرم کمرے میں داخل ہوئے، چند گھنٹے قبل ہی وہ لوٹے تھے۔ خرم صوفے پر بیٹھ گئے۔ واصفہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”سالوں بعد لوٹا ہوں اور ایسا استقبال۔“ خرم ان کے انداز کو ناگوری سے دیکھ رہے تھے۔

”آپ اس سے کہیں زیادہ برے استقبال کے حق دار ہیں۔“ واصفہ سخت طیش میں آگئی تھیں۔ انہیں اپنی

اور بچوں کی زندگی میں بے تربیتی کی وجہ ہمیشہ سے خرم صاحب لگے تھے۔

”برسوں بیت گئے مگر تمہارا آج بھی وہی لب و لہجہ ہے۔“ خرم کبیدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض کردوں، اب اس میں مزید کڑواہٹ آگئی ہے۔“ واصفہ نے جتاے

ہوئے کہا۔

”آخر میں نے ایسا کیا کیا ہے، دوسری شادی کرنا گناہ ہے کیا؟“ خرم برسوں پرانی بحث سے چڑ گئے۔

جب کبھی پاکستان آتے تھے یا واصفہ ان کے پاس جاتی تھیں ان کے درمیان یہ رخ موضوع ضرور زیر بحث رہتا تھا۔

”بزنس کی آڑ میں انگلینڈ جا کے بس گئے۔ چند مہینوں میں وہاں شادی بھی رچالی، چار بچے بھی کر لے اور یہاں مجھے اور میرے دو بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔“ واصفہ کو برسوں پرانی میاں کی بے وفائی بھولی نہیں تھی۔

”کیوں گھسے بچے ڈائلاگ بول رہی ہو۔ پیسے کی فراوانی، نوکروں کی فوج کیا نہیں دیا تمہیں میں نے۔“ خرم صاحب کو بھی غصہ آنے لگا۔

”سب کچھ دیا مگر مجھے اور میرے بچوں کو اپنے وجود کا سایہ نہ دے سکے۔ جب زویا، کا شان چھوٹے تھے اور اچانک ان کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی تو میں اندھیری رات میں اکیلی انہیں اسپتال لے کر بھاگتی تھی۔ میرے بچوں کی کوئی محرومی آپ کو یاد نہیں۔ پیسا ہر مرض کی دوا نہیں ہے، خرم صاحب!“ واصفہ چختے ہوئے بے حد تلخ لہجے میں انہیں حقیقت کا آئینہ دکھا رہی تھیں۔ انہیں وہ تمام وقت یاد آنے لگے جب وہ اکیلی اپنے بچوں کے لیے ہر جگہ کھڑی ہوتی تھیں۔ خرم خاموشی سے واصفہ کے غصیلے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

”آپ نے اپنا سارا وقت دوسری بیوی اور اس کے بچوں کے نام کر دیا۔ ابھی میرا اور میرے بچوں کا حق ادا کیا آپ نے؟ آج میری اولاد جس مقام کو پہنچی ہے اس کی وجہ آپ ہیں صرف آپ۔“ واصفہ نفرت و عناد کا مظاہرہ کر کے واک آؤٹ کر گئی تھیں۔ خرم صاحب چپ بیٹھے رہ گئے۔

☆.....☆

وہ تیری گلی کے تیر وہ نظر نظر پہ پہرے

وہ میرا کسی بہانے سے تجھے دیکھتے گزرتا!

”اب کیسی طبیعت ہے انگل کی۔“ دونوں فری بیٹھی تھیں جب آنسور نے بیٹو سے استفار کیا۔ اس کے والد کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی جس کے باعث وہ تین چار دن کے بعد آفس آئی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے اب ٹھیک ہیں، تم گئی تھیں سرولید کی شادی میں؟“ شازیہ کو شادی میں نہ جانے کا افسوس تھا۔

”مایوں میں دیر ہونے کے باعث جتنی دیر ہوئی اس کے بعد ابانے جانے نہیں دیا۔“ خالی صفحے پر لکھیں کھینچتے اس نے سست روی سے جواب دیا۔

”آج آئیں گے سرعرشان کچھ بتایا تھا انہوں نے، کوئی میٹنگ وغیرہ؟“ شازیہ آفس کے معاملات پوچھ رہی تھی۔ ولید شادی کے سلسلے میں چھٹیوں پر تھا۔ شازیہ کے سوال نے اسے پزل کر دیا۔

”نہیں! آنے کی تو کوئی ٹائمنگ نہیں بتاتے۔ مشکل سے ایک گھنٹے کے لیے آتے ہیں۔ اصل شامت انچارج کی آئی ہوئی ہے۔“ اس نے ہزار کوشش کر کے سرعرشان کے ذکر پر لہجہ سرسری ہی رکھا تھا۔

”ہاں سرعرشان کو اپنا بزنس بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ میں تو ان کی روز روز کی آمد پر ہی حیران ہوں۔ ورنہ کہاں مہینوں بعد شکل نظر آتی تھی۔“ شازیہ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ آنسور کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی جسے چھپانے کے لیے اس نے بے ساختہ ہاتھ لب پر رکھ لیے تھے۔ آڑی ترچھی لکیریں بناتے

وہ اسی کو سوچ رہی تھی۔ شازیہ آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اسی لمحے آنسور کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور سرعرشان کا لنگ پر بے طرح چومک گئی۔

”السلام علیکم!“ شازیہ کو وز دیدہ نظروں سے دیکھ کر اس نے دھمے سروں میں کہا۔

”والسلام! اپنی چیزیں سمیٹ کر پرس میں ڈالو اور پارکنگ کی طرف آؤ۔“ آفس کے پارکنگ میں مرسدیز پارک کر کے وہ باہر نکل آیا تھا۔ گاڑی سے ٹیک لگاتے اس نے آنسوؤں کی آواز سننے ہی حکم دیا تھا۔

”جی!“ دوسری طرف اس عجیب و غریب فرمانی حکم پر آنسو بے طرح چونک گئی۔

”آپ نے شاید کسی اور کے بجائے مجھے غلطی سے کال کر دی ہے۔“ اس نے احساس دلایا۔

”جی نہیں، میں نے آپ ہی سے ارشاد فرمایا ہے۔ ایسی فرمائشیں میں ہر کسی سے نہیں کرتا پھرتا، اٹھو بھی۔“

عرشان ولی نے بے حد جتاتے لہجے میں کہہ کر آخر میں دھونس سے کہا۔

”بات کیا ہے؟“ آنسو ریشیاں ہو گئی۔

”تم آؤ تو بتانا ہوں۔“ وہ کچھ نہ بتاؤں گا کی تفسیر بن گیا۔

”اُف!“ آنسو کو اس کی ضدی طبیعت کی خبر ہو گئی تھی۔

”خیریت؟“ شاز یہ کال سے فری ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی دیکھ کر پوچھ نہ تھی۔

”شاز یہ سے کہو گھر میں ایمر جنسی ہو گئی ہے تم آف کر رہی ہو۔“ ادھر سے پٹی پڑھائی گئی۔

”کیا؟“ آنسو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”کیا کیا کرتی رہیں تو اندر آ کر خود ہاتھ پکڑ کر کھینچتا لے جاؤں گا، پھر بدیتی رہنا شاز یہ کے سوالوں کے جوابات۔“ عرشان ولی کی دھمکی پر آنسو کو حقیقتاً ٹھنڈے پیسے آنے لگے۔ کچھ بعید نہ تھا وہ کر بھی گزرتا۔

”اچھا!“ آنسو نے مری آواز میں ہنکارا بھرا۔

”اٹھو فوراً!“ وہ چڑ گیا۔ آنسو نے اپنی مکھڑی چیزیں پرس میں ڈالنا شروع کر دی۔

”جار ہی ہو؟“ شاز یہ نے حیرانی سے اس کے ٹیک کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”گھر میں ایمر جنسی ہو گئی ہے، میں آف کر رہی ہوں۔“ آنسو نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”کیا رٹو طوطا کی طرح بہ حرف دہرایا ہے تم نے۔“ دوسری طرف وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”اوکے تم ریلیکس ہو کر چل جاؤ، میں سر عثمان کو انفارم کر دوں گی۔“ شاز یہ نے دلاسا دیا۔

”اس سے کہو سر لائن پر ہی ہیں۔“ وہ چھیڑنے لگا۔

”آپ تو چپ کریں۔“ اس نے جھلا کے اسے ڈانٹ لگائی۔

”تم تو ابھی سے رعب جمانے لگیں۔“ اس نے مزا لیا۔ آنسو کے کان سے سیل فون لگا ہوا تھا۔ جس میں سے شگفتہ جملے ابل رہے تھے۔ آنسو نے شاز یہ سے ہاتھ ملا کر اشارے سے اپنے جانے کا ہتا کر واک کرنا شروع کر دیا۔

”گڈ گرل! تم نے چلنا شروع کر دیا، آواز آرہی ہے تمہارے قدموں کی۔“ وہ مرسدیز کی ڈیگی پر چڑھ کے بیٹھ چکا تھا۔

”دیرنی فنی!“ پرس کے اسٹریپ کو بائیں ہاتھ سے پکڑے سیل فون کان سے لگائے خارجی راستے کی طرف واک کر رہی تھی۔

”کیا چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہو، اسپید بڑھاؤ۔“ بے حد مسکراتے ہوئے وہ چھیڑ رہا تھا۔

”اب کیا پیرس پر رکھ لوں۔“ وہ چڑ گئی۔ اس کا تہقہ نہ بنے ساختہ تھا۔ آنسو پارکنگ کی طرف آگئی تھی۔

بلیک جینز بلیک ٹی شرٹ اور بلیک سیلیویس جیکٹ پہنے عریشان ولی بے حد ہینڈم لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جپ لگا کر نیچے اتر آیا تھا۔ ٹی شرٹ کی آستینیں حسب معمول کہنی تک چڑھی ہوئی تھی۔ بلیک گلاسز آنکھوں پر چڑھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر آنسوڑ کو اپنے دل کی دھڑکنیں الگ تال پر چلتی محسوس ہوئیں۔

”فرمائیں کیا پریشانی ہو گئی آپ کو؟“ آنسوڑ نے قریب آ کر استفسار کرتے سیل فون کان سے ہٹایا۔

”پڑ کے بھی حسین لگتی ہو۔“ گلاسز بالوں پر نکاتے اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ عام سے علیے میں بھی وہ اسے بہت خاص لگتی تھی۔

”آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے کہ میں تعریف پر خوش ہو جاتی ہوں۔ کیوں بلایا ہے اس طرح؟“ وہ نروٹھی ہو رہی تھی۔

”تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔“ اس نے لب دباتے ہوئے شریر نظروں کے ساتھ کہا۔

”حد ہے۔“ آنسوڑ کے لبوں پر شر میلی مسکان پھیل گئی تھی۔ وہ جس پریشانی سے یہاں آئی تھی فریش فریش سے عریشان ولی کو دیکھ کر احساسات و محسوسات بہت خوشگوار ہو گئے تھے۔ جیکٹ کی چمکتی زپ جو کھلی ہوئی تھی اس سے اوپر اس کی نظر نہ جاسکی جو وہ اس کے تاثرات دیکھتی۔“

”ولید اور اس کی سسر کوڈنر برانوائیٹ کیا ہے اور آپ میرے ساتھ چل رہی ہیں۔“ اس کے شوڈر سے پرس کے اسٹریپ پکڑ کر اس نے گرفت مضبوط کی اور اس کا پرس لے لیا۔

”What? no never!“ وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی جیسے وہ زبردستی اسے ساتھ لے جانے کا اور کچھ ٹائیے بعد اس کی باؤ لیٹکو توج سے ہوا بھی یہی۔

”آپ سے رائے نہیں مانگی محترمہ! فیصلہ سنا رہا ہوں چلو۔“ دو قدم آگے بڑھ کر عریشان ولی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کی طرف کیا۔

”کیوں پٹوانے کے در پر ہیں، دیر ہو جائے گی۔“ اس نے مرسڈیز کے کھلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے کہا۔ جو عریشان ولی نے اس کے لیے کھولا تھا۔

”ابھی پانچ بج رہے ہیں۔ سات بجے ہوٹل پہنچ جائیں گے اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے تم اپنے گھر پر ہو گی پرامس۔“

وہ سب پلان کیے بیٹھا تھا۔ اسے اس کی گھر پہنچنے کی ٹائمنگ بتا تھی تب ہی اس نے ڈنر جلدی پلان کیا تھا۔ وہ اسی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ آنسوڑ شش و پنج میں گھری ہوئی تھی۔

”Trust me na!“

وہ دروازے پر ہاتھ رکھے ذرا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آنسوڑ چند ٹائیے اسے دیکھتی رہی پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ عریشان ولی نے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی پارکنگ سے نکل گئی۔

”ڈنر سات بجے تو ابھی ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ رخ موڑ کر عریشان ولی کی طرف متوجہ تھی جس کے مضبوط سفید ہاتھ اسٹیرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ موٹی وہ لیفٹ ہینڈ سے ہی اسٹیرنگ کو ہینڈل کرتا تھا۔

”پچھلی سیٹ پر تمہارے لیے کچھ رکھا ہوا ہے، دیکھ لو۔“ عریشان ولی نے ایک نظر اس پر ڈال کر کہا اور دوبارہ نظریں ونڈ اسکرین پر جمادیں۔



”مجھے نہیں دیکھنا۔“ اس نے منہ بنا لیا۔ مجبوری یہ تھی وہ خود کچھ بتانا نہیں تھا۔ سب کچھ سر پر اتر ہی ہوتا تھا جیسے ابھی اسے آفس سے جلدی آف کروایا اور اب ڈنر پر لے جا رہا تھا۔ اسے فکر ہونے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے، پھر اٹھا کر پھینک دو۔“ روٹھے انداز سے آفر دی۔  
 ”میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے تم نے، ابھی سے مزاج سمجھ لو۔ جو چیز تمہارے لیے ہے وہ تمہارے لیے ہے، تم نے نہیں لیا تو میں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“ دوسرا ہاتھ اسٹیرنگ پر دراز کیے وہ باور کرائی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ پاگل ہیں؟“ آنسو نے لمبی سانس لی۔  
 ”For you!“ اسٹیرنگ چھوڑ کے اس کے بازو کو ہلکا سا جھکا دیا تھا۔ نفی میں سر ہلا کر آنسو نے پھیچلی نشست پر نظر ڈالی۔ کچھ شاپنگ بیگز رکھے تھے۔

”میرے ہاتھ قانون کی طرح لمبے نہیں ہیں خود اٹھا کر دیں۔“ اس نے منہ بسورا تو اس نے مسکرا کر بیگز اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دیے۔ اندر سے بلیک کلر کا سیمپل لیکن اسٹائلش کٹ کا ڈریس میچنگ جیولری، سینڈل برآمد ہوئی آنسو حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔  
 ”پسند آئی چیزیں؟“

”بہت خوب صورت ہیں۔“

”ابھی تمہیں پارلر ڈراپ کروں گا۔ تم تیار ہو جاؤ گی تو ہم ہوٹل پہنچ جائیں گے۔“ اس نے پلان کو سن کر آنسو کو بھی اپنے معمولی کپڑوں کا احساس ہوا تھا جو کسی طور بھی ڈنر پر جانے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ وہ بھی ایک نیکل کے لیے۔ لیکن اسے یہ سب بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ وہ محبت میں اس کی بات مان تو رہی تھی ساتھ ہی ساتھ خود کو ٹوٹتی بھی جا رہی تھی۔ وہ حریص تو نہیں ہو رہی۔ البتہ کئی چیزوں کی وجہ سے مرسدیز کی چمک، عثمان ولی کی ڈیشنگ پرسنلٹی کا سحر یا اس کے اربوں کی پر اپری تو وجہ نہیں تھی جو وہ اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی لیکن جواب ہمیشہ نفی میں ملتا تھا۔ عثمان ولی کو سوچتے ہی ایک خوش کن احساس اسے گھیرے میں لے لیتا تھا۔ اس کا تصور اس کی دلکش مسکراہٹ اس کی دلفریب باتیں اسے آسودہ کر دیتی تھیں۔ وہ کتنی ہی پڑمردہ ہوتی تھی اس کے ساتھ کا احساس ہی ذہنی سکون کا باعث بن جاتا تھا۔  
 ”کوئی الجھن؟“ عثمان ولی اس کے چہرے پر پھیلے تردد کو بغور دیکھ رہا تھا۔

”عثمان! آپ میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کے اصرار پر یہاں تک آ تو گئی ہوں مگر کس حیثیت سے اس ڈنر کا حصہ بنوں گی پھر یہ سب۔ پہلے ہی وہ بریسلٹ اور اب یہ.....“ وہ الجھن بھری نظریں جھانکے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ابھی تک بظاہر ان کے درمیان کوئی معاشرتی رشتہ نہیں بنا تھا اور وہ اسے اپنی سوشل ایلیٹی ویٹی میں ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔ عثمان ولی نے بغور اسے دیکھا۔ وہ شاید ڈری ہوئی تھی کہ کہیں وہ بدل نہ جائے، ساتھ نہ چھوڑ دے۔ لیکن وہ شاید ابھی اچھی طرح سے عثمان ولی کو نہیں جانتی تھی۔

”تم میرے ساتھ، میری ہونے والی مسز کی حیثیت سے جا رہی ہو۔ یہ سب تم پر احسان نہیں ہے، تمہارا حق ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔“ اس کی آنکھیں باور کروا رہی تھیں۔

”ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں کیسے اور کس رشتے کے بل پر آپ سے یہ سب لیتی پھروں کیا جواب دوں گی اپنی فیملی کو۔“ وہ اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کر رہی تھی جس کا اسے بھی بخوبی احساس تھا۔

”میں بس ڈیڈ کا ویٹ کر رہا ہوں۔ وہ دو تین دن میں آنے والے ہیں۔ پھر رشتہ بھی بن جائے گا۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“ وہ استغناء میہ بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”مجھے وقت پر اعتبار نہیں ہے۔ ڈرنے لگی ہوں اگر ایسا کچھ نہ ہوا جیسا آپ کہہ رہے ہیں تو؟“ وہ بے حد خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ پارلر آچکا تھا۔ بریک لگا کر اس نے اسٹیرنگ پر بازو دراز کر کے محبت سے اسے دیکھا تھا۔

”اگر ایسا ہوا تو کیا کرو گی؟“

”پتا نہیں۔ اس سوال پر ایک سناٹا اندر اتر آتا ہے۔“ اس نے الجھن بھرے انداز میں تھک کر سر سیٹ کی پشت سے نکالیا۔ عثمان ولی نے اسٹیرنگ پر چہرہ رکھ کر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

”ایسا کسی صورت نہیں ہوگا۔ کم از کم میرے جیتے جی تو نہیں۔ اندر جاؤ میں نے اپنا ٹمٹ لے رکھا ہے۔ تمہارے لیے۔“ اس کے یقین بھرے لہجے کو پرکھتے ہوئے وہ گاڑی سے اتر گئی تھی۔

☆.....☆

بڑا ہی پر شکوہ پارلر تھا۔ یہ نام وہ صرف بڑی بڑی ہستیوں کے منہ سے ہی سنتی رہی تھی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ بھی یہاں سے فیض یاب ہوگی۔ ریسپشن پر لڑکی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وجہ شاید اس کے معمولی کپڑے اور جوتی تھی۔ غالباً وہ اس کی حیثیت کا تعین کر رہی تھی کہ وہ صرف باہر پارلر کا بڑا سا بورڈ پڑھ کر آ گئی ہے یا اس کے پرس میں پیسے بھی ہیں۔ وہ اس کی نظروں سے اس کا تاثر جان گئی تھی۔ اس کے قدم اس چمچاتے فرش پر آتے ہوئے ٹھکے ضرور تھے مگر اسے اپنی کم مائیگی پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ پہلے جس طرح وہ اپنی مالی حیثیت چھپاتی تھی کم مائیگی چھلکنے پر شرمندگی محسوس کرتی تھی۔ اب اس میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کی کم مائیگی میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسے شرمندگی اپنی پرانی سوچ پر محسوس ہوئی تھی اور جب سے اس نے سوچ میں تبدیلی پیدا کی تھی قسمت خود دھربان ہو گئی تھی۔

”میری اپنا ٹمٹ ہے۔“ وہ پراعتاد چال چلتی ریسپشن تک آئی تھی۔

”آپ کا نام؟“ ریسپشن کی آنکھیں ایک لمحے کو تیر سے پھیلی تھیں اگلے ہی پل اس نے پروفیشنلزم کی ڈوری کو تھام لیا۔

”آنسور!“

”مسز آنسور عثمان!“ ریسپشن کے لہجے کے ساتھ آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔ آنسور ایک ٹائپے کو جربز ہوئی تھی۔ عثمان ولی کی اس حرکت پر عجیب تحفظ کا سا احساس ہوا تھا۔ اسے نام کے ساتھ مسز لگا کر اس نے ان لوگوں کے سامنے بے حد معتبر کر دیا تھا۔ ورنہ وہ اسے کچھ اور بھی سمجھ سکتی تھیں۔

”جی!“ بے حد اعتاد سے اس نے کہا تھا۔

”میم آپ کا پرٹنی ویٹ کر رہی ہیں۔ کئی بار پوچھ چکی ہیں آپ کا فرسٹ فلور پر چلی جائیں۔“ وہ مسکرا کر پلٹ گئی تھی۔ بدلتا لہجہ اور ٹون اسے مسکرا نے پر مجبور کر گیا تھا۔

”تم کیا چیز ہو عثمان ولی؟“ وہ بے ساختہ اسے یہ جملہ ٹیکسٹ کر بیٹھی تھی۔

”اپنے دل سے پوچھ لو۔“ اگلے پل ہی اس کا محبت بھرا جواب آیا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

(جاری ہے)

مهرین کنول

احمد علی خان



عید الفطر گزری۔ ذی القعد کا مہینہ گزر رہا اور عید الاضحیٰ کا چاند نظر آیا اور قربانی کے جانور لانے کی باتیں ہونے لگیں تھیں۔

”تجھی گائے تو آنے والی ہے مگر ان دو سفید بکروں کا کیا ہوگا۔“ انو چا چو نے دونوں سفید بکروں کی طرف نظر ثانی کر دانی چاہی۔

”یہ دو سفید بکرے ماہ نور اور حرا کے بکرے ہیں کتنا لگاؤ رکھتی ہیں وہ ان سے۔“ نہ دادی نے کہا تھا کہ حرا نے جو وہیں اپنے کھلونوں سے کھیل رہی تھی فوراً ساتھ کھیتی ماہ نور سے کان میں کچھ کہا اور پھر اپنی دادی کے پاس آئیں۔

”دادی ہم دونوں کے بکروں کو بھی ذبح کرنا عید کو۔“ ماہ نور، حرا نے کہا تو اتنی چھوٹی سی عمر کی دونوں پوتیوں کو اپنے بکروں کو اس طرح سے خود ہی قربانی کے لیے دینے دیکھا تو وہ پوچھ بٹانہ نہ کیں۔

”ماہ نور، حرا آپ دونوں تو بکروں کو بہت پیار کرتی ہو تو کیسے آپ نے ان کو ذبح کرنے کے لیے کہہ دیا؟“ انہوں نے ان سے پیار سے پوچھا۔

”دادی مہر و پچھو نے ہمیں قربانی کا مطلب سمجھایا ہے۔ بقرہ عید کے بارے میں بتایا ہے۔ اللہ کی راہ میں اپنی پیاری چیز قربان کرنا چاہئے۔“ ماہ نور، حرا ایک ساتھ بتانے لگیں۔

”ہم بھی اپنے بکرے اللہ کی راہ میں قربان کریں گے۔ ہماری کلاس میں بھی اسلامیات کی ٹیچر نے حضرت اسمعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ پڑھایا ہے۔“ ماہ نور نے مزید بتایا تو دادا اور دادی نے اپنی پوتیوں کو فرط جذبات سے گلے لگا لیا انہیں خوشی ہوئی تھی کہ ان کی پوتیوں میں ایثار کا جذبہ جو انہوں نے دیکھا تھا کہ ان کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

☆.....

”دادا میں آج آنسکریم کھاؤں گی چلیں شام ہوگی۔ آپ کہہ رہے تھے شام ہوتے ہی آنسکریم کھانے چلیں گے۔“ آٹھ سال کی ماہ نور نے حسب معمول اپنے دادا سے فرمائش کی تھی۔ ان کی بیگم نازی جی بڑی پیاری شخصیت کی مالک تھیں۔ جیسی صرت ویسا ہی پیارا دل اور سیرت پائی تھی۔

”ماہ نور بیٹا پہلے حرا کو آجانے دو، دونوں بہنیں ساتھ ہی آنسکریم کھانا۔“ دادا نے ماہ نور کو ہمیشہ کی طرح حرا کے خیال میں کہا تھا۔

”دادا وہ حرا اپنے کھلونوں سے کھیل رہی ہوگی اس کے انتظار میں تو بہت دیر ہو جائے گی۔“ ماہ نور جو زیادہ تر اپنے دادا دادی کے ساتھ رہتی۔ اپنے سارا سارا دن رات گزارنے کی عادی تھی۔ اپنے سے دو سال چھوٹی حرا کو بھی بہت پیار کرتی مگر آنسکریم کے معاملے میں بہت جلدی آنسکریم پارلر جانے کو ضد کرتی کہ پارلر گھر سے دو فرلانگ پر تھا۔

”السلام وعلیکم۔“ حرا اپنے مہما پاپا کے پورشن سے نکل کر دادا کی طرف لپکی۔

”وعلیکم السلام میرا بچہ!“ دادا نے اس کو بہت پیار کیا اور حرا اور ماہ نور کو لیے آنسکریم پارلر لے آئے۔ پارلر کے قریب ہی چرواہے اپنے بکرے بکریوں کے ریوڑ لے کر گزرنے لگے۔

”دادا دیکھیں بکرے! کتنے پیارے بکرے ہیں۔“ ماہ نور، حرا نے سفید بکروں کو دیکھ کر شور مچایا اور دادا نے چرواہوں کو روک لیا ان کو کسی طرح سے منایا اور دو سفید پیارے سے بکرے ماہ نور، حرا کو خرید کر دے دیے اور ماہ نور، حرا اپنے اپنے بکروں کو لے کر گھر آگئیں ان کے ساتھ کھیتی اور انہیں گھاس کھلاتیں۔ زیادہ تر بکروں کو ان کے انو چا چو سنبھالتے تھے جنہیں جانوروں سے زیادہ لگاؤ تھا۔ دن وقت گزرنے لگے

## عید الفطر اور عید الفطر کی بات

چکر ہوگا اور مجھے وہاں پرانی یادوں نے کھیر لیا ہوگا۔ بخدا ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ نووس سال کی وہ بچی تھی جس نے پرانے سے قدرے میلے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ منزل وائر کی ایک بوتل اٹھائے ہماری ایک نئی آنے والی ”نخریلی بچہ“ مس ملک کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ ڈیڑھ لیٹر پانی کی بوتل اتنی وزنی ہوتی ہے کہ اسے اٹھانے کے لیے آپ کو نو دس سال کا ایک بچہ ہار کرنا پڑے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بچی مس ملک کے والدین نے اپنی اس بچی کی سہولت کے لیے نو کر رکھی ہوئی ہے جو اب خیر سے یونیورسٹی میں پڑھانے کے فرائض انجام دیتی ہے۔

☆.....☆

اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ میں کوئی بدتمیز سی اسٹوڈنٹ ہوں جو اپنے استادوں کا احترام نہیں کرتی۔ بس مس ملک وہ واحد استاتی ہیں جو اپنے طالب علموں سے بہت تنگ رہتی ہیں اور طالب علم ان سے اس سے بھی زیادہ تنگ ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یونیورسٹی میں ایسے اساتذہ کے بارے میں طلبہ کی کیا رائے ہوتی ہے۔ مس ملک بہت نخریلی اپنے علاوہ باقی سب کو گدھا سمجھنے والی خاتون ارے نہیں نہیں خاتون نہیں لڑکی (مس ملک کو خاتون کہلائے جانا بالکل پسند نہیں ہے) چلتی یوں ہیں جیسے زمین کی سات پستوں پر احسان فرما رہی ہوں اور ہر وقت اپنی تعریف سننا بہت پسند کرتی ہیں اور پڑھانے کے دوران اگر کوئی طالب علم کوئی ایسا سوال پوچھ لے جو ان کے آئی کیو لیول سے بلند ہو تو اس طالب علم کو ایسی

میں مسماۃ عابدہ کلثوم ہوں۔ مجھ جیسی بندی جس کے لیے صبح سویرے اٹھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو (اس بری عادت کی وجہ سے اکثر میری فجر کی نماز قضاء ہو جاتی ہے اور امی کے علاوہ ابو کی ڈانٹ بھی کھانا پڑتی ہے۔) آج صبح چار بجے خود بخود بیدار ہو کر یونیورسٹی جانے کی تیاری کر رہی ہو تو کسی کو مشکل سے یقین آئے گا نا۔ ارے نہیں، نہیں اس کی وجہ پڑھنے سے ”میری دلی محبت“ ہرگز نہیں ہے بلکہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا وہ ایک روزہ ٹرپ ہے جو آج اسلام آباد جانا ہے اور اس کے لیے تمام طلبہ و طالبات کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ صبح ٹھیک ساڑھے پانچ بجے یونیورسٹی پہنچ جائیں۔ ورنہ رہ جانے والوں کی طرف پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا جائے گا۔ اب میں نے اتنے پیسے دیئے ہیں وہ ضائع تو نہیں لرنے نا اور دوسرے میں کلاس چھوڑ سکتی ہوں ٹرپ نہیں۔ یہ بات آف دی ریکارڈ ہے، ابو کو معلوم نہیں ہونی چاہیے ورنہ..... آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔

یہ شاید ”پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے“ والی دھمکی کا نتیجہ تھا کہ خلاف معمول سب وقت پر یونیورسٹی پہنچ گئے اور دونوں بسیں سفر پر روانہ ہو گئیں۔ اسلام آباد تک کا سفر بہت خوشگوار رہا۔ گانے سننے گئے۔ ایک دوسرے کا ریکارڈ لگایا گیا اور کچھ ٹیچرز کی پیروڈی کی گئی اس طرح ہنستے گاتے ہم لوگ اسلام آباد پہنچ گئے۔ زندگی میں یہ میرا پہلا ٹرپ تھا جو میں نے صرف جاتے ہوئے انجوائے کیا۔ اسلام آباد میں بسوں سے اترنے کے بعد سے واپس لاہور آنے تک مجھے ایک ملال ایک دکھ نے گھیرے رکھا۔ ارے یہ مت مجھے گا کہ کوئی عشق و شوق کا



تھی۔ یقیناً اسے بھی اتنی ہی بھوک لگی ہوگی جتنی ہم سب کو بلکہ ہم سے شاید زیادہ اور پتہ نہیں اس نے صبح ناشتہ بھی کیا تھا یا نہیں؟ (میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے ایک پلیٹ میں کھانا نکالا اور اس بچی کے پاس جا کر اسے پلیٹ پکڑانا چاہی تو اس نے بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ مجھے اس کی وجہ سمجھ آ چکی تھی۔ ”مس ملک آپ کو شاید یاد نہیں رہا کہ آپ اس بچی کو بھی ساتھ لے کر آئی ہیں۔ اسے کیسے نایہ بھی کھانا کھالے۔“

میرے کہنے پر مس ملک نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بچی کو تیز نظروں سے گھور کر کھانے کی اجازت دے دی۔ وہ بچی پلیٹ پکڑ کر نیچے بیٹھ گئی تو میں نے پلیٹ واپس اٹھا کر اسے ایک خالی میز پر بٹھا دیا۔ اپنی میز پر اس لیے نہیں بٹھایا کہ وہ جھجک محسوس کرے گی اور تھک سے نہیں کھائے گی۔

شام تک وہ بچی مس ملک کے پیچھے پیچھے پھر کر تھک چکی تھی لیکن مس ملک کو اس بات کا ذرا برابر احساس نہ تھا۔ واپسی کے سفر میں ایک عجیب سے احساس جرم کا شکار رہی۔ جیسے اس بچی کی اس حالت کی ذمہ داری میں خود ہوں۔ بے چاری بچی! نہ جانے ماں باپ کو کیا مجبور بھی جو اپنے جگر کے ٹکڑے کو بچوں کے رحم دنیا کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ مس ملک اس بچی کو ساتھ کیوں لائی تھیں۔ ان کا مقصد بچی کو قوت بخشنا تھا یا تو ان کو گھر نہیں تھا۔ شاید وہ دوسروں کو یہ بتانا چاہتی تھیں کہ دیکھو مجھے اللہ نے اتنا نوازا ہے کہ میرے پاس پانی کی بوتل اٹھانے کے لیے بھی ایک نوکرانی موجود ہے۔ نہ جانے اس طرح بچی کو اپنے پیچھے پھرا کر ان کی کس حس کی تسکین ہوئی تھی۔ شاید ایسا کرنے سے انہیں یہ محسوس ہوا ہوگا کہ وہ انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئی ہیں۔

☆.....☆

اُن مس ملک کی اس حرکت نے مجھ جیسی غیر سنجیدہ

جھاڑ پلائی ہیں کہ الامان الحفیظ۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کوئی استاد ایسا رویہ کب اپناتا ہے۔ خیر تو میں بات کر رہی تھی اپنے اس ملال کی جو مجھے اس بچی کو دیکھ کر ہوا۔

نودس سال کی وہ بچی مس ملک کے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سہمی ہوئی گھبراہٹ تھی اور جیسے ہی مس ملک اسے ڈانٹ کر پکارتیں اس کی آنکھیں خوف سے بھر جاتیں جس بس میں مس ملک سوار تھیں اس بس کے طلبہ نے بتایا کہ مس ملک نے اس بچی کو پورے راستے (یاد رہے ہم لاہور سے اسلام آباد آئے ہیں)۔ بس کے فرش پر بٹھائے رکھا ہے۔ حالانکہ بس کی دو سیٹیں خالی تھیں۔ ڈرائیور نے ایک دو بار کہا بھی کہ بچی کو سیٹ پر بٹھا دیں لیکن مس ملک نے سخت سے ”یہ یہیں پر تھیک ہے“ کہہ کر بات ختم کر دی۔ یہ سن کر ہمارے گروپ کا خون کھول اٹھا اور سب گروپ ممبر کہنے لگے کہ اگر مس ملک اور یہ بچی ہماری بس میں سوار ہوتے تو ہم دیکھتے وہ اس کو کیسے بس کے فرش پر بٹھاتیں۔ اصل میں ہمارا گروپ یونیورسٹی میں ”تھرے گروپ“ کے نام سے مشہور ہے جو ہر ظلم و زیادتی کے خلاف اتنا شور مچاتا ہے کہ مظلوم کا کچھ نہ کچھ بھلا تو ہو ہی جاتا تھا۔ ویسے ہم نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا۔ بچی کے ساتھ اس نا انصافی کا ذکر سن کر عزیز کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آ گئے۔ وہ ایسی ہی ہے دوسرے کے غم پر آنسو بہانے والی۔

☆.....☆

گھومنے پھرنے کے دوران دوپہر کے وقت سب کھانا کھانے کے لیے ایک ریسٹورانٹ میں رکے کھانا کھاتے ہوئے اچانک میری نظر اس بچی پر پڑی جو مس کی کرسی کے پیچھے کھڑی سب کو دیکھ رہی تھی اور پانی کی بوتل ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ مس ملک اطمینان سے کھانا کھانے میں مشغول تھیں۔ اس ظلم پر (ظلم ہی ہوا تھا کہ ایک بچی سب کو کھانا کھاتے دیکھ رہی



ارد گرد رہنے والے انسانوں کے لیے آسانیاں پیدا کر س خاص طور پر ان کے لیے جنہیں اللہ نے ہمارا دستِ مگر بنایا ہے۔

اندازِ بیان گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات اُمید ہے آپ ہماری اس درخواست پر غور فرمائیں گی۔

آپ کے چند خیر خواہ

☆.....☆

اگلی صبح مس ملک کی کلاس میں ہم سب دل میں قدرے ڈرے ہوئے تھے۔ اگرچہ پکڑے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا لیکن مس ملک کے گرجنے اور گڑکنے کے امکانات خاصے روشن تھے۔ مس ملک وہ ای میل پڑھ چکی تھیں اسی کا یقین ہمیں آپ کی ای میل پڑھ لی تھی ہے۔ کا پیغام وصول ہونے سے ہو گیا تھا۔ کلاس میں ہم سارا وقت انتظار کرتے رہے کہ کب مس ملک پوری کلاس کی عزت افزائی کرتی ہیں۔ پوری کلاس کی اس لیے کہ انہیں خطیم نہیں تھا نا کہ یہ جرات کس نے کی ہے لیکن اس وقت ہم سب حیرت سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے، جب پورا پیڑ پڑھانے کے بعد وہ کلاس سے باہر نکل گئیں۔ ہمارے پورے گروپ نے یا ہو کا نعرہ لگایا اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارے۔ باقی کلاس ہمیں یوں دیکھنے لگی جیسے ہم پاگل ہو گئے ہوں۔ ان سب کو ہماری اس حرکت کا علم جو نہیں تھا۔ خیر ہم بھی خاموش رہے کہ منظور تھا پڑہ مس ملک کا۔ اب نہ خانے ہماری ای میل ان کے دل میں اتر گئی تھی یا وہ کسی مصلحت کے تحت خاموش تھیں۔ بہر حال جو بھی تھا ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ ہم نے اس بچی کے حقوق کے حوالے سے اپنا فرض ادا کرنے کی ایک کوشش تو کر ہی دی تھی۔ چاہے پکڑے جانے کے خوف سے گم نام رہ کر ہی سہی کیوں! آپ کیا کہتے ہیں؟

☆.....☆

بندی کو بہت دنوں تک ملال میں مبتلا رکھا تھا۔ آخر میں نے اپنے پورے گروپ سے مشورہ کر کے کوئی ایسی صورت نکالنے کی کوشش کی جس سے مس ملک کو ان کے اس رویے کا احساس دلایا جاسکے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارا گروپ اکثر دو دو گھنٹے کی بحث کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ آخر دس دن کی سوچ بچار کے بعد ہم نے یا ہو پر ایک نئی آئی ڈی بنائی (تا کہ پکڑے نہ جائیں بھی.....!) اور مس ملک کو ایک ای میل بھیج دی۔

محترمہ مس ملک السلام علیکم!

ہم گھما پھرا کر بات نہیں کریں گے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے جس بچی کو اپنی خدمت پر مامور کر رکھا ہے، ٹرپ کے دوران اس کے ساتھ آپ کا سلوک ملاحظہ کر کے ہم تب صدے کی کیفیت میں ہیں۔ خدا را اپنے رویے پر نظر ثانی کیجیے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو مس ملک بنایا ہے وہ بچی نہیں جو آپ کے پاس نوگرانی کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ آپ خود باشعور ہیں اور ماشاء اللہ استاد کے عہدے پر فائز ہیں۔ اسلام تو ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ جیسا خود کھائیں ویسا اپنے نوکر کو کھلائیں، جیسا خود پہنیں ویسا اسے پہنائیں۔ چلیں اس کو چھوڑیں کہ اس پر عمل کرنا ہم اتنا کے مارے ہوئے انسانوں کے لیے بہت مشکل ہے۔ آپ اسے صرف انسان سمجھ لیں اور ایک انسان کو زندہ رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے مہیا کریں۔

یہ مال، دولت، نوکر چاکر سب ہماری آزمائش ہیں کہ ہم اللہ کی ان نعمتوں کو پا کر اس کا شکر ادا کرتے ہیں یا اسے بھول کر فرعونیت اختیار کرتے ہیں۔ ایک اور اہم بات کہ حقوق العباد کی ادائیگی میں ناکامی کی صورت میں روزِ حساب ہماری عبادات بھی ہمیں کچھ فائدہ نہ دیں گی کہ ان کا ثواب ان لوگوں میں بانٹ دیا جائے گا جن کی ہم نے حق تلفی کی ہوگی۔ سوائے

ثناء کنول

# آب کا سلسلہ



اس کی بات پر رابعہ پریشانی سے بولی۔ ”کیا میرا بھی ایمان ختم ہو گیا ہے، تو میں کیا کروں کہ میرا ایمان واپس آ جائے۔“

فاطمہ اس کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”اس کا ایک حل ہے کہ تم ایمان تجدید کر لو۔“

”اس طرح پہلے دعا کرو کہ اے اللہ میں نے کوئی کفر یا کام کیا ہو یا کچھ کفر والا سنا ہو یا دیکھا ہو تو مجھے معاف کر دے۔ میں توبہ کرتی ہوں اور ایمان تجدید کرتی ہوں۔ پھر تین بار کلمہ پڑھ لو اگر خدا نہ کرے کہ تمہارا ایمان ختم ہو چکا ہو گا تو واپس آ جائے گا۔“

”تھینک یو سوچ! یا تم نے مجھے تباہ ہونے سے بچا لیا ورنہ بتا نہیں میرا انجام کیا ہوتا۔ انسان کے لیے اس کا ایمان اس کی جان سے بھی بڑھ کر اہم ہوتا ہے اور ہمیں اس دفعہ بتا بھی نہیں چلتا کہ ہمارا ایمان ختم ہو چکا ہو گا۔“

”فاطمہ کیا کسی اور چیز سے ایمان ختم ہو جاتا ہے؟“

”ہاں، ایسے گانے جن میں انسان کو خدا کہا جائے یا اس کے برابر کہا جائے یا پھر اس سے پہلے کہا جائے تو یہ سننے سے بھی ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ آج کل ایسے بہت سے گانے چل رہے ہیں جن میں یہ سب کہا جاتا ہے۔“ فاطمہ کے کہنے پر رابعہ نے اسے گلے لگا لیا اور بولی۔ ”تم یہ بات ہر کسی کو بتانا کہ آج کے مسلمان کا ایمان بچ سکے اور ہم ایک سچے اور اچھے مسلمان بن سکیں۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں اس بات کو ضرور پھیلاؤں گی انشاء اللہ۔“

”تو آپ سب بھی آج مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ اپنا اور دوسروں کا ایمان ضرور بچائیں گے۔“

☆.....

”امی! میں اپنی دوست رابعہ کے گھر جا رہی ہوں، یہ کچھ سوال مجھے سمجھ نہیں آرہے تھے اس سے سمجھ کر آتی ہوں۔“

فاطمہ عبایا پہنتی نقاب لگا کر نیرنگم سے بولی تو بچن میں سبزی بنائی وہ بولیں۔ ”اچھا بیٹا! خیال سے جانا اور جلدی آنا ورنہ تمہارے پاپا غصہ کریں گے۔“

”جی اچھا امی! آپ پریشان نہ ہوں میں یوں گئی اور یوں آئی، خدا حافظ۔“

مسکراتی ہوئی وہ نقاب درست کرتی بولی اور گلی کے آخر میں بے گھر کی طرف چلی آئی۔

”السلام علیکم آئی! رابعہ کہاں ہے؟“

”ہائے بیٹا! وہ لاان میں ہے۔“

”آئی فری اپنی ساری درست کرتی ہوئیں بولیں اور باہر نکل گئیں۔“ وہ سیدھی ٹی وی لائونج کی طرف چلی آئی۔ سامنے ہی بڑے سے ایل سی ڈی پر کسی ڈرامے میں بھگوان کا بچن گایا جارہا تھا جسے رابعہ بھی جھومتے ہوئے ویسے ہی کہہ رہی تھی۔

فاطمہ کے ہاتھ سے بے اختیار کتابیں زمین پر جا گریں وہ بھاگتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار کانٹے ہاتھوں سے اس نے ٹی وی بند کیا اور صوفے پر گر کر اپنی دھڑکنیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی جب کہ رابعہ چیخ کر بولی۔ ”یہ تم نے کیا کر دیا اتنا پیارا سین آنے والا تھا۔ سارے ڈرامے کا بیڑا غرق کر دیا۔“

”پلیز مائٹڈ یو لیکو توج، یہ تم کیا دیکھ رہی تھیں اور ساتھ بول بھی رہی تھیں۔“

”تو کیا ہوا ایک بچن ہی تو تھا کوئی قیامت تو نہیں آگئی نا۔“

”قیامت.....! ارے یہ قیامت کی نشانیاں ہی تو ہیں کہ ہم لوگ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا ایمان ختم کر رہے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ قیامت تو نہیں آگئی.....!“

ایقان علی

# سٹارچ

”وہ میرا واحد اثاثہ ہیں“۔ عثمان کی پللیں بھگنے لگیں۔

”ابو کے بعد اب میں انہیں نہیں کھوسکتا“۔

”ڈونٹ وری“۔ دور صدیقی صاحب کے گھر، احمر کے کمرے میں اسکا پُ آن تھی۔



”جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ! میری سنگتی میں تمہیں ضرور آتا ہے۔“ ندا احمد سے کہہ رہی تھی۔  
 ”جی آپ! لیکن شاید بھائی نا آئیں اس کے پیپرز ہونے والے ہیں اور ابو کا تو آپ کو پتہ ہے۔“  
 ”اوہ۔“ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔  
 ”چلو اچھی بات ہے یہ بندر نما آدمی نا ہی آئے تو بہتر ہے۔“ وہ تلملایا۔  
 ”ہاں ہاں وہ تمہارا والا بندر ہی کافی ہے ناں۔“ ندا نے منہ چڑایا۔  
 ”سارے جہاں کی شادیاں ہو رہی ہیں ایک میری نہیں ہو رہی۔“ وہ جلا ہوا بیٹھا تھا۔  
 ”میں ڈھونڈ دوں کوئی؟“  
 ”ہیں جی شکریہ! مجھے کسی لڑکی سے شادی کرنی ہے اور تم کوئی اپنے جیسی مخلوق ڈھونڈ دوگی۔“

☆☆☆☆

نیمری فسط



احمر کافی دیر سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے پر وہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا، آج فری پیریڈ میں وہ اسے گھیر کر بیٹھ گیا۔

”جلدی بک کیا ہوا ہے؟“ عثمان نے امی کی بیماری کا سارا احوال کہہ دیا تھا، وہ افسردگی سے سنتا رہا تھا۔

”یار! تو پریشان نا ہو! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ری کوری کی کوئی امید نہیں ہے۔“ وہ رو دینے کو تھا۔

”ڈاکٹر زخدا نہیں ہوتے عثمان! تو ماپوس ہوئے بغیر علاج شروع کرو۔“

”ہاں میں نے ماموں سے کہا ہے کہ گھر کے لئے کوئی کسٹرز ڈھونڈیں مجھے اب مزید دیر نہیں کرنی۔“

”عثمان۔“ احمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”تو میرے بھائی جیسا ہے، میری مدد چاہئے ہو تو۔“ عثمان نے بات کاٹی۔

”یار! تیرا کہہ دینا کافی ہے تو بس دعا کر دے میرے لئے بہت ہے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن پھر بھی کبھی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے صرف ایک بار کہہ دینا وہ میری بھی ماں ہیں۔“

”تھینک یو۔“

☆☆☆☆

انگلش کی کلاس ہو رہی تھی۔ وہ آج ذرا لیٹ تھا تو جگہ پیچھے ملی تھی اس نے ڈیسک پر بیٹھتے ہی کتاب کھولی تھی، برابر میں بیٹھا ہوا لڑکا ایس ایم ایس پر چیٹنگ میں مصروف تھا۔

”ڈارلنگ! آج تو ملنا ہوگا پلیز۔“ احمر نے ترجیحی نظر ڈال کر پیغام پڑھا، وہ کسی ”فلک“ کو پیغام کر رہا تھا۔

”پتہ نہیں کیسے پھنسا لیتے ہیں یہ لڑکیوں کو۔“

”خدا کے لئے مجھے بخش دو۔“ جواب آیا تھا۔

”جو میں نے کہا ہے بس وہ کرو، ورنہ وہ ویڈیو تمہارے ابو کو دے دوں گا۔“ احمر کے روٹنے کھڑے ہو گئے (اف بلیک میلنگ)

”ہیلو! احمر نے ہولے سے اسے پکارا۔

”مجھے ایک منٹ کے لئے موبائل دے سکتے ہو؟ مجھے اپنے فرینڈ کو ایس ایم ایس کرنا ہے، میرا سیل گھر رہ گیا ہے۔“

”شیوڑ۔“ احمر نے موبائل لیا اور جلدی سے ان باکس میں گیا، وہ لڑکا دوسری طرف متوجہ تھا، اس نے ”فلک“ کا

نمبر ازبر کیا، ایک میسج میں ٹائپ کیا اور اپنے نمبر پر سینڈ کر دیا، وہ میسج سینٹ آکٹم میں سے ڈیلیٹ کر دیا اور موبائل

اسے لوٹا دیا۔

☆☆☆☆

وہ پریشانی کے عالم میں اسپتال کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا، زنب آئی سی یو میں تھی حالت کافی نازک تھی لہذا آپریشن کرنا پڑ رہا تھا، اڑھائی گھنٹے وہ وہاں ٹہل رہا تھا جب ڈاکٹر باہر آئے تھے۔

”مبارک ہو! اٹس بوائے۔“ اسے سمجھ نہیں آئی کہ اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرے، تھوڑی دیر میں نرس

تو لے لے میں لپٹا، وہ وجود اسے دکھانے لائی تھی وہ اس کا بیٹا تھا اس کے وجود سے جنم لینے والا ایک وجود وہ سمجھنا سکا

کہ وہ کیسا محسوس کر رہا ہے۔

”اور نینب وہ ٹھیک ہے؟“ اس نے ڈاکٹر سے سوال کیا تھا، وہ خاموش رہ گئے تھے، پھر نزدیک آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آئی ایم سوری! وہ نہیں رہی۔“ وہ جہاں کا تھا رہ گیا، سانس ہی نہیں لے سکا، دل دھڑکنا بھول گیا۔  
”بلیڈنگ بہت زیادہ ہوگئی تھی، ہم اسے نہیں بچا پائے، سوری بیک مین۔“ اس کے قدموں تلے فرش کھسک رہا تھا، نزدیک ہی حنائی ہاتھ تھے، مترنم سی ہنسی، گلابی رخسار، وہ مر گئی تھی۔

☆☆☆☆

گھر بک چکا تھا، رقم ماموں نے بینک میں جمع کروادی تھی، ڈاکٹر آفندی سے بات بھی ہو چکی تھی، بلڈ کیئر کا سب سے ترین علاج شروع ہو چکا تھا، پہلے تو ان تمام ٹیومرز کا خاتمہ ہونا تھا جو سارے جسم میں پھیل چکے تھے، پھر ٹرانسپلانٹ کا منگنا ترین عمل۔ سارا اٹھیل پیسے اور اعصابوں کا تھا، پیسہ جو ان مایہ بیٹے کے پاس بہت کم تھا اور اعصاب جو بہت کمزور تھے، لیکن امید تھی جو تپتے صحرا میں ہوا کے جھوکے کی مانند تھی، ایسا بھونکا جو صدیوں بعد چلتا ہے اور لوگوں میں کھوجاتا ہے۔

☆☆☆☆

گھر تقریباً خالی تھا، امی، ابو اور احمد سب نندا کی منگنی میں جا چکے تھے، اگلے ہفتے اس کے پیپر تھے لہذا وہ اکیلا گھر رہی تھا، شام میں کھانے کے بعد اسے ”فلک“ والے نمبر کا خیال آیا تھا، کچھ دیر سوینے کے بعد اس نے نمبر ملایا تھا، کئی دفعہ کی کال کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا تھا۔

”ہیلو! فلک بات کر رہی ہیں؟“

”کیوں؟“ نسوانی آواز اچانک سے ابھری تھی۔

”دیکھیں میں آپ کا خیر خواہ ہوں مجھے غلط مت سمجھئے گا کیا آپ فون ہیں۔“

”جی۔“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی تھی۔

”مگد! دیکھئے مجھے نہیں پتہ آپ کا کیا مسئلہ چل رہا ہے لیکن مجھے اتنا ضرور پتہ ہے کہ کوئی لڑکا آپ کو بلیک میل کر رہا ہے دیکھئے آپ۔“

”سوری روئنگ نمبر۔“ وہ فون بند کر دینے کو تھی۔

”دیکھئے! پلیز آپ اس سے مت ڈریں، اپنے پیرنٹس کو اعتماد میں لیں، وہ ضرور آپ کا اعتبار کریں گے، آپ دوبارہ ہرگز مت ملیں اس سے وہ آپ کو۔“ ٹوں ٹوں کی آواز آئی اور فون بند ہو گیا، وہ خاموش بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ بے یقینی کے عالم میں کھڑا اس بے حس ساکت وجود کو دیکھ رہا تھا، ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں، پھر بھی ٹا کھلنے کے لئے پھر اس نے بے یقینی سے اس ننھے وجود کو دیکھا جو اس کی گود میں مسلسل رو رہا تھا۔ ایک زندگی جس نے موت سے وجود لیا تھا۔ وہ کون تھا، کہاں تھا، کیوں تھا، وہ سب کیا ہو رہا تھا، حمزہ کریم کو ہرگز خبر نہیں تھی وہ کم صم سانچا نے کیا کیا سوچ رہا تھا۔

”آپ کا فون بج رہا ہے۔“ نرس نے بتایا تو وہ خالی الذہنی سے اسے دیکھنے لگا۔

”فون کیا ہوا؟“ نجانے فون کس نے سنا اور نجانے کیا بتایا، جب تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد دادا ابو اور تایا اسپتال آئے تو وہ نینب کے اسٹریچر کے پاس زمین پر بیٹھا تھا اس کی گود میں بچہ رو رہا تھا۔



”نہ نہ ب مرگئی ابا“۔ تایا، دادا ابو کے گلے لگے رو رہے تھے۔

☆☆☆☆

فلک نے کال ڈسکنیکٹ کی اور خاموشی سے بیٹھی موبائل کو نکلتی رہی، وہ نجانے کون تھا جس نے فون کیا تھا، وہ اسے ناڈرنے کو کہہ رہا تھا وہ کیسے ناڈرے؟ اس انسان کے پاس جو تھا اس کے بعد وہ کیسے ناڈرے؟  
”ہیلو جان! کل ملو“۔ ارجم کا SMS آیا تھا، لمحوں میں فلک کا دماغ گھوم گیا تھا، جوابا اسے فون کر کے فلک نے گالیاں دی تھیں، ماں بہن کی گالیاں مرجانے کی بددعا میں وہ جواباً صرف ہنستا رہا تھا جب وہ ہانپ گئی تو بولا۔  
”جان! کل ملو“۔ فلک الیاس کو پچھتاوے نے آگھیرا، وہ گالیاں جو آج ایسے دی تھیں، بہت پہلے اسے دینی چاہتے تھیں اور بدعائیں بھی، اب قبولیت کے وقت گزر چکے تھے، اب وہ جال میں تھی اور ہاتھ پاؤں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”جنہم میں جاؤ تم! میں نہیں آنے والی“۔ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا، اگلے دن وہ اسے ملنے نہیں گئی تھی، شام میں اس کا فون آیا۔

”قسم خدا کی فلک! اب تو دیکھ میں کیا کرتا ہوں“۔ فلک اس کے انداز سے دہل گئی۔

”کر لو جو کرنا ہے میں اب نہیں ملنے والی“۔

”وہ تیرا کزن ہے ناں جس کی صدر بازار میں موبائل شاپ ہے، اسے دوں گا پہلے ویڈیو تو دیکھتی جا میں کیا لرتا ہوں“۔

☆☆☆☆

”یار! اپنے پرنس چارمنگ کی کوئی تصویر ہی دکھاؤ، ہم بھی تو دیکھیں“۔ وہ اس کا ٹپ پرندا سے بات کر رہا تھا، ناہن ختم ہو چکا تھا وہ سامنے بیٹھی ہار بندے اتار رہی تھی۔  
”میرے پاس پکچر نہیں ہیں انہوں نے تصویریں بنائی تھیں اور وہ ساتھ ہی لے گئے جب ہمیں بھیجیں گے تو المہادوں گی“۔

”ہونہہ! احرارے ہنکارا بھرا۔

”اور کیسا ہانکشن“۔

”شاندرا! ویسے تم آتے تو مزادو گنا ہو جاتا“۔

”میں کیسے آ جاتا“۔ احرارے منہ بنایا۔

”ہمارے جلا دادا حضور سے تو تم واقف ہو، تمہاری منگنی سے پہلے میرے قل ہو جاتے اگر میں آنے کی ضد کرتا، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں انہیں کسی تھانے میں کو تو ال ہونا چاہئے“۔ وہ ہلکھلائی۔

”توبہ توبہ مجھے اس کا ٹپ کال کر کے ابو کی بدخونیاں کروا رہے ہو اللہ توبہ“۔ اس نے گال پیٹتے تھے۔

”شیطان کی چاچی! ابھی دیکھنا تم غائب ہو میں“۔ احرارے استغفار پڑھ کر اسکرین پر پھونک ماری اور

اس کا ٹپ آف کر دی۔

☆☆☆☆

تدفین ہو گئی تھی وہ بے یقین ساہر شے دیکھتا رہا۔

”خزہ پتر! صبر کر“۔ دادا ابو کا دلا سا، ایک ہفتہ گاؤں رہ کر وہ واپس آ گیا تھا، بچہ وہیں اماں کے سپرد کر آیا تھا

”حمزہ اٹھو۔“ پانچویں پکار پر بھی وہ نہیں اٹھا تھا تو اس نے پانی کا جگ اس کے منہ پر انڈیل دیا تھا وہ ہڑبڑا کر چونکا اور سید کو دیکھا وہ خشک تھا اور اس کی ہنسی گونج رہی تھی۔

”جلدی تیار ہو جاؤ باہر جانا ہے۔“ وہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی لپ اسٹک لگا رہی تھی وہ بار بار پھیل رہی تھی۔  
 ”میں لگا دوں؟“ وہ فٹ سے اس کی طرف مڑی اور لپ اسٹک اسے تھما دی وہ اکڑوں بیٹھا اور لپ اسٹک لگانے لگا لپ اسٹک لگوانے کے بعد وہ گھومی اور خود کو شیشے میں دیکھا وہ ستاسی انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔  
 ”میری آج خیر نہیں۔“ وہ سب باتیں یادیں بن چکی تھیں وہ سانولی سی لڑکی منوں مٹی تلے دفن ہو چکی تھی۔  
 ”عادتیں بگاڑ رہے ہو تم میری کوئی بات نہیں مجھے بگڑی بیوی بھی قبول ہے۔“ سرگوشی سی ہوئی اور اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

”مجھ سے کبھی جد امت ہوتا۔“ حنائی ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھامے وہ وعدے لے رہی تھی۔

”نہ نب۔“ اس نے ہولے لے پکارا آنسوؤں کی ایک لکیری گالوں پر بہہ نکلی تھی۔

”اگر لڑکی ہوئی تو۔“ وہ شرارتی انداز سے پوچھ رہا تھا۔

”ہونہ۔“

”اور لڑکا ہوا تو۔“

”واہ جی! ساری پلاننگ اماں نے کرنی اور ابا سے پوچھا بھی نہیں۔“

”اپنے پتر کا نام تو رکھ دے۔“ آخری وقت جب وہ شہر آ رہا تھا تو گھاٹوں نے پوچھا تھا وہ ”زین“ کہہ کر رکا نہیں

تھا رکھتا تو وہ مسکراتی ہوئی دکھائی دے جاتی اسے رلا دیتی۔

”نہ نب!“ وہ زور سے چلایا سرگوشی پر حاضر ہونے والی اب چلائیے نے پر بھی نہیں آنے والی تھی وہ پھوٹ

پھوٹ کر رو دیا تھا۔ سرگوشی پر حاضر ہونے والی اب چلانے پر بھی نہیں آتی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

☆☆☆☆

موسم کے تبو خطرناک تھے بادل جھوم رہے تھے اور کبھی بھی وقت برسنے کو تیار تھے وہ کالج سے چھٹی کے بعد

ابھی گھر جانی رہی تھی جب بوند ابدی شروع ہو گئی تھی۔

”اف۔“ برستی بوندیں اسے زہر لگ رہی تھیں بارش تیز سے تیز ترین ہوتی جا رہی تھی لمحوں میں وہ بھیگ چکی تھی۔

”آئی ڈراپ پوئیم؟“ پائیک رکی وہ چونکی اور اسے دیکھا وہ بارش میں شرابور مسکرا رہا تھا۔

”اف۔“ وہ واقعی پرنس چارمنگ تھا۔

”اس دن تو آپ نے غیر کہہ کر لفٹ لینے سے منع کر دیا تھا اب مت کہنے کا غالباً اب ہم غیر نہیں رہے۔“ ندا

جھینپ گئی۔

”شراب بعد میں لیجئے گا محترمہ! میں اس بارش میں بس بہنے ہی والا ہوں۔“ وہ چونکی اور جلدی سے پائیک پر سوار

ہوئی بارش میں بھیکے اس کے کندھے کو مضبوطی سے جکڑ لیا ٹپ ٹپ برستی بوندیں اسے اندر تک سرشار کر رہی تھیں۔

☆☆☆☆

رات ہو چکی تھی تایا ابوا اور فرقان بک جھک کر نیچے چلے گئے تھے اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا اندر بیٹھی وہ

آگے کے لائحہ عمل طے کر رہی تھی صبح ابونے آ جانا تھا اور پھر اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یونہی

رات کے ڈیڑھ بجے وہ ایک نتیجے پر پہنچی تھی۔ ہولے سے اٹھ کر وہ باہر آئی اور ابو کے کمرے میں آگئی الماری

شہر میں کیسے رکھتا ہے۔“

”اس کا نام تو بتادے۔“ اماں نے جاتے وقت پوچھا تھا۔

☆☆☆☆

ابو کے کسی دوست کی شادی تھی وہ اور چھوٹی بہن نمرہ صبح ہی جا چکے تھے وہ گھر پر اکیلی ہی تھی عجیب سی بے چینی اور خوف حواسوں پر سوار تھا صبح سے کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا شام تقریباً 5 بجے کا وقت تھا جب بیرونی دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔

”فلک فلک۔“ نیچے صحن میں تایا ابو کا بیٹا فرقان چلا چلا کر اسے پکار رہا تھا وہ جو بے دلی سے کتاب لئے برآمدے میں بیٹھی تھی چونک پڑی ایک انجان سا ڈر۔

”فلک۔“ وہ اب دھاڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا ہوا پر آ رہا تھا وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے میں گھس کر کندی لگالی۔

”فلک چاچو نمرہ۔“ وہ اوپر آ چکا تھا اب انہیں پکارتا ہوا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

”دروازہ کھولو۔“ ایک لہر اس کے وجود میں سنسنی مچاتی دوڑ گئی تھی تبھی اس کے موبائل کی بیلپ بجی تھی ارحم کا

ٹیکسٹ تھا۔

”پیارے ماں جاتی تو تیرا ہی فائدہ تھا۔“ وہ اندر تک لرز گئی تو کیا وہ ویڈیو فرقان کے پاس آ گئی تھی۔ باہر

اب تایا اب فرقان سے پوچھ رہے تھے۔

”کیا ہوا ہے کیوں سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے؟“

”جاچو کہاں ہیں؟“

”فیصل آباد گیا ہے شادی پر ہوا کیا ہے؟“

”ابو! عزت رل گئی ہماری پیٹہ نہیں کسی نے مجھے یہ ویڈیو بھیجی ہے اس میں یہ۔“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا

تھاندر کھڑی فلک تھر تھر کانپ رہی تھی۔

☆☆☆☆

”آئی کیسی ہیں؟“ وہ اور عثمان کلاس سے ساتھ ساتھ باہر نکلے تھے۔

”بس ویسی ہی ہیں ٹرینٹ چل رہا ہے دیکھو کیا ہوتا ہے۔“ وہ دونوں کینٹین میں آ گئے تھے جہاں ایک

خالی میز پر خاموش حمزہ بیٹھا تھا۔

”حمزہ بھائی۔“ احمر بے تکلفی سے پاس آ بیٹھا۔

”کانی دونوں سے غائب تھے خیریت بھی ناں؟“ وہ بشارت سے پوچھ رہا تھا۔

”اور بھائی کیسی ہیں؟“ حمزہ کی آنکھیں جلنے لگی تھیں وہ لب کاٹنے لگا تھا۔

”شی ازڈائیڈ۔“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل آیا وہ دونوں شا کڈ بیٹھے رہ گئے تھے۔

☆☆☆☆

وہ خاموشی سے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا ہر طرف سناٹا تھا دو کمروں کا وہ گھر اس کے بعد اب

مکان میں بدل چکا تھا۔

”نہیب زینی۔“ تصور کے پردے پر وہ سانولی سی لڑکی نمودار ہوئی تھی۔

”اٹھ جاؤ نونج گئے ہیں۔“ وہ جلدی جلدی اس کے سامنے ناشتہ رکھ رہی تھی۔

سے وہ باکس نکالا جس میں امی کی جیولری تھی، کچھ کیش رقم تھی کچھ اور قیمتی اشیاء بھی باندھ لیں کچھ اس کی اپنی سیونگز تھیں چند جوڑے اور کچھ کھانے کی اشیاء بیگ میں باندھ لیں اپنا عبایا لے لیا خود کو اچھی طرح پلیٹ لپاٹ کر وہ باہر نکل آئی سیڑھیاں اترنے سے پہلے اس نے ایک آخری نظر اپنے اس گھر پر ڈالی تھی۔

”فلک آپ کی فلک بیٹا فلک جان“۔ ہولے ہولے وہ سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔

”فلک بیٹا اپنے باپ کی عزت کی لاج رکھنا“۔

”ہیلو جان خادم کو ارجم شاہ کہتے ہیں مجھ سے دوستی کرو گی؟ آئی لو یو“۔

”فلک کس سے بات کر رہی ہو؟ ابو دوست ہے“۔ تمہارے سرگوشیاں اور اب آنسو صرف خسارے ہاتھ آئے تھے نیچے خاموشی اور تار کی جھلی وہ ہولے ہولے چلتی دروازے تک آئی آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔

”فلک! لڑکیاں سیپ میں چھپے موتی جیسی ہوتی ہیں“۔ ابو کی آواز اسے ڈرا رہی تھی۔

”یہ چھپی اچھی لگتی ہیں یہ چھپی ہی محفوظ ہوتی ہیں“ ایک دفعہ موتی سیپ سے باہر آ جائے پھر وہ محفوظ نہیں رہتا اسے کوئی پالینا چاہتا ہے ہاتھوں میں رول لینا چاہتا ہے بیچ دینا چاہتا ہے۔ باہر گلی میں سناٹا اور تاریکی تھی وہ ہمیشہ کے لئے اس تاریکی میں نکل آئی تھی۔

”مجھے معاف کر دیجئے گا ابو! سمجھ لیجئے گا کہ آپ کی فلک ہمیشہ کے لئے مر گئی“۔ چند فقرے لکھ کر وہ ابو کے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆☆

احمر نے فون کان سے لگایا دوسری طرف ندا تھی۔

”آن لائن کیوں نہیں آئے؟ میں نے تمہیں ارسل کی تصویریں دکھائی تھیں“۔

”ہمارے کو تو ال ابو نے نیامک صادر کر دیا ہے جب تک پیپر ڈ نہیں ہو جاتے ہر شے بند کمپیوٹر ٹی وی نیٹ بڑا ٹال بس مارشل لاء لگ گیا ہے لگتا ہے تمہارا ارسل منحوس ہے مجھے نہیں دیکھنا اسے“۔

”شٹ اپ“۔ وہ چلائی۔

”اچھا گیس واٹ آج کیا ہوا؟“

”تم ہی بک دو“۔

”آج میں اس کے ساتھ ہی آئی کالج سے“۔ احمر بد مزہ ہوا۔

”محترمہ اسے کوئی کام نہیں آوارہ گردی کے علاوہ؟“

”بکواس مت کرو وہ تو بانی چانس ادھر سے گزر رہا تھا پڑھتا ہے وہ“۔

”ارسل نامہ“۔ شروع ہو چکا تھا چونکہ احمر کو اس میں رتی برابر جوہر چسپی نہیں تھی لہذا۔

”ندا ہیلو ندا آواز نہیں آ رہی“۔ کہہ کر کال کاٹ دی۔

☆☆☆☆

فرسٹ ایئر کے پیپر ز ختم ہو چکے تھے اس نے اپنا بیگ باندھ اور گاؤں آ گیا اکیلے گھر میں سناٹا اسے کھانے کو دوڑا تھا۔ حویلی کا بیرونی دروازہ کھٹکا تھا وہ خاموشی سے اندر آ گیا تھا بڑے صحن میں ایک طرف جھولا رکھا ہوا تھا ہوا سے آہستہ آہستہ ہلتا ہوا وہ جھولے کے نزدیک آ گیا تھا وہ ننھا سا وجود بے سدھ سورہا تھا وہ دم سادھے

کھڑا ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا تھا اسے پتہ نہیں کتنا وقت گزرا یونہی اسے دیکھتے دیکھتے زنب کا بیٹا اس کا اپنا بیٹا۔ وہ کتنا قیمتی تھا ناں۔

”ارے حمزہ پتر!“ اماں نے حیرت سے اسے پکارا تو وہ چونکا اماں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا تھا۔ عثمان کی امی کا علاج شروع ہوئے چار ماہ بیت چکے تھے روزانہ چیک اپ ہوتا تھا اور ہر چھوٹے دن خون تبدیل ہوتا تھا، نتیجہ ابھی تک زیر تھا، جتنے ٹیورمز نکال دیئے جاتے تھے اس سے دو گنا بن جاتے اعصابوں کی ایک طویل اور سخت جنگ میں سب سے پہلے شکست کھانے والے ماموں اور ممانی تھے وہ ڈائریکٹ کچھ نہیں کہتے تھے لیکن ان کی چڑچڑاہٹ، بلاوجہ کا غصہ اور چلانا بہت کچھ کہہ دیتا تھا امی کے لئے پرہیزی کھانے بنانا ممانی کو عذاب دکھائی دیتا، گھر بھر کی صفائی جو پہلے امی کر دیتی تھیں اب انہیں کرنا دو بھر ہو جانی، عثمان کو بہت غصہ چڑھتا لیکن وہ خاموش رہ جاتا، جیسی بھی تھی وہ آخری جانے پناہ تھی۔

☆☆☆☆

جھولے میں ننھا زین نجانے کب سے رو رہا تھا، ہر بندہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا، تائی اماں سبزی بنانے میں، اماں کپڑے دھونے میں سب کے اپنے اپنے کام تھے حلق پھاڑ پھاڑ کر روتے بچے کو چپ کر دوانے سے زیادہ اہم کام۔ حمزہ نے اسے جھولے سے نکالا اور گود میں لے لیا، چار ماہ کا وہ بچہ وزن میں روئی کے گالے جیسا تھا، وہ اسے تھکنے لگا تھا۔

”نی مریم! زین کو فیڈ رو دے دے“۔ تائی اماں نے باورچی خانے میں مصروف بہو سے کہا تھا۔  
 ”اماں میں ویلی نہیں“۔ وہ باورچی خانے سے ہی چلائی، حمزہ اس بچے کو تھپک تھپک کر چپ کر دوانے کی ناکام کوشش میں لگا تھا، بچہ بس بھاں بھاں کر رہا تھا شاید بھوکا تھا۔  
 ”ریمانہ تو اٹھ جا فیڈ ر بنادے“۔ ریمانہ شاید کانوں میں روئی ڈالے ڈالے ڈانچٹ میں گن تھی وہ زین کو گود میں لئے خود ہی باورچی خانے میں آیا۔

”بھائی فیڈ رکھاں ہے؟“ مریم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور مکھیوں سے جھنجھٹا فیڈ را سے تھما دیا، وہ بس دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆☆

بس رواں تھی وہ کھڑکی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی تھی کھڑکی سے آیا۔  
 ”باجی! کہاں جاتا ہے؟“ اس نے ایک لمحے کے لئے کھڑکی سے دیکھا۔  
 ”بس کہاں جا رہی ہے؟“

”خانیوال“۔ اس نے خاموشی سے کرایہ اسے تھما دیا، یادوں اور سوچوں کا وہ سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔  
 ”ابو آگئے ہوں گے وہ ویڈیو بھی دیکھ لی ہوگی ہائے ابو کہیں مرنا جائیں وہ ویڈیو اس میں ارحم بھی ہے وہ اسے ڈھونڈیں گے، لیکن نہیں! اس نے خود کو ویڈیو میں سے ڈیلیٹ کر دیا ہوگا، ہائے ابو کیا سوچیں گے؟“ زندگی بذات خود ایک سوالیہ نشان بن چکی تھی۔

☆☆☆☆

رات میں کسی وقت بچے کے رونے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی بچہ اماں کے ساتھ چار پائی پر تھا، مسلسل روتا بچہ اور بیزاری اماں۔

”چپ کر جا بس چپ کر۔“  
 ”تی اسے چپ کر واؤ۔“ کسی کمرے سے بیزار دادا ابو کی آواز آئی تھی وہ اماں کی چارپائی کے پاس آیا اور بچہ گود میں لے کر باہر صحن میں نکل آیا۔

”میرا بیٹا بس بس پایا آ گئے ہیں۔“ وہ ہولے سے اسے تھپکتا صحن میں پھر تاربا، وہ اس کا بچہ تھا اس کا بیٹا اس کے دنیا میں آنے کی وجہ وہ خود تھا تو پھر وہ اس کی ذمہ داری تھا نادادی نادادی کی صرف اس کی ذمہ داری وہ صحن میں اسے لئے پھرتے ہوئے فیصلے کر چکا تھا زینب کی اولاد ان حالوں میں نہیں رہے گی وہ خود اسے پالے گا اگلی صبح اس نے اپنا اور ننھے زین کا سامان باندھ لیا تھا۔

”میں اسے اپنے بیٹے کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ ناشتے کے دوران اس نے کہا تھا۔

”اسے رکھے گا کیسے؟ کیسے پالے گا اتنی سی جان کو؟“ تائی اماں فکر مند ہوئیں۔

”یہ میرا مسئلہ ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”یہ صرف تیرا مسئلہ نہیں ہے یہ ہماری بھی اولاد ہے ہمارا خون ہے یہ اس کی بہتر پرورش ہمارا بھی فرض ہے۔“ وہ ان کی بات پر ہولے سے مسکرایا۔

”بہتر پرورش میں خود کر لوں گا“ دن کے لئے کوئی آیا رکھ لوں گا“ کالج سے آنے کے بعد خود کچھ بھال کر لوں گا۔“ دادا ابو کو غصہ چڑھ گیا۔

”اب غیر عورتیں پالیں گی ہمارا بچہ ہوش میں ہے تو؟“

”جی! ابھی ہوش میں آیا ہوں۔“

”یہاں کیا مسئلہ ہے اسے؟“

”یہ مر جائے گا اماں یہاں۔“ وہ پھٹ پڑا۔

”چار مہینے یہ کیسے جی لالچ مجھے حیرت ہونے لگی ہے اسے جن حالوں میں آپ نے بچہ لے پھینک رکھا ہے اسے بہت پہلے مر جانا چاہئے تھا خیر میں بحث نہیں کرنا چاہتا“ میں اسے لے جا رہا ہوں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“ وہ ہولے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہائے! میری زینب کی نشانی! اب شہر میں رل جائے گی۔“ اس نے اندر آ کر سوتے ہوئے زین کو اٹھایا تبھی اماں اندر آ گئیں۔

”غیر عورتوں کے ہاتھ میں دے دے گا میرا بچہ؟“

”جی کیونکہ اپنے اسے لینے کو تیار نہیں ہیں آپ چلیں میرے ساتھ۔“ وہ خاموش رہ گئیں۔

”مجھے پتہ ہے اپنے شوہر کا گھر آپ چھوڑیں گی نہیں اور اپنا بچہ میں اب یہاں نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ باہر آیا۔

”میں نہیں لے جانے دوں گی۔“ تائی اماں بولیں۔

”بس کر دیں! خدا کے لئے بس کر دیں پہلے ایسی ہی باتیں اور دوسو سے ڈال کر آپ سب نے مجھے اکیلے شہر نہیں جانے دیا تھا اب بس کریں۔“

”اسے یہیں چھوڑ کر جا۔“

”نہیں! زینب کے بعد اب میں اسے بھی کھونا نہیں چاہتا۔“ وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

”تو زینب کو ہم نے مارا ہے۔“

”نہیں۔“ وہ زور سے چلایا۔

”نہیں اسے میں نے مارا ہے۔“ وہ ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”اسے میں نے مار دیا اماں! جس عمر میں اسے گڑیا کے گھر بنانے سجانے تھے آپ نے اسے میرا گھر بنانے اور سجانے میں لگا دیا، گڈے گڑیا کی شادی کرانے دلی آپ نے مجھ سے بیاہ دی تب جب اسے عقل بھی ناں مجھے ایک فضول سی ضد کے پیچھے شہر نے آپ سے آپ کا بیٹا نہیں چھینا لیکن آپ نے مجھ سے میری زینب چھین لی آپ سب نے نہیں مارا اسے میں نے مار دیا اسے۔“ بولتے بولتے اس کی سانسیں پھولنے لگیں۔

”نسلہ سال کی صحت مند لڑکی کے بدلے میں یہ چند ماہ کا لاغر بچہ دیکھ کر بھی آپ کو کچھ نہیں ہوتا ہے واقعی گھائے کا سودا تھوڑی ہے، بیٹی مر گئی تو کیا ہوا بیٹا مل گیا۔“

”تو سمجھائے گا ہمیں؟“ دادا ابو غرائے۔

”صدیوں سے ایسے ہی ہوتا آ رہا ہے۔“

”اور صدیوں تک ایسے ہی ہوتا رہے گا بے ناں دادا ابو۔“ وہ تھکن سے مسکرایا۔

”کیونکہ ہمیں قدر نہیں ہے نازندگی کی، نالڑکی کی، ناعلم کی، جہالت ہمیں پسند آگئی ہے لیکن میں یہ اور ہونے نہیں دوں گا، میرے ساتھ میری زینب کے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا، میرے بیٹے کے ساتھ نہیں ہوگا، میرے بیٹے کی زندگی کا مقصد کمانا شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا نہیں ہوگا، ایک انسان بننا مقصد ہوگا میرے بیٹے کی زندگی کا ایسے دوسو سے نہیں ڈالوں گا میں اس کے دل میں وعدہ کرتا ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے زین کو تھپکا اور بیک اٹھالیا۔

”خدا حافظ۔“

☆☆☆☆

بس اسے اتار گئی تھی وہ خانیوال بس اسٹیشن پر ساکت کھڑی تھی۔ منزل بے نشان تھی اور مسافت تاحیات اسے اب بس چلتے رہنا تھا، خالی بیچ پر بیٹھ کر اس نے پیچھے کا سوچا تھا اور پھر آگے کا، بڑے بڑے سوالیہ نشان تھے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا پہلے کس کو کل کرنے، نیا دن طلوع ہو چکا تھا، فلک الیاس سر جھکائے ساکت سی بیٹھی تھی کیسی بے قدری ہو گئی تھی ناں وہ پر گلہ کس سے کرتی، مجرم بھی تو وہ خود ہی تھی سارے قصور اس کے اپنے ہی تھے اس نئے شہر میں سب سے پہلا کام رہائش کا انتظام کرنا تھا، جھٹ جو کہ ایک انسان خصوصاً ایک لڑکی کی ترجیحات میں اول مقام برآتی ہے، ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں اسے کمرہ مل گیا تھا، خانیوال کے ایک گمنام سے دو سٹ کالج میں دوبارہ ایڈمیشن بھی لے لیا تھا۔ ایک قیمتی سال وہ کھو چکی تھی لیکن یہ تو بہت کم تھا آئندہ زندگی میں اسے اور بہت کچھ کھونا تھا۔

☆☆☆☆

سینکڑ ایئر کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں، زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا، حزنہ نے شہر آ کر سب سے پہلے ایک ”آیا“ کا انتظام کیا تھا جو اس کے کالج جانے کے بعد دن کے صرف چھ گھنٹے زین کو سنبھالتی تھی، بعد میں وہ خود اسے سنبھالتا تھا۔

☆☆☆☆

دونوں بھائی ویک اینڈ پر لاگ ڈرائیو پر نکلے تھے واپسی پر ایک پڑا ہٹ پر احمر نے بائیک روکی تھی۔



”چل پارٹی کرتے ہیں“۔ وہ احمد کو لئے اندر آیا تھا، ایک کوئے والی میز پر صرف ایک لڑکی بیٹھی تھی وہ ادھر ہی آ گیا۔

”ایکسیکو زمی! کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟“ لڑکی نے انہیں دیکھا۔

”نہیں“۔ لگا سا جواب ملا۔

”کیوں جی یہ کونسا آپ کی ذاتی ملکیت ہے، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا، ایک کرسی احمد کے لئے بھی بچھی۔

”یہاں سے دفع ہو جاؤ“۔ وہ لڑکی غصے سے چلائی۔

”کیوں بھئی؟“ احمد نے شوخی سے پوچھا اور پاس سے گزرتے ویٹر کو آڑ دیا۔

”جسٹ گونڈ ہیل!“ وہ لڑکی تن کن کرنی اٹھی اور دوسری میز پر چلی گئی احمد زور سے ہنسا تھا، احمد البتہ خاموش تھا۔

”بھائی پلیز یہاں پنکامت لیں“۔ لیکن اسے شاید پتہ نہیں تھا کہ اس کا بھائی پنگا لینے میں مانڈریشنل چیمپئن

تھا تھوڑی دیر میں ایک اور لڑکا اس لڑکی کے پاس آ بیٹھا تھا، وہ لڑکی اسے کچھ بتانے لگی۔

”اوہ ہیلو! سے کیوں تنگ کر رہے تھے؟“ وہ لڑکا احمد کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

”کیوں؟ تمہیں مل آیا ہے تنگ کرنے کا؟“ اس نے انتہائی معصومیت سے پوچھا۔ جواب اس لڑکے نے احمد کو اٹھا

کر میز پر بیٹھ دیا تھا، احمد گھبرا کر اٹھا اس لڑکے نے جھک کر احمد کو کالر سے اونچا کیا اور ناک پر مکار سید کیا۔

”اپنی اوقات میں رہا کر!“ کچھ دیر بعد وہ بائیک پر گھر جا رہے تھے۔

”ابو نے کچھ پوچھا تو یہ کہنا بائیک سے گر گیا تھا۔“

☆☆☆☆

کسی شے میں دل نہیں لگتا تھا، ایک عجیب سی کیفیت حواسوں پر چھائی ہوئی تھی، کالج سے ہاسٹل؟ کردہ کمرہ بند کئے پڑی رہتی تھی کچھ اور کرنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔

”ابو پتہ نہیں کیسے ہوں گے، نمبر پتا نہیں کیا کر رہی ہوگی؟ پتہ نہیں آج کیا پکا ہوگا۔“ ذہن ”پتہ نہیں“ میں اٹکا رہتا تھا۔

”میرا بیٹا بس پایا آ گئے بس۔“ وہ جلدی سی بچن سے فیڈر لے کر آیا اور ننھے زین کے منہ میں دیا، بستر گیلا محسوس ہوا تو جلدی سے زین کے کپڑے بدلے اور بستر صاف کیا، اتنی دیر میں دودھ پیتے پیتے وہ سوچا تھا اس نے گندے کپڑے اکٹھے کئے اور دھونے لگا اس سے فارغ ہو کر ابھی کتاب اٹھائی ہی تھی کہ وہ اٹھ گیا، کتاب رکھی اور چھوٹے نواب کو لے کر بالکونی میں آ گیا۔

”میں تو ایک کام بھی نہیں کروں گا، تم اماں ہوگی، صرف تم سنبھالو گی۔“ ایک دفعہ یہیں کھڑے کھڑے اس نے زینب سے کہا تھا۔

”ہاں ہاں سنبھال لوں گی وہ صرف میرا ہوگا، تمہیں میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔“ وہ ہولے سے مسکرا دیا زینب اور زینب کی باتیں۔

☆☆☆☆

ندانے اس کی سوچی ہوئی ناک دیکھی تو بے ساختہ تہقہہ مار کر ہنسی۔

”اچھی ہوئی ویسے تمہارے ساتھ ایسی ہی ہونی چاہئے زندگی حرام کی ہوئی ہے تم سب نے ہم لڑکیوں

کی۔“ احمر نے منہ بتایا۔  
 ”میں اس لڑکی کی جگہ ہوتی تو بذات خود تمہارا سر توڑ دیتی۔“  
 ”ہنس لو ہنس لو ہر ایک کا دن آتا ہے۔“  
 ”اچھا تمہارا کب آئے گا؟“  
 ”جلد۔“ ندانے ٹھیک گا دکھایا پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولی تھی۔  
 ”میں نے تمہیں ارسال کی پگچر دکھانی تھیں لیکن گم ہو گئیں خدا جانے میں کہاں رکھ کر بھول گئی۔“  
 ”دیکھ لو پھر! کیسی کالی بلی ہے تمہارا فیاسی۔“  
 ”شٹ اپ۔“ وہ چلائی۔

☆☆☆☆

وہ امی کے پیردہا رہا تھا، ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔  
 ”مجھے تمہاری فکر ہے عثمان! میرے بعد تمہارا کیا ہوگا بیٹے۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھیں، وہ پریشانی سے انہیں دیکھنے لگا۔  
 ”امی کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“  
 ”ٹھیک تو کہہ رہی ہوں ایک مکان تھا اب وہ بھی بیک گیا، نازین جائیدادیں ہیں نایک بیلنس! آگے تم نے ایم بی بی ایس کرنا ہے کہاں سے ہوگا اپنے ماموں کا نہیں پتہ ہے ایک دمڑی تک نہیں دیں گے۔“  
 ”امی! کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔“ اس نے رسان سے ان کے ہاتھ تھامے۔  
 ”اللہ تعالیٰ ہے ناں ہمارے ساتھ! فکر مت کریں۔“ وہ خاموش رہ گئیں۔  
 ”آپ ہیں میری جائیداد میرا اثاثہ میری زندگی بس آپ ہیں آپ میرے ساتھ ہیں بس کافی ہے۔“  
 ”ڈاکٹر بنا خواب ہے تمہارا۔“ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہ گیا۔  
 ”خواب اور بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔“

☆☆☆☆

وہ کچھ چیزیں خریدنے نزدیکی اسٹور پر آیا تھا، زین کے لئے دودھ، ڈائپر وغیرہ۔  
 ”حمزہ بھائی!“ چمکتی آواز پر وہ مڑا سانسے احمر کھڑا تھا۔  
 ”آپ تو عید کا چاند ہو گئے ہیں، نظر ہی نہیں آتے، کدھر غائب رہتے ہیں؟ اور یہ کون ہے آپ کا بھائی؟“  
 حمزہ نے پہلے اسے دیکھا پھر گود میں زین کو ہولے سے مسکرایا۔  
 ”میرا بیٹا۔“ آنکھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔  
 ”حمزہ بھائی! مجھے کیوں لگتا ہے کسی دن میری موت ہارٹ اٹیک سے ہوگی، رپورٹس بتائیں گی کہ شکا کڈ کی وجہ سے دل بند ہو گیا۔“ وہ ذرا رکا۔  
 ”اور تفتیش سے پتہ چلے گا کہ ہارٹ اٹیک سے پہلے مرحوم کسی ”حمزہ“ سے بات کر رہا تھا۔“ وہ اب مال سے باہر نکل آئے تھے۔  
 ”آپ اسے خود سنبھالتے ہیں؟“  
 ”جی۔“

”واہ! گریٹ ہیں آپ۔“  
 ”سارے والدین اپنے بچوں کو خود ہی پالتے ہیں سب گریٹ ہوتے ہیں۔“

☆☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں تھی جب ملازمہ نے وہ پیکٹ اسے لا کر دیا۔  
 ”یہ جی آپ کے نام کو ریپر سے آیا ہے۔“ ندانے اچنبھے سے پیکٹ کو دیکھا اور اسے کھولنے لگی ایک ڈبی تھی جس میں نازک سی بریسلٹ تھی اور ساتھ میں ایک کارڈ۔  
 ”اس حسین جادوگر نے کیا نام جس نے کوئی سحر چھونک کر مجھے اپنا اسیر بنایا لیا ہے میری نیندوں، خوابوں، حواسوں پر حاوی ملکہ کے لئے حقیر سا تحفہ پیش کرتھوئے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی، موبائل اٹھایا اور اس کا نمبر ملایا۔  
 ”تم نے مجھے جادوگر کہا؟“ چھوٹے ہی سوال کیا۔  
 ”میں نے تمہیں حسین بھی کہا۔“ بے ساختہ جواب آیا تھا۔  
 ”خدا تمہیں زندگی دے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔  
 ”میری زندگی تو تم ہوا رسل!“

☆☆☆☆

”یار! پریشان مت ہوا کرتاں۔“ وہ گھر جا رہے تھے جب احمر نے اس سے کہا تھا۔  
 ”میں ڈپرٹس ہو جاتا ہوں اپنی جان کو پریشان دیکھ کر۔“ عثمان نے اسے ہمو کا جڑا۔  
 ”بے غیرت کوئی مل نہیں رہی تو مجھ پر لان مار رہا ہے۔“  
 ”آئیڈیا اچھا ہے۔“ احمر نے قہقہہ لگایا، سامنے سے آتی لڑکیوں کے نزدیک جا کر رفتار آہستہ کی اور ”ہائے“ کہا جواباً انہوں نے اسے ماں بہن کی گالیوں سے نوازا تھا۔  
 ”اف! میرا تو پیٹ بھر گیا۔“ دونوں ہنسے تھے۔  
 ”ہنستے رہا کر اچھا لگتا ہے۔“ اسے دروازے پر اتار کر احمر نے کہا تھا۔  
 ”تیری دوستی میرے لئے زندگی ہے احمر۔“ عثمان نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام جھاڑا تھا۔

☆☆☆☆

کچھ تو تھا جو ٹھیک نہیں تھا، اتنے دنوں سے وہ جس کیفیت کو گھر سے دوری سے جوڑ رہی تھی وہ صرف یاسیت نہیں تھی اس دن جب وہ صبح بیدار ہوئی تو سر پچھنے کی مانند گول گول گھوم رہا تھا، متلی کی سی کیفیت تھی دو گولیاں کھا کر وہ کالج چلی گئی تھی کالج میں سارا دن سر چلرا تیار ہا تھا، واپس آ کر بستر سے لگ گئی زات کو کسی لمحے الٹی آئی تھی اور سب کچھ باہر اگلے دن نفاحت حد سے زیادہ تھی۔ مرتے کھتے وہ نزدیکی اسپتال پہنچی تھی اور وہ سب واقعی بچھتاوا، یاسیت، اداسی نہیں تھا، کچھ اور بھی تھا جسے سننے کے بعد وہ حقیقت میں مرجانا چاہتی تھی وہ ماں بننے والی تھی۔

☆☆☆☆

آیا ایک ہفتے کی چھٹی پر تھی۔ وہ ایک ہفتہ وہ کالج سے غیر حاضر رہا تھا، پڑھتا خاک، سارا دن اس کے نگرے اٹھانے میں گزار جاتا تھا، وہ دانت نکال رہا تھا، سارا دن روتا رہتا اور چڑچڑا ہوا رہتا، وہ پورا ہفتہ اس نے ایک جوڑے میں گزارا تھا اپنا ہوش تنک نہیں تھا۔  
 ”زین بیٹا، دودھ زین بیٹا چپ زین پاپا کی جان۔“ ان سب سے فرصت ملتی تو کسی اور شے کی باری آتی

ناں اس رات اسے سلا کر وہ لیٹا تو اس کا اپنا جسم ٹوٹ رہا تھا۔  
 ”میرے بیٹے کا خیال رکھتے ہونا۔“ خیل کے پردوں پر وہ سانولی سی صورت سوال کناس تھی۔  
 ”تمہارا بیٹا میری زندگی ہے اس کا خیال نہیں رکھوں گا تو مر جاؤں گا۔“

☆☆☆☆

”امی انھیں صبح ہو گئی ہے۔“ وہ انہیں کہہ کر خود چیخ کرنے واش روم میں چلا گیا، واپس آیا تو وہ ہنوز لیٹی ہوئی تھیں اس نے ہال بنائے کتابیں بیگ میں ڈالیں اور جوتے پہنے لگا۔  
 ”اللہ حافظ امی۔“ بیگ کندھے پر ڈال کر وہ کمرے سے نکلا اور بیرونی دروازے پر آیا احمر بایک لئے انتظار میں تھا وہ ذرا ٹھٹک کر رکا کچھ انہونی کا سا احساس کیا ہوا یہاں کیوں رک گیا، چل بیٹھ۔ احمر نے حیرت سے اسے دیکھا وہ واپس اندر کی طرف دوڑ گیا تھا۔

”عثمان کیا ہوا؟“ عثمان ماں کو پکارتا ہوا کمرے میں آیا لحاف ہٹایا۔  
 ”امی انھیں۔“ بند آنکھیں کھلی تھیں اس نے کلائی تھامی دھڑکنیں خاموش تھیں زندگی کی نازک ڈور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکی تھی۔  
 ”امی۔“ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

☆☆☆☆

”ہیلو جان! کل ملیں ٹھیک ہے یہ تمہارا گھر ہے؟ میں بکھر رہی ہوں ارحم۔“ وہ ساکت چٹ چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی یہ ان دنوں میں سے ہی کسی دن کا واقعہ تھا جب وہ ٹوٹی تھی بکھری تھی کسی کی بانہوں میں چمکا چور ہوئی تھی پھر جب سستی تھی تو ساتھ میں ایک نئی زندگی بھی جڑ گئی تھی یہ ان ہی دنوں کا ذکر ہے جب وہ راتوں میں ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے جب خار چڑھے ہوئے تھے جب نشے نشے اترنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ خاموشی سے لیٹی روئی رہی تھی اپنے گزرے کل پر ماتم کرتی رہی تھی حد پار کرنے والے پھر ایسے ہی روتے ہیں حد پار کرتے وقت ذرا بھر بھی شک نہیں ہوتا کہ بعد میں کیا ہوگا بعد میں کیا ہوگا یہ بتاتا ہے۔

☆☆☆☆

زین کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی وہ مسلسل چیک اپ کروا رہا تھا نمونیا، نزلہ، کھانسی، زکام بدلتے موسم کی سوغاتیں۔ وہ کالج سے مسلسل آف تھا دن رات ہر وقت اسے ساتھ رکھتا تھا ہر بار گیلے کپڑے بدلوانا، بستر صاف کرنا اسے بذات خود ایک سوتین بخار ہو چکا تھا پھینکیں کھانسی اس کا برا حال کر چکی تھی لیکن وہ ہر شے بھلائے اسے سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ اس رات اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا زین پھر سے خود کو اور بستر کو گویا کر چکا تھا گھومتے سر کے ساتھ اس نے زین کے کپڑے بدلے اور بستر صاف کیا، درمیان میں اسے الٹی آگئی تھی منہ صاف کر کے وہ جلدی سے پلاٹا اور چٹنے فرش پر پھسل گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی ٹانگ کے سسزو بری طرح کھنچ گئے تھے وہ بمشکل اٹھا، زین رو رہا تھا۔

”بس میری جان بس۔“ وہ اسے گود میں لینے ٹہلنے لگا، ٹانگ میں درد کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے ڈیڑھ گھنٹہ تک وہ اسی تکلیف میں بیچہ کو لیٹھاتا رہا تھا جب وہ سو گیا تو اسے لٹا کر وہ کارپٹ پر گر رہا تھا تکلیف کی شدت سر درد وہ اٹھنا چاہتا تھا لیکن انھیں کی ہمت نہیں تھی۔

☆☆☆☆

اس نے اپنی جمع پونجی کو گنا تھا، خرچ کرنے پر تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے یہ تو پھر چند ہزار روپے تھے، وہ کچھ سوچنے لگی، اسے کچھ ٹیوشنز لینی ہوں گی لیکن پہلے اسے اس مصیبت سے جان چھڑوانی تھی، اگلے دن وہ نزدیکی سرکاری اسپتال آ گئی تھی۔

”مجھے، مجھے ابارشن کروانا ہے“۔ تھوک نلگتے ہوئے وہ بمشکل بولی۔ لیڈی ڈاکٹر نے طنز یہ اسے دیکھا وہ روزانہ ایسے سینکڑوں کیس دیکھتی تھیں، گلٹ اور پریشانی کی ماری لڑکیاں جو عزت بچانے کے لئے ذلت کی آخری حد تک جاتی تھیں۔

”یہ آسان نہیں ہے، رسک ہے، تمہاری جان بھی جاسکتی ہے بی بی“۔

”کاش چلی جائے“۔ وہ بڑبڑائی۔

☆☆☆☆

احمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”آئی کا افسوس ہوا“۔ عثمان نے سر جھکا لیا تھا۔

”ڈونٹ وری، حوصلہ رکھو اور مجھے ہمیشہ اپنا بھائی سمجھنا، کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتانا“۔ اس دن حمزہ بھی تعزیت کے لئے آیا تھا۔ امی کے بعد زندگی ہر گز پہلے جیسی نہیں رہی تھی پیپر ز سر پر تھے لیکن اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو چکا تھا، امی کی یادیں ہر وقت بے چین کئے رکھتی تھیں وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ میسٹی سے بڑھے لیکن بے سود، امی کے بعد وہ اس گھر میں ویسے بھی بے وقعت ہو چکا تھا، مہمانی کی ڈانٹ، ڈپٹ، چلانا ہر وقت ہر سہارا چھن گیا تھا جیسے۔

☆☆☆☆

زندگی عجیب سی ہو گئی تھی۔ زمین کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی، نمونیا شد ہو چکا، روز چیک اپ ہوتا لیکن نتیجہ پھر وہی زیر و چھوٹا سا بچہ کھالس کھالس کر بے حال ہوا رہتا تھا۔ دوسری طرف فلک الیاس بھی جو خود کو دھنی اور جسمانی لحاظ سے ابارشن کے لئے تیار کر چکی تھی، دنوں میں وہ سوکھ کر کاٹھا ہو چکی تھی، سینکڑا ایئر کے پیپر ز نزدیک تھے سو گھر میں کرفیولگ چکا تھا، وی نیٹ سب بند، کتابیں اور صرف کتابیں، احمر کو کتابیں دیکھ دیکھ کر ابکاٹی آئے لگتی تھی۔

ارسل تین سال کے لئے امریکا جا رہا تھا، اندا اس لئے پریشان تھی۔

☆☆☆☆

وہ آپریشن تھیٹر میں تھی نشہ آور ادویات کے باوجود وہ مکمل بے ہوش نہیں تھی اپنے وجود کو کاٹتے نشتر اسے محسوس ہو رہے تھے درد کی شدت جیسے اس کی روح قبض کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے وجود پر بہتے پسینے کی دھاریں بھی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ تیز دھار آلہ بھی جو کچھ اندر تک کاٹ رہا تھا، اس کے حلق میں چیخیں اٹک رہی تھیں ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ مرنے والی ہے، جلد ہی موت کہیں آس پاس ہی تھی سرد اور انتہائی تکلیف دہ سی۔

”فلک میری عزت کا خیال رکھنا“۔ کوئی سرگوشی سے کہہ رہا تھا۔ دو دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا ڈاکٹر ز نے دو ہفتے کا بیڈ ریسٹ کرنے کو کہا تھا اور وہ بڑمردہ بھی سنا تھا۔

”فلک! آپ کبھی ماں نہیں بن سکیں گی“۔ وہ بمشکل چلتی ہوئی ہاشل آئی اور بے دم سی ہو کر اپنے کمرے کے فرش پر ہی چت لیٹ گئی کچھ ٹائٹل تکلیف دینے لگے تھے۔

”ہیلو جان من کل ملیں شیور“۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”کیوں نہیں بھڑک دیا تھا اسے؟ کیوں نہیں جھٹک دیا تھا اس کا بڑھا ہوا ہاتھ؟ جب پتہ تھا سب تو کیوں بنی انجان؟ اسے بتائی رہی کہ یہ سب غلط ہے خود کو کیوں نہیں بتایا؟ سارے قصور اس کے اپنے تھے رونا تو بننا ہی نہیں تھا کہا گیا تھا نا اسے کہ وہ محافظ ہے پھر لقب لگانے والے کو کیوں دی اجازت کہ لوٹ مار کرتا پھرے؟ جب ہم کسی کو ایک قدم کی اجازت دیں وہ ایک قدم تب ہی اٹھاتا ہے شکست ماننے والوں کو انت میں ہار ہی ملتی ہے جیت ڈٹ جانے والوں کی ہوتی ہے وہ کیوں نا ڈنی؟ وہ کیوں شکست کھا گئی؟“ فرش پر لیٹے، بے آواز روتے فلک الیاس نے حساب کتاب کئے تو سارے جرم اس کے اپنے ہی نکلے تھے سزا بھی اسے ہی بھگتنا تھی۔

”تمہاری قسم فلک! میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں“۔ اس کے بعد وہ اس کی محبت کو یاد کر کے نہیں اپنی محبت کو یاد کر کے رو رہی تھی۔

☆☆☆☆

رات تاریک اور سرد تھی وہ زین گود میں لئے بیٹھا تھا جب اس بچے نے خون کی الٹی کر دی تھی حمزہ کا دل جیسے کسی نے ہتھی میں لے کر مسل دیا تھا، تھر تھر کانپتے اپنے ہاتھوں سے اس نے بچے کو صاف کیا۔

”مجھے چھوڑ کر مت جانا بیٹا“ میں مر جاؤں گا“ تم میرے بیٹے ہو مجھے اکیلے چھوڑ کر مت جانا“۔ وہ روتے ہوئے اسے کبل میں لپیٹ کر باہر آیا اور اسپتال پہنچا، خود جری سے بے نیاز کرکڑائی جنوری میں وہ ایک شرٹ اور جینز میں تھا۔

”ڈاکٹر اسے بچالیں ڈاکٹر پلیز“۔ بچہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا، وہ اس کی آخری متاع تھا ڈاکٹر اسے حوصلہ دیتے رہے تھے سخت سردی میں گوریڈور میں ٹپکتے ہوئے وہ سردی سے نہیں خوف سے کانپ رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے بچہ واپس تھما دیا گیا تھا۔

”ڈونٹ وری مسٹر حمزہ! خطرے کی کوئی بات نہیں ہے انفکشن کی وجہ سے ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جلد ٹھیک ہو جائے گا“۔ اس نے گود میں سوئے زین کے ماتھے کو خشک ہونٹوں سے چوما تھا وہ پرسکون نیند سو رہا تھا۔

”پاپا کی جان! پاپا کی جان مت نکالے رکھا کرو“۔ گھر آ کر اس نے احتیاط سے اسے لٹا دیا تھا۔

”یہ تمہاری آخری نشانی ہے زینی! اسے میرے پاس ہی رہنے دو ناں تمہارے بعد کوئی صرف میرا بھی تو ہو“۔

☆☆☆☆

آج پہلا جیپ تھا وہ عثمان سے پیپر کے بعد ملا تھا۔

”کیسا ہے؟“

”فائن“۔ وہ اسے عجیب بگھا بگھا سا لگا تھا۔

”کیا ہوا پار؟“ اس کے ساتھ ہال سے باہر آ گیا۔

”میرے ادل نہیں لگ رہا امی کے بعد میرا جینے کو بھی دل نہیں کر رہا میں کیا کروں؟“۔ احمر نے اس کے کندھے پر چھکی دی تھی۔

”حوصلہ کریا“۔

”اور کتنا حوصلہ کروں؟ اب ہمت نہیں ہے مجھ میں“۔

”ہمت کیوں نہیں ہے ہمت ضرور ہے ضرور ہوگی انسان کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا خدا تو اسے سہہ

سکتا ہے تبھی یہ آزمائش تجھ پر اتاری گئی ہے۔“ عثمان خاموش رہ گیا۔  
 ”میں ہوں ناں یار! تیرا بھائی، دوست، اماں، جو مرضی سمجھ لے مجھ سے شیئر کیا کر جو بھی تیرے دل میں ہو رات کے ڈھائی بجے بھی مجھے آواز دے کر دیکھنا، میں حاضر ہو جاؤں گا۔“  
 ”پراؤڈ آف یو۔“ احمر ہنسا۔

”چل اب سمو سے کھلا دے مجھے اتنی انرجی ویسٹ ہو گئی بھاشن دینے میں۔“

☆☆☆☆

”حزہ بھائی! کدھر غائب ہیں امتحانی ہال میں بھی نہیں دکھائی دیئے؟ اور آپ بھوت بنے کیوں پھر رہے ہیں۔“ احمر نے اسے دیکھتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔  
 ”میں نظر کیسے آتا، میں وہاں تھا ہی نہیں۔“  
 ”مطلب؟ آپ نے پیپرز نہیں دیئے؟“ احمر حیرانی سے فوت ہونے کو تھا۔  
 ”نہیں۔“

”کیوں؟“ وہ چلایا۔

”بھٹکر صرف ہمارے بابا ہیں کیا؟“

”میرے بیٹے کی طبیعت خراب تھی۔“

”تو اسے کچھ دنوں کے لئے اپنی مدر کے پاس چھوڑ دیتے۔“

”وہ میری ذمہ داری ہے احمر! میری مدر کی نہیں۔“ وہ دونوں اب سرگرم پر چل رہے تھے۔

”تو سال ضائع کر لیا؟“

”سو تو ہے پر آتا جاتا کچھ نہیں تھا پیپرز دیتا تب بھی فیل ہو جاتا۔“

”اب کیسا ہے آپ کا بیٹا؟“

”فائن! چلو نہیں چائے پلوادوں۔“ پارکنگ میں پہنچ کر احمر بائیک لینے جانے لگا تھا۔

”میں ضرور پتا لیکن ذرا جلدی میں ہوں ادھار رہی کسی دن ضرور آؤں گا۔“ وہ مسکرایا۔

”میں اپنی زندگی میں آپ جیسے بندے سے ملا اب شاید کوئی اور شے مجھے حیران نہ کرے۔“

☆☆☆☆

رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی تھی، پیاس کی شدت سے اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے نچلے دھڑ میں ہونے والی درد کی شدت اسے حرکت سے روک رہی تھی۔

”پانی پانی۔“ وہاں کون تھا جو پانی کی بوندیں اس کے حلق میں ٹپکتا، بمشکل گھٹٹے ہوئے وہ میز تک آئی جبک خالی تھا۔

”ابو پانی پانی۔“ وہ بے دمی ہو کر فرش پر لیٹ گئی، پلکیں بند ہونے لگی تھیں، بے ہوشی میں ڈوبتے ڈوبتے

اس نے ابوی شبیہ دیکھی تھی وہ اسے نہیں دیکھ رہے تھے اسے نظر انداز کئے بوٹھتے چلے جا رہے تھے۔

”ابو ابو۔“ وہ پکارنی جا رہی تھی چلتے چلتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے آگ لاوے کی وادی تھی شعلے ہی شعلے بھڑک رہے تھے فلک الیاس اس وادی کے کنارے کھڑی تھی روزخ کی وادی کے کنارے۔

☆☆☆☆



”آپ بھوت بنے کیوں پھر رہے ہیں؟“ احمر کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اس نے آئینے میں خود پر ایک نظر ڈالی وہ حقیقت میں بھوت جیسا نظر آ رہا تھا بکھرے الجھے بال اندر کو دھنستی آنکھیں سوکھی کھال اور گندمی سے سیاہ ہوئی رنگت اس نے بے یقینی سے خود کو دیکھتے ہوئے کنگھا اٹھایا اور سر میں پھیرنا چاہا بال تانے کی مانند ہو چکے تھے کنگھا سر میں کہیں الجھ گیا اس نے زور سے کھینچا تو بالوں کا کچھا بھی اتر آیا۔ اندر کمرے میں زین اٹھ چکا تھا اس نے کنگھا رکھا اور اندر آ کر زین کو اٹھالیا اپنے بیٹے پر وہ ہر شے تیاگ چکا تھا۔

☆☆☆☆

پیسروں کے بعد ایک ہفتے کے لئے دونوں بھائی ندا کے گھر رہنے کے لئے آ گئے تھے ندا انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی ویسے بھی ارسل کے امریکا جانے کے بعد وہ بہت اکیلی ہو گئی تھی ان کے ساتھ خوب موم مستی ہوئی تھی۔

”ہم تمہارے ارسل کو لائیو دیکھنے آ گئے ہیں۔“

”وہ تو امریکا گیا ہوا ہے؟“ ندانے بتایا تھا۔

”لو جی پیاجی سات سمندر پار گئے! کہیں کوئی گوری نا پھنسا لائے۔“

”نہیں جی! میرا ارسل ایسا نہیں ہے۔“

”کہیں تم نے اس پر جادو تو نہیں کر دیا؟ کہ وہ کسی اور کو دیکھے تو بھسم ہو جائے۔“

”شٹ اپ احمر۔“

”ہاں تو اور کیا تمہاری بھنڈی جیسی صورت پر صرف وہی انسان فدا ہو سکتا ہے جس پر کالا جادو کیا گیا ہو۔“

”احمر بس۔“

”کہیں وہ اندھا تو نہیں؟“

”احمر میں تیرا خون پیلوں گی؟“

”اندھا نہیں پھر کیسے تمہارے پکوڑے جیسی ناک کو حسین کہہ دیتا ہے؟“

”اب تم پٹو گے مجھ سے۔“ ندانے نشن اس پر اچھالا تھا۔

☆☆☆☆

”کیا مطلب تو انٹری ٹیسٹ نہیں دے رہا؟“ اس نے حیرانی سے عثمان کو دیکھا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”دفین کون بھرے گا میری تیاری کی اور اگر سب کلیر ہو گیا تو میں کہاں سے لاؤں گا میڈیکل کی فینیس؟“

”ہو جائے گا یار۔ احمر نے رساں سے کہنا چاہا۔“

”کیسے؟“

”میں، ہیلپ۔“

”نہیں اب دوبارہ یہ بات مت کرنا۔ احمر برامان گیا لیکن چپ رہا۔“

”میڈیکل تیرا خواب ہے یار۔“

”میرے خواب اور بھی بہت تھے۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔

”میں نے سوچ لیا ہے رزلٹ آنے تک ٹیوشنزدوں گا، کچھ پیسے جوڑ لوں، کچھ ماموں سے کہوں گا بی ایس

کردن شاید آگے۔ احمر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”مجھے اچھا لگتا تیری مدد کر کے۔“

”تو نے کہہ دیا، مجھے سن کر اچھا لگا دوست۔“

”دوست بھی کہتا ہے اور پھر پراپا بھی کر دیتا ہے۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے کینے سے باہر نکل آئے تھے۔

☆☆☆☆

اس کی حالت اب قدرے بہتر تھی، زخم سوکھنے لگے تھے، تبھی وہ کالج آ گئی تھی، وہیں اسے پتہ چلا کہ فرسٹ ایئر کے ایڈمیشن ہو چکے ہیں وہ دھک سے رہ گئی، ایک اور سال ضائع ہونے کو تھا، وہ کلرک کے پاس آئی۔

”سر میں بیمار تھی اسی لئے نہیں آ سکی، آپ پلیز میرا ایڈمیشن بھی بھیج دیں۔“ آدھا گھنٹہ کلرک کی منتیں کر کے وہ اس قابل ہو گئی کہ۔

”آن لائن رجسٹریشن آپ خود کر لیں ہارڈ کاپی میں بھیج دوں گا۔“ یہ بھی بہت تھا وہ زندگی سنبھالنے آ گئی اور وہیں اس نے وہ ویڈیو دیکھی تھی رجسٹریشن کے دوران سائیڈ کے بیچ پر وہ ساکت رہ گئی۔

”سامنے ویڈیو چل رہی تھی اور وہ گم سم خاموشی سے بیٹھی تھی، ارحم نے خود کو اس ویڈیو میں سے ڈیلیٹ کر لیا تھا، اب اس ویڈیو میں صرف وہ رہ گئی تھی ٹوٹی، بکھری اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے ہر زخم رسنے لگا تھا، اندرونی، بیرونی، جسمانی، روحانی ہر زخم ہر گھاؤ۔

”تو فلک الیاس یہ پایا تم نے محبت کے نام پر تفت ہے تم بڑا اور تمہاری محبت بڑے۔“ روتے روتے وہ بھول گئی کہ وہ ہے کون، ہے کہاں، ہے کیوں، یاد رہا تو بس اپنا ماضی وہ بیل یاد رہے گئے، جو اس کے گناہ تھے اور اتنے انسانوں کی بھیڑ میں بھی وہ اس کے پاس لوٹ آئے تھے۔

”اللہ میرے اللہ۔“ خسارے پورے ہوئے تو اللہ یاد آیا تھا۔

”میں کمزور ہوں مالک! بشر ہوں ناں، بھٹک جانا، پھسل جانا میری عادت ہے، بھٹک گئی، پھسل گئی، تیری ذات کے ساتھ شرک کر گئی، کسی اور کو پوجنے لگی، اب معافی مانگوں تو کیا معاف کر دے گا۔“ وہ بکسنے لگی۔

”اپنے سب گناہوں کی معافی، ایک نامحرم سے ملنے کی محبت کی خطا کی معافی، جنت سے نکلنے کی غلطی کی معافی، ایک معصوم زندگی کے قتل کے گناہ کی معافی، مانگوں تو کیا تو معاف کر دے گا؟“ سامنے کمپیوٹر کی اسکرین پر اس کے اعمال چل رہے تھے ہر ہر منظر اسے خطا کا رہنما رہا تھا، خلا کا رہنما رہا تھا۔

”میں جتنی رسوا ہو چلی ہوں، مجھے اس سے زیادہ رسوا مت کر مجھے اب اس دلدل سے نکال لے میں سیاہ کار ہوں، بدکار ہوں، خطا کار ہوں، پر تیری بندی ہوں تو میرا مالک ہے مجھے معاف کر دے۔“ کافی دپر رونے اور آنسو بہانے کے بعد اس نے اس ویب سائٹ کو وہ ویڈیو بٹانے کے لئے ای میل کی تھی، ویڈیو سروس فیس بک تھی اس نے فیس بک کے علاوہ بھی کئی اہم ویب سائٹس کو میل کی تھیں۔

☆☆☆☆

احمر ایم سی اے ٹی (میڈیکل کالج ایڈمیشن ٹیسٹ) کی تیاری میں لگا ہوا تھا ابونے اسے تیاری کے لئے السلام آباد بھیج دیا تھا، نئی چیزیں اسے تھکانی نہیں تھیں وہ ہر شے انجام دے کرتا تھا اور MCAT تو کیم ہی فہانت اور لک کی تھی اور یہ دونوں خوبیاں احمر صدیقی کے پاس تھیں۔ عثمان اکرم ایڈمیشن سے پہلے کے تین ماہ مختلف جگہوں پر ٹیوشنز دے کر پیسے جمع کرنے میں لگا ہوا تھا، ایک ایک دن میں وہ دس دس جگہ ہوم ٹیوشن دیتا، 5th اور

8th کے بچے اس کی ناک میں دم کر دیتے۔ زین کی حالت قدرے بہتر ہو رہی تھی وہ بیٹھنا سیکھ رہا تھا، حمزہ اب دوبارہ سے سینڈائیز میں تھا، مارچ میں دادا ابو کی وفات پر وہ گاؤں گیا تھا، زین اس کیس اتھ تھا، وہ اس گندے سندھ سے کمزور بچے سے بہت مختلف تھا، جسے وہ اپنے ساتھ شہر لایا تھا، وہ اب بغیر سہارے بیٹھ جاتا، بات بات پر کھلکھلاتا، وہ ایک باپ کی مسلسل 365 دن کی محنت تھا اور محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ارسل کے واپس آنے کے میں دو سال تھے ندائیف ایکے بعد بی اے میں داخلہ لے چکی تھی۔ فلک نے بھی ہوم ٹیوشنز شروع کر دی تھیں، کالج کے بعد وہ پڑھانے جایا کرتی تھی۔

”میں نے آپ کو نیوز پیپر پر دیکھا تھا“۔ وہ جس بچی کو پڑھانے جاتی تھی ایک دن اس نے فلک سے کہا تھا، فلک جیسے سے مسکرا دی، گزرے دنوں کا ایک قصہ یہ بھی تھا کہ فلک الیاس بورڈ میں دوسرے نمبر پر بھی وہ اب کہاں تھی؟

☆☆☆☆

”ماموں“۔ شام کے کھانے کے بعد اس نے کہا، ماموں سے پیسے ممانی کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کچھ پیسے چاہئے تھے ایڈمیشن کے لئے“۔

”کہاں سے دے دیں“۔ ممانی جان۔

”تمہیں بتایا تھا ناں کہ تمہارے ماموں کا کاروبار خسارے میں جا رہا ہے چند ہزار کی منتقلی انکم بھی نہیں ہو رہی“۔ اس نے لمبی سانس لی۔

”لون کے طور پر دے دیں“۔ دونوں کے تاثرات بدلے۔

”ہوتے تو دے دیتا بیٹے“۔ عثمان آگے کو ہوا۔

”ماموں تقریباً 50 ہزار کا خرچہ ہوگا، 20 ہزار میرے پاس ہیں آپ 30 ہزار روپے ادھا رو دے دیں میں ایک سال کے اندر اندر لوٹا دوں گا، کسی دوست سے لے دیں“۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”اچھا دیکھتا ہوں کرتا ہوں کچھ“۔

☆☆☆☆

احمد صدیقی ایک دفعہ پھر لاہور بورڈ پر چھا گیا تھا، FSc کا رزلٹ آؤٹ ہو چکا تھا وہ بورڈ میں اول تھا، دوسری طرف انٹری میں اس کے 96 فیصد مارکس تھے میرٹ 93 فیصد بنی تھی۔ KEMU اس کے انتظار میں تھی۔ FSc سے دو ہفتے پہلے آنے والے میٹرک کے رزلٹ میں احمد صدیقی صرف پاس ہوا تھا، کسی پوزیشن کے بغیر 71 فیصد نمبروں کے ساتھ۔

☆☆☆☆

اس خوبصورت سے گھر کے لان میں پھر سے جشن کا سماں تھا، احمد کے دوست اور عزیز واقارب مدعو تھے، اس کی کامیابی کی خوشی میں جشن تھا، وہ ابو کے ساتھ داخل دروازے پر موجود تھا۔

”ابو احمد کیلا بیٹھا ہے“۔ ابو نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، ایک کونے والی میز پر سر جھکائے احمد مجرموں کے سے انداز سے بیٹھا تھا۔

”بیٹھا رہنے دو“۔

”ابو! خدا غواستہ وہ فیل نہیں ہو گیا“۔

”میں اسے فیل ہی سمجھتا ہوں“۔ وہ آنے والے مہمان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے صدیقی صاحب آنے

والے مہمانوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے تو وہ کونے میں آکھیا احمد خاموشی سے بیٹھا تھا۔  
 ”ادھر کیوں بیٹھے ہو یا ر! آؤ میرے ساتھ۔“  
 ”میں نہیں ٹھیک ہوں۔“ وہ افسردگی سے بولا تھا۔

☆☆☆☆

وہ کچھ ضروری اشیاء خریدنے بازار آئی تھی جب اس نے ایک دکان سے فرقان کو نکتے دیکھا تھا فرقان اس کا تایازاد۔ وہ دھک سے رہ گئی اور جلدی سے عبایا ٹھیک کر کے رش میں گم ہو گئی۔

☆☆☆☆

زین کمرے میں بیڈ پر بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا تھا، وہ کچن میں برتن دھو دھو کر ریک میں لگا رہا تھا اس سے فارغ ہو کر ہاتھ صاف کر کے کمرے میں آیا اور خود کوششے میں دیکھنے لگا۔  
 ”پاپا۔“ وہ بے یقینی سے مڑا بیڈ پر بیٹھا زین اسے دیکھ کر کھلکھلایا۔  
 ”پا..... پا۔“ وہ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے انک انک کر بول رہا تھا، حمزہ اپنی جگہ جامد اسے دیکھ کر رہ گیا۔  
 وہ پھر سے وہی ٹوٹے پھوٹے لفظ دہرا رہا تھا، حمزہ کا حشر ٹوٹا، وہ جلدی سے بیڈ کی طرف بڑھا اور ہاتھ سے گود میں اٹھالیا۔ ننھے بچے نے جھک کر اسے چوما تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔  
 ”جی جی پاپا کی جان جی۔“ بچے کی غول غاں جاری تھی اور وہ اسے بے تحاشا چومتے ہوئے رو رہا تھا۔  
 اسے اپنا آپ بے تحاشا قیمتی محسوس ہو رہا تھا، وہ کسی کی زبان سے ادا ہونے والے پہلے لفظ کا مطلب تھا اس خوشی کا کوئی حساب تھا بھلا؟ آنسو ابھی تک اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے آنسو جو ہر احساس کی ترجمانی کے لئے بہترین معاون ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

ماموں نے وہ پیکٹ اسے دیا تھا۔  
 ”تیس ہزار روپے ہیں میرے ایک جاننے والے نے دیئے ہیں دو سال کے اندر اندر لوٹا دینا۔“ وہ کھل اٹھا تھا۔  
 ”تھینک یو ماموں۔“ اس نے بی یو ایس آئز میں داخلہ لے لیا تھا۔ دوسری طرف ندا اصر سے بات کر رہی تھی۔  
 ”پارا نکل کو سمجھاؤ ایسے مت کر بس وہ ان کی سگی اولاد ہے۔“  
 ”میں نے کئی بار کہا ہے پر وہ نہیں مانے اسے FSc پری میڈیکل کروا رہے ہیں، میں نے کہا بھی کہ سپل FA کروادیں، پر نہیں وہ انٹر سٹڈ نہیں ہے میڈیکل میں۔“ ندا خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔  
 ”یہ زیادتی ہے اب اگر وہ تمہاری طرح ذہین نہیں تو اس کا کیا تصور ہے؟“

☆☆☆☆

وہ بے یقینی سے ای میل پڑھ رہی تھی جو کہ ایک معتبر ویب سائٹ کی طرف سے تھی اس کی درخواست پر وہ ویڈیو ہٹا دی گئی تھی اسے یقین دلایا گیا تھا کاب دوبارہ وہ ویڈیو آپ لوڈ نہیں ہونے دی جائے گی، فلک الیاس کو لگا اس کی توبہ قبول ہو گئی ہے کسی نے اسے اندھیروں سے روشنی کا راستہ دکھا دیا تھا، وہ کئی گھنٹوں تک وہ ای میل بھیگی پلکوں سے پڑھ کر مسکراتی رہی تھی دوسری طرف اصر اپنے چھوٹے بھائی کو کہہ رہا تھا۔  
 ”تم ابو سے خود کہو تمہیں FSc نہیں کرنی ہے، منع کر دو۔“

”وہ سن لیں گے میری.....؟ وہ مان لیں گے میری؟“ احمد استہزائیہ انداز سے ہنسا تھا۔ (جاری ہے)

# روحانی ڈائری

بھی بھی یادوں کی ہوا  
انہیں  
آنکھوں کے درپچوں تک بھی  
لے آتی ہے

جہاں یہ ہے  
شبنم کے قطروں کی طرح چمکتے ہیں  
مگر!  
انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا  
کوئی نہیں پڑھ سکتا  
سوائے اپنی ذات کے  
سوائے اپنے دل کے

کرن نازکی ڈائری سے

پروین شاکر کا کلام

ایک خوب صورت ڈرائیو  
اسی راستے پر  
میں کب سے سفر کر رہی تھی  
کبھی نیم تنہا  
کبھی دوستوں کی معیت میں  
اور کبھی  
اس طرح بھی  
کہ چلتی رہی اور ڈراست تک  
جاننے کی ضرورت نہ سمجھی  
دلاویز کم بولتے ساتھ ہیں  
ستمبر کی پتی ہوئی دو پہر میں

سیدہ عروج فاطمہ کی ڈائری سے

ناہید اختر بلوچ کی نظم

سنو، اے نادان لڑکی  
اب عشق کی  
گلیوں میں  
کسی عام سی  
لڑکی کے لیے  
کوئی شہزادہ  
نہیں آتا!!

سنو اب ایسا نہیں ہوتا  
کسی زمین زادی  
سے ملنے

فلک کی بیڑھیاں اتر کر  
کوئی فلک نہیں آتا!!

شہلا گل سحر کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

بیٹے دنوں کو  
من کی ڈائری میں  
لاکھ سنبھال کے رکھوں  
مگر!

یادوں کی پون جب بھی چلے  
ماضی کے اوراق بکھر جاتے ہیں  
جگنو، تنگی اور خوشبو کی طرح  
ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں

## فوزیہ گیلانی کی ڈائری سے

حمیرہ انصاف کی نظم

محبت کے اسیر اکثر  
محبت تسخیر نہیں کر پاتے  
ہتھیلی پر دمکتی، ہیرے جیسی چاہت  
کوئلہ سی لکیروں میں بدل ڈالتے ہیں  
محبت کے مطلب، معانی، معیار سے عاری  
اپنی سوچوں کے قافلوں کو  
ہر سمت دوڑاتے رہتے ہیں  
جذبے پر کھتے ہیں، وفا میں توہمتے ہیں  
کبھی اس سے کبھی اُس سے ملاتے رہتے ہیں  
یہ محبت کی شدتیں ہی اکثر  
اُس کی روح کو گھائل کر جاتی ہیں  
بیہوشیوں کو مود الزام ٹھہرانے والا ”عشق“  
انہی بات کا اکثر خود ہی سبب بنتا ہے  
منہ پر زور دل کی

لا تمانی خواہشیں، بے پناہ حسرتیں  
جو پیار کے رستوں پر بھی  
پر جوش قدم چاہتی ہیں  
اور حسی کے محاذ پر بھی  
جنگ کی قائل ہیں  
پھر وہ خود کو مزا کیسے سنائے؟

جو محبت! خود اپنی ہی قاتل ہے  
اپنی عجلت، کم ہمتی، ناقدری سے اکثر  
انمول سنے تعبیر نہیں کر پاتے  
عہد ناموں کے محل والے  
اعتبار تعبیر نہیں کر پاتے  
محبت کے اسیر اکثر، محبت تسخیر نہیں کر پاتے

☆.....

میں نے پہلی دفعہ یہ بھی دیکھا  
کہ اس راستے پر  
دور دیہ لگاؤوں کے تختے بچھے ہیں

## نانکے جبین کی ڈائری سے

ایک غزل

تاروں کی نمائش میں خلل پڑتا ہے  
چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے  
ایک دیوانہ مسافر ہے میری آنکھوں میں  
وقت بے وقت ٹھہرتا ہے چل پڑتا ہے  
اپنی تعبیر کے چکر میں میرا جاگتا خواب  
روز سورج کی طرح گھر سے نکل پڑتا ہے  
روز پتھر کی حمایت میں غزل لکھتے ہیں  
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے  
اس کو یاد آئی ہے دھڑکن ذرا آہستہ چل  
دل کی دھک دھک سے تصور میں خلل پڑتا ہے

## پروین اختر کی ڈائری سے

پروین شاکر کی غزل

مرنے سے بھی پہلے مر گئے تھے  
جینے سے کچھ ایسے ڈر گئے تھے  
رستے میں جہاں تک دیے تھے  
سارے میرے ہم سفر گئے تھے  
آنکھیں ابھی کھل نہیں سکی تھیں  
اور خواب میرے بکھر گئے تھے  
جب تک نہ کھلا تھا اس کا وعدہ  
موسم میرے بے ثمر گئے تھے  
گرداب سے بچنے والوں کی سمت  
ساحل سے کتنی بھنور گئے تھے  
اب تک وہی نشہ پذیرائی  
کل خواب میں اس کے گھر گئے تھے  
ملا نہ تھا واپسی کا رستہ  
کیا جانے ہم کدھر گئے تھے

# الشعار

ملک جواد نواز ————— ڈی آئی خان

عہد انصاف آ رہا ہے منیر  
ظلم دائم ہوا نہیں کرتا

سیمانا صر ————— ڈی آئی خان

اگرچہ سدرستے میں بڑے دلکش جزیرے تھے  
مجھے ہر حال میں لیکن سمندر پار جانا تھا  
حناعلیٰ ————— ملتان

اس شخص سے فقط اتنا سا تعلق ہے فرار  
وہ پریشان ہو تو ہمیں نیند نہیں آتی  
چیمہ وطنی ————— گنہت تو قیر

میں ریزہ ریزہ تو ہوتا ہوں ہر شکست کے بعد  
مگر نڈھال بہت دیر تک نہیں رہتا  
جواب مل ہی تو جاتا ہے ایک چپ ہی نہ ہو  
کوئی سوال بہت دیر تک نہیں رہتا  
رابعہ منیر ————— سرگودھا

ملے گا تو روئے گا اب بھی وہ لگ کے سینے سے  
کہ اپنے حال کا ماضی سے فاصلہ نہ رہے  
اتار کے تجھے دل میں، میں پھوڑ لوں آنکھیں  
پلٹ کر جا بھی سکے تو وہ راستہ نہ رہے  
نور بانو ————— کوئٹہ

ایک سیدھی بات ہے ملنا نہ ملنا عشق میں  
اس پر سوچو گے تو یہ کبھی مسئلہ بن جائے گا  
میرے سینے میں اک جذبہ بے نام ہے  
ضبط کرتے کرتے حرف مدعا بن جائے گا

سباس گل ————— رحیم یار خان

درد ہوتا ہے تو احساس نہ ہوتا ہے مجھے  
زندگی اب ابھی مجھ میں کہیں باقی ہے  
فرزانہ شوکت ————— کراچی

ہر سمندر کا اک ساحل ہے  
ہجر کی رات کا کنارہ نہیں  
وہ ملتا نہیں ایک بار ہمیں  
اور یہ زندگی دوبارہ نہیں

سیدہ عروج فاطمہ ————— ملتان

بچھڑتے وقت کی صدائیں یاد رہتی ہیں  
باوفا شخص کی وفا میں یاد رہتی ہیں  
خوشی کے تہواروں پر نجانے کیوں  
قسمت کی سزائیں یاد رہتی ہیں

ملک عامر نواز ————— ڈی آئی خان

اشک ہی رہ گئے آنکھوں میں  
داغ محرومیوں کے دھونے کو

مہرین کنول ————— ڈی آئی خان

سرفروشوں کے جہاں بکتے تھے سر  
عمر گزری وہ دکانیں بند ہیں

ملک ناصر جمیل ————— ڈی آئی خان

نئی نسلیں تحفظ مانگتی ہیں  
شجر خود اپنا پھل کھانے لگے ہیں



صبحر \_\_\_\_\_ ہارون آباد

اس جگہ عقل نے دھوکے کھائے  
جس جگہ دل ترے فرمان گئے  
کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ انگ  
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

نوشین مدر \_\_\_\_\_ لاہور

میں اس کو بھول گیا ہوں وہ مجھ کو بھول گیا  
تو پھر یہ دل پہ کیوں دستک سی ناگہانی ہوئی  
کہاں تک اور بھلا جاں کا ہم زیاں کرتے  
پچھڑ گیا ہے تو یہ اس کی مہربانی ہوئی

امبرین حیدر \_\_\_\_\_ اسلام آباد

عشق سمجھتے تھے جس کو وہ شاید  
تھا بس اک نارسائی کا رشتہ  
میرے اور اس کے درمیان نکلا  
عمر بھر کی جدائی کا رستہ

دھنک ناز \_\_\_\_\_ کراچی

برباد کرنے کے اور بھی رستے تھے فراز  
نجانے کیوں انہیں محبت کا ہی خیال آیا  
عانہ نیازی \_\_\_\_\_ ربوہ

میں محبت میں اس مقام پر ہوں جہاں  
میری ذات میں رہتی ہے تیری ذات مسلسل  
گہمت تو قیر \_\_\_\_\_ چیچہ وطنی

تنی رہتی ہے جہاں آنسوؤں کی  
تہ کیسی بارشوں میں آگئے ہیں  
کسی سے پوچھ کر رستہ ہمارا  
سنا ہے لوگ منزل پا گئے ہیں  
رابعہ منیر \_\_\_\_\_ سرگودھا

سیم اور تھور ہو گیا ہوں میں  
کوئی بادل برس نہیں سکتا

صدف منیر \_\_\_\_\_ سرگودھا

امرواقعہ ہے یہ، چاہتوں کے پیڑوں پر  
بارشوں کے موسم میں آشیانے لگتے ہیں  
عاصمہ رشید \_\_\_\_\_ فیصل آباد

سیلاب کے جاتے ہی چلے آئے ہوتے بھی  
جب اپنی تباہی پہ میں رویا تو کہاں تھے  
دھنک ناز \_\_\_\_\_ کراچی

ہم سنا نہیں سکتے تم سمجھ نہیں سکتے  
بے دیار لوگوں کے دکھ عجیب ہوتے ہیں  
فرح تنویر \_\_\_\_\_ ملتان

میں یاد بن کر ہی ترے ساتھ ہوں تو کاش مجھے  
ہزاروں سال تجھے جیتنے میں لگ جائیں  
نینا علی \_\_\_\_\_ گجرات

عشق میں اذیت کی کوئی انتہا بھی ہے  
در نہیں رہا تیرا پھر بھی دل سوا لی ہے  
تجھ سے ربط قائم ہے، خود کو یاد رکھا ہے  
رسم کو نبھایا ہے ریت بھی تو ڈالی ہے

مریم نواز \_\_\_\_\_ فیصل آباد

کچھ کھودینے کا اک دھڑکا کچھ نہیں کرنے دیتا  
دل سے لپٹے رہتے ہیں اندیشے گزری عمروں کے  
نور فاطمہ \_\_\_\_\_ ملتان

تمہارا ذکر اگر دن میں بھول جاؤں تو  
قضا سمجھ کہ میں راتوں کو جاگ لیتا ہوں  
رملہ علی \_\_\_\_\_ پشاور

ہو گیا اپنی ذات میں گم  
روشنی جیسے رات میں گم  
تجھے درد کا کچا گھر  
آنکھوں کی برسات میں گم

☆.....

# اس ماہ میں

پھر فرمایا۔ ”وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل جاتی ہے۔“ بس جھٹ جان پر کھیل گئی۔  
”ماں کی مامتا کا ساری دنیا ڈھول پیٹتی ہے باپ کی باپتا کا کوئی رونا نہیں روتا۔“

عصمت چغتائی  
دھنک ناز۔ کراچی

## اس ماہ کی رباعی

میرے چہرے پکھی تحریر پہ نہ جانا اے دنیا والو  
صدیوں کا فاصلہ طے کر کے اس فن کو سیکھا  
کہاں کس لمحے کس سے چھپانا کس پہ ظاہر کرنا  
اپنے دکھ درد کو ہے کیسے مسکراہٹ کا لبادہ دینا  
مریم ماہ منیر۔ لاہور

## اس ماہ کی نظم

عید  
عید بھی آئے گی اور آ کے گزر جائے گی  
مندل زخم مگر پھر سے لگیں گے رسنے  
یاد بے ساختہ آئے گا کوئی جان حیات  
اک اداسی سارے ماحول پہ چھا جائے گی  
دل بھی ایام گزشتہ کی نئی یاد لیے  
یاد کر کے اُسے روئے گا بہت دیر تک  
شاعر: فیضان عارف  
صباحر۔ ہارون آباد

## اس ماہ کی خوب صورت بات

جو چیز اللہ نہ دے، اسے انسانوں سے نہیں

## اس ماہ کے اقتباس

سکون: ”میں انسان کے اندر ایسا اضطراب پیدا کروں گا جو اسے ہر وقت بے چین و بے قرار رکھے گا۔ اس اضطراب کو دور کرنے کے لیے کبھی وہ زمین کی تہوں کو کھود ڈالے گا کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرے گا اور کبھی چاند ستاروں تک پہنچ جائے گا۔ اس کو سکون نہیں ملے گا۔“ بڑی سرکار نے جواب دیا۔  
”اور سکون اسے کہاں ملے گا۔“ انتہائی حیرت سے سوال کیا گیا۔

بڑی سرکار نے جواب دیا۔  
”اگر میں سکون پہاڑ کی چوٹیوں اور زمین کی تہوں اور سمندروں کی گہرائی میں رکھوں تو انسان اسے وہاں بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا مگر میں سکون کو انسان کے اندر رکھوں گا جس کے بارے میں وہ بہت کم سوچے گا۔“

قیصرہ حیات۔ الف اللہ اور انسان  
عانیہ نیازی۔ ربوہ

## عورت

مزے کی بات یہ ہے کہ جتنا مردوں نے عورتوں کو سمجھنے کا دعویٰ کیا ہے اتنا عورتوں نے مردوں کے متعلق کبھی کوئی قول اپنی عقل سے نہیں بنایا۔ مردوں نے کہا۔ ”مرد ظالم ہوتا ہے۔“ وہ چپ چاپ ظلم سہنے لگیں۔

مردوں نے کہا۔ ”عورت ڈرپوک ہوتی ہے۔“ وہ چوہیا تک سے ڈرنے لگی۔

مانگنا چاہیے ورنہ انسان بڑا خوار ہوتا ہے۔

نور بانو۔ کوئٹہ

اس ماہ کی ہری مرچیں

شوہر نے کار چلاتے ہوئے نیگم سے کہا۔ ”ذرا کار کی کھڑکیاں تو کھول دو گرمی سے برا حال ہو رہا ہے۔“ بیوی نے جواب دیا۔ ”چپ چاپ بیٹھے رہو۔ پیچھے ہمارے بڑی اسلم صاحبہ کی کار آ رہی ہے انہیں پتا چل جائے گا کہ ہماری کار میں ایئر کنڈیشنر نہیں ہے۔“

☆

ایک ماں نے اپنے بچے کو اسکول میں داخل کرواتے ہوئے کہا۔ ”میرا بچہ حساس ہے اسے سزا ہرگز نہ دیجیے گا اگر یہ اتفاق سے شرارت کر بیٹھے تو اس کے برابر والے بچے کو زور سے پھڑ مار دیجیے گا یہ خود بخود سمجھ جائے گا۔“

☆

ایک خاتون نے ٹریفک سارجنٹ کو اپنی تیز رفتاری کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

”میری گاڑی کے بریک خراب ہو گئے ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کسی حادثے کے بغیر گھر پہنچ جاؤں۔“

سیدہ امبر ہاشمی۔ کراچی

اس ماہ کی مزاچیہ غزل

میری محبت کو اپنے دل میں ڈھونڈ لینا اور ہاں آئے کو بھی اچھی طرح گوندھ لینا مل جائے اگر پیار تو کھونا نہیں پیاز کاٹتے وقت رونا نہیں مجھ سے روٹھ جانے کا بہانہ اچھا ہے تھوڑا سا کھلا دو اگر کھانا اچھا ہے پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

بچے دو ہی اچھے بیویاں بے شک چار رکھ آپ کی کشش سرفروش ہے آپ کا نشہ مدہوش ہے کیا کہیں تم سے اے دوست جس کتے تم کو کاٹا وہ اب تک بے ہوش ہے ایس اتیار احمد۔ کراچی

اس ماہ کچھ خاص

☆ رشتے اور رستے زندگی کے دو پہلو ہیں۔ کبھی کبھی رشتے نبھاتے نبھاتے راستے کھوجاتے ہیں اور کبھی کبھی راستوں پر چلتے چلتے رشتے بن جاتے ہیں۔ کسی کو رشتے اس آجاتے ہیں تو کسی کو راستے ہر فرق صرف اتنا ہے استوں کے دکھ برداشت ہو جاتے ہیں مگر رشتوں کے نہیں ہوتے۔

☆ انسان محبت ایک بار ہی کرتا ہے اور باقی محبتیں اس محبت کو بھلانے کے لیے کرتا ہے۔

☆ محبت اور نفرت دونوں اگر حد سے بڑھ جائیں تو جیون کی حد میں داخل ہو جاتی ہیں۔

☆ دکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہو جاتی ہیں مگر دل کے نہاں خانوں میں جا کر کسی ایک گوشے کو دیران کر دیتی ہیں اور یہ کسی مخصوص شخص کے لیے ہوتا ہے۔

☆ خود غرضی میں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔

☆ جن میں خوبی ہوتی ہے وہ باتیں نہیں کرتے اور جن میں خوبی نہیں ہوتی وہ باتیں کرتے ہیں۔

☆ ہم خیال لوگ ہم سفر ہو جائیں تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔

☆ زبان کو شکوہ سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

ماہِ رخ خان۔ کراچی

.....☆.....



### حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کچھ رشتے ہیں، میں ان سے احسان کرتا ہوں اور وہ برائی کرتے ہیں۔ میں نانا ملاتا ہوں اور وہ توڑتے ہیں جو میں صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر حقیقت میں تو ایسا ہی کرتا ہے تو ان کے منہ پر جلتی راکھ ڈالتا ہے اور ہمیشہ اللہ کی طرف سے تیرے ساتھ ایک فرشتہ رہے گا جو تجھے ان پر غالب رکھے گا جب تک تو اس حالت میں رہے گا۔“ (صحیح مسلم)

سیدہ نورین۔ کراچی

### اچھی بات

رشتے اور موسم دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کبھی حد سے زیادہ اچھے اور کبھی برداشت سے باہر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موسم جسم کو تکلیف دیتا ہے اور رشتے روح کو۔ (حضرت علیؓ)

گل بانو۔ پشاور

### لفظوں کی روشنی

☆ جس شخص کو عبرت حاصل کرنے کا شوق ہو اس کے لیے ہر ایک نئی چیز موجب عبرت ہے۔ (حکیم بقراط)

☆ زیادہ گفتگو کرنا ہر چند کہ اچھی باتیں

ہوں، دلیل دیوانگی ہے۔ (ارسطو)

☆ زمانہ پیری نہایت حسرت ناک ہے بشرطیکہ صحت اور سجادہ دست میسر ہو۔ (حکیم سقراط)

☆ دنیا کی مصیبتیں بظاہر زخم ہیں مگر درحقیقت ترقیوں کا موجب ہیں۔ (مجدد الف ثانی)

☆ علم دل کو اس طرح شاداب رکھتا ہے جیسے خشک زمین کو بارش۔ (حکیم لقمان)

☆ سچائی کا نام حسن ہے اور حسن کا نام سچائی ہے۔ (کینٹس)

☆ محبت پانا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں مگر محبت پھیلانا ہر ایک کے لیے ممکن ہے۔

☆ بددعا کبھی زبان سے نہیں دی جاتی وہ جو آنسو پلکوں میں انکارہ جائے بذات خود ایک بددعا ہوتا ہے اور دکھا ہوا دل خود ایک بددعا کی گزر گاہ بن جاتا ہے۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

### میٹھی زبان

حضرت بازید بسطامیؒ کا قول ہے کہ زندگی کو سادہ رکھو مگر خیالات کو بلند۔ ظلم کرنا آسان ہے مگر سہنا بہت ہی مشکل۔ میٹھی زبان بے شمار دشمنوں سے بچاتی ہے۔

دیوار

میاں بیوی میں لڑائی چل رہی تھی۔ بیوی نے شوہر سے کہا: ”اگر میں تمہارے رستے کی دیوار

نے فیصلہ کیا کہ دنیا تو اب غرق ہو رہی ہے۔ اس لیے تمام مذاہب کے رہنماؤں کوئی دی پر خطاب کا موقع دیا جائے اور یہ خطاب پوری دنیا میں براہ راست دکھایا جائے تاکہ ہر مذاہب کے رہنما اپنے ماننے والوں کو اپنی عاقبت سنوارنے کی تلقین کر سکیں۔ ہنگامی بنیادوں پر انتظامات ہوئے، تمام مذاہب کے چوٹی کے عالموں کو خطاب کا موقع دیا گیا۔ ہر کسی نے دنیا والوں کے سامنے اپنے مذاہب کو سچائی اور اس پر ایمان لے آنے کی تلقین کی۔ سگھ سردار کی باری سب سے آخر میں تھی۔ دوسروں کی تقریریں ہو چکیں تو سردار صاحب کیمرے کے سامنے آئے چند کچے خاموش کھڑے رہے اور پھر بولے۔ تین دن رہ گئے ہیں۔ ”ہن وی پانی وچ تیرنا سیکھ لو۔“

نامک جیوں۔ کھاریاں

**نامک**

نامک چار ہزار سال قبل مصر میں استعمال میں لایا گیا۔ اس کے بعد اس کا استعمال یونان اور روم میں ہوا۔ کرکسی کے استعمال سے قبل روم میں نمک لین دین کے معاملات میں کام آتا تھا۔ نمک، سفید، ہلکے گلابی اور ہلکے سرمئی رنگ کا ہوتا ہے۔ نمک کو سوڈیم کلورائیڈ بھی کہتے ہیں۔ نمک کو کھانوں میں ذائقے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نمک ذائقے میں پانچ طرح کا ہوتا ہے۔ نمکین، میٹھا، ترش، کڑوا اور خوشبودار۔

منزہ جیوں۔ حیدر آباد

یہ دل..... ہائے دل!

رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے  
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے

ہوں تو اسے گرا کیوں نہیں دیتے۔“  
شوہر بولا۔ ”جی تو بہت چاہتا ہے مگر دوسری دیوار بنانے میں خرچہ بہت آئے گا۔ بس یہ سوچ کر رک جاتا ہوں۔“  
نوشین مدر۔ لاہور

## چوری

لڑکا۔ ”جان تم اب بدل گی ہو۔“  
لڑکی۔ ”وہ کیسے؟“  
لڑکا۔ ”اب تمہارا ہاتھ پکڑتا ہوں تو تم شر ماتی نہیں ہو۔“  
لڑکی۔ ”پچھلی بار شرما کے آنکھیں بند کیں تو پرس سے 500 کا نوٹ غائب ہو گیا تھا۔“

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

برنارڈ شان نے تقریر کرنا کیسے سیکھی

ایک اخباری رپورٹر نے جارج برنارڈ شان سے پوچھا۔ ”آپ بہت اچھی تقریر کرتے ہیں آپ نے یہ فن کیسے سیکھا؟“  
”میں نے یہ فن اس طرح سیکھا جیسے لوگ سائیکل چلانا سیکھتے ہیں۔ بھی ادھر گرتے ہیں بھی ادھر گرتے ہیں، لوگ ان پر ہستے ہیں اور بالآخر وہ اس ہنسی اور مسخرے کے عادی ہو جاتے ہیں۔“  
سیدہ عروج فاطمہ۔ ملتان

## تیرنا سیکھ لو

ایک دفعہ بہت باریشیں ہوئیں۔ دنیا بھر کے ماہرین موسمیات نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چونکہ باریشیں بند ہونے کا امکان نہیں لہذا تین دن میں پانی کی سطح اتنی بلند ہو جائے گی کہ پوری دنیا ہی غرق ہو جائے گی۔ مسئلہ پورے کرہ ارض کا تھا جب کوئی حل نظر نہ آیا تو پوری دنیا کے رہنماؤں

کہ دل تو کالج کی مانند ہوتا ہے ذرا نہیں لگے تو فوراً چکنا چور ہو جاتا ہے۔ کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے دل کے ساتھ گردے کو بھی ملانا پڑتا ہے ورنہ کام ادھورا رہتا ہے۔ کبھی کبھار یہ ٹوٹ کر بکھر بھی جاتا ہے چونکہ یہ بڑے حوصلے کا مالک ہوتا ہے اس لیے اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اکثر و بیشتر اس کو خون کے آنسو بھی رونے پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ بڑا قابل رحم لگتا ہے۔ یہ جب اداس ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ پوری کائنات اداس ہے۔ البتہ یہ خوشی سے بلیوں بھی اچھلتا ہے۔ کوئی اس میں آکر رہ بھی سکتا ہے، بغیر کرایہ ادا کیے۔ اس میں بہت گنجائش ہوتی ہے البتہ کبھی کبھی یہ تنگ بھی پڑ جاتا ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں اسے بدلا بھی جاسکتا ہے۔ میرا مطلب آپریشن سے بدلنا نہیں ہے۔ کچھ لوگ اس کو لے کر مگر بھی جاتے ہیں ایسے لوگ بہت خود غرض ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ شیر دل بھی ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے دل شیر کے لگے ہوتے ہیں بلکہ اس کی وجہ ان کی بہادری ہے۔ کہتے ہیں کہ دل کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ بھی مانگ سکتا ہے کسی پر بھی آسکتا ہے۔ یہ دل ہی ہے جو آپ کے ہاتھوں سے نکل بھی سکتا ہے پھر اس کو واپس لانے کے لیے بہت پاؤں بیلنے پڑتے ہیں۔ یہ پتھر کا بھی ہو سکتا ہے یہ بہت بڑا شہنشاہ ہے جو مرضی میں آئے وہ کام کرتا ہے بس تھوڑا سا نادان ہے اس لیے اکثر لوگ اپنے دل سے نالاں نظر آتے ہیں۔ ایسے میں ان کا لہجہ بڑا جارحانہ ہو جاتا ہے، وہ اس معصوم سے سخت سوال کرنے لگتے ہیں۔ ”دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے“ مگر دل کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب

ہمارے دل..... میرا مطلب ہے کہ ہمارے پیارے جسم میں دل کا جو کام ہے ہمارا مقصد اس پر کسی قسم کی بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ مخصوص کاموں پر بحث کرنا ہے۔ مقصود ہمارا بہت دور کا رشتہ کہلاتا ہے جو بغیر مقصد کے کوئی بات نہیں کرتا۔ خیر ہم بات کر رہے تھے دل کی یہ مقصود خواہ مخواہ ہی بیچ میں ٹپک پڑا۔ دل ہمارے جسم کی واحد چیز ہے جو اگر کسی کو دے بھی دی جائے تو بھی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکنوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے بعض اوقات یہ ضد پراتر آتا ہے اور اڑنے کو مچھلنے لگتا ہے کہ میں تو اڑ کر ہی اپنے پیاروں کے پاس پہنچوں گا، ایسے میں اسے کنٹرول کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں البتہ ہوائی جہاز میں بٹھا کر اس کی خواہش پوری کی جاسکتی ہے۔

بعض اوقات بلکہ اکثر یہ بغاوت پر بھی اتر آتا ہے۔ ایسے میں اسے سچے جھوٹے دلاسوں سے بہلایا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دل کا کیا بھروسہ یہ تو جب اپنی پر آجائے تو پہاڑ سے بھی ٹکڑے لے سکتا ہے، ایسی صورت میں اس کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ البتہ مقابل کا سر ضرور کھل سکتا ہے چونکہ یہ نادان بھی ہے اور بے وقوف بھی، اسی لیے کبھی کبھی یہ چاند کو چھونے کی خواہش کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے اسے چکور بننا پڑتا ہے۔ اکثر عاشقوں کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہمارے سینے میں دو دل ہوتے اگر ایک ٹوٹ جاتا تو دوسرے سے کام چلا لیتے لیکن ہم اسے دیوانے کی بڑ کہیں گے کیونکہ اتنی شدید مہنگائی میں ایک ہی دل کا سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا ہے اگر دو ہوتے تو ہمارا کیا ہوتا۔ کہتے ہیں

نہیں ہوتا۔

☆ انسان کا دل ایک منٹ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے۔

☆ انسان کے خون میں 90 فیصد پانی ہے۔

☆ نارمل انسان کے جسم کا درجہ حرارت

98.4 فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔

سمیرہ عباس۔ کراچی

ابتلا

درویش دنیا داروں میں پسندیدہ نہیں ہوتا

اور دنیا دار درویشوں میں ناپسندیدہ رہتا ہے۔

سورج کی روشنی کو چمکا دو، مالو، چور اور ڈاکو

ناپسند کرتے ہیں۔ بہر حال شہرت ایک مستقل

ابتلا ہے۔ جہاں انسانوں کی خوبیاں مشہور

ہوتی ہیں وہاں ان کی خامیاں بھی مشہور ہونے

لگتی ہیں۔ ایک معمولی انسان کا گناہ بھی

معمولی ہوتا ہے لیکن ایک مشہور کا گناہ ایک

مشہور گناہ ہوتا ہے۔

وہابی و اصف کی کتاب ”دل دریا سمندر“ سے اقتباس

افسانہ حیدر۔ جھنگ

وہ بھی نہیں، میں بھی نہیں

دل سے دھڑ وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

دونوں انسان ہیں خدا وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

وہ مجھے اور میں اسے الزام دیتا ہوں

مگر غلط اپنی جگہ وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

محبت تو ہم دونوں کرتے ہیں دل سے

محبت کا گناہ گار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

عمر بھر ساتھ اگر ہم جی لیں تو کیا ہو گا

پر ہاتھوں کی لکیروں میں وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

اس کے علاوہ میں کیا مانگوں اس خدا سے

اور کسی چیز کا طلب گار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں

خضر حیات۔ لاہور

ایس اتیاز احمد۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ جس طرح چاند کے بغیر رات ادھوری ہے

اسی طرح علم کے بغیر ذہن۔ (سر سید احمد خان)

☆ وہی صحیح معنوں میں آزاد ہیں جو

خواہشوں کے غلام نہیں ہیں۔

☆ کامیابی کا وارو مدار آپ کی محنت اور

کوشش پر ہے۔ (شیکسپیر)

☆ لگن کے بغیر کسی میں بھی عظیم ذہانت پیدا

نہیں ہو سکتی۔ (ارسطو)

☆ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے

انسانیت داغدار ہو۔ (دکنر ہوگو)

☆ مسائل جہالت کے ذریعے طے نہیں ہو

سکتے۔ (نچمن ڈسٹرائلی)

☆ جہاں صرف جہالت ہی خوش رکھ سکتی ہو

وہاں عقل مند ہونا بے وقوفی ہے۔ (تھامس گرے)

☆ فتنہ انگیز سچائی سے منسلکت آمیز جھوٹ

بہتر ہے۔ (شیخ سعدی)

☆ مبسکراتا چہرہ معمولی کھانے کو بھی دعوت بنا

دیتا ہے۔ (جارج ہرلوٹ)

☆ ترتیب، کائنات کا پہلا اصول ہے۔ (پوپ)

☆ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح

حاصل کرتے ہیں۔ (دل کا کس)

محبوب خان۔ دہلی

سائنسی معلومات

☆ انسان کے مرنے کے بعد اس کا دماغ دو

سے چار گھنٹے تک کام کرتا ہے۔

☆ انسانی دل کے چار خانے ہیں۔



# دردِ دل کا کھانا

## محبت خوب صورت ہے

نہ دن لگتا ہے اچھا  
نہ رات میں سونے دیتی ہے  
محبت کب کسی کو  
تنہا ہونے دیتی ہے  
وہ چہرہ پھر اکثر  
دکھائی دیتا ہے چہاروں  
یوں لگتا ہے کہ جیسے  
ہے پھولوں میں بھی اُس کی خوشبو  
میں نے سنا تھا یہ  
خدا کی جان لیتی ہے  
مگر میرے لفظوں میں  
یہ جو رنگ سے بکھرے ہیں  
ہجر کا احسان ہے مجھ پر  
اُداسی مہربان ہے مجھ پر  
تمہیں جب سوچتی ہوں میں  
خود کو کھوجتی ہوں میں

یہ نام یہ شہرت  
تمہاری بدولت ہے  
محبت خوب صورت ہے

سیدہ عروج فاطمہ

غزل

دفا میرے کام تو آیا آئے ہیں اپنانے لوگ

تمتع امید کی جلانے آئے ہیں انجانے لوگ  
کتنی سحر نو آئی ہیں کتنے سورج ڈوب گئے  
چڑھتے سورج پدا آئے ہیں پھولوں کو برسانے لوگ  
پار کا منظر کیا دیکھیں گے پھولوں کے بدلے کانٹے پائیں ہیں  
گل تک جن کو اپنا جانا آج ہیں وہ بیگانے لوگ  
رہیں کیوں آس چاہت کی ہم ان سے اپنا رشتہ کیسا  
کام کسی کے کب آئے ہیں دولت کے دیوانے لوگ  
کس کو دل کا درد سناؤں کون اپنا کون پرایا  
جانے کہاں سے آجاتے ہیں محفل میں تڑپانے لوگ  
دل اپنا اب یہ کہے کہ دشت کو ہم پھر آباد کریں  
شہر میں تیرے جیسوں کو کہتے ہیں دیوانے لوگ  
آنکھوں دیکھا حال کہو سنی سنائی بات نہ کرنا  
سننے ہیں کہ غم کو بھلانے جاتے ہیں مینانے لوگ  
حسن یہ تجھ کو ناز ہے اپنے تم کو کسی سے کیا نسبت  
ڈھونڈو گے تو پائیں سکتے جاوید جیسے متانے لوگ  
جاوید اسلم

## سردی کا سماں

یہ سرد ہوا  
ہے چھوڑی  
میرے دل کی درود یوار  
ہے عجب شان سے  
کھڑے میرے کان  
کچھ اندر سے بوجھل بوجھل  
میرا دماغ

ہے عجب رنگت  
میرے رنگ دروپ کی  
ہے کچھ سفید، کچھ گلابی  
کچھ لالی میرے روپ کی  
پر لطف ہے پھر بھی یہ  
سردی کا سماں  
ہے اُجالا دے رہا فلک  
سرشام سے ہی، ہیں پر  
تاریک میرے مین و مکاں  
نہ برداشت ہے ٹھنڈ  
نہ بن اس کے مزاح  
پر لطف ہے پھر بھی یہ  
سردی کا سماں  
ہے سرد فضاء میں  
مہک رہی  
گرم گرم مونگ پھلیاں  
ہے عجب ککھلش  
موسم سرما  
پر لطف ہے پھر بھی یہ  
سردی کا سماں

زروہ و صمان

نظم

ایک نیلے نیوں والی لڑکی  
سرخ چوڑیوں کو کھٹکھٹاتی تھی  
شوخی من چلے دل میں  
کئی خواب سجاتی تھی  
دھانی پٹری سے لپٹا بدن  
شرم و حیا کا پیکر تھا  
نظروں کی جھال رہے وقت  
جھکی رہتی تھی

پر پھر کیا ہوا  
یہ شیشہ دل لڑکی  
پیدا لیس سدھار گئی  
باہل انگٹے کی سبھی خواہشیں  
یہیں میں مٹی اتار گئی  
خواب زندگی حقیقت کا  
روپ دھارنے لگی  
یہ نیلے نیوں والی لڑکی  
اس حقیقت سے ہارنے لگی  
خواب جو اس کے خوشنما  
تتلی رنگ تھے  
سب یہاں چکنا چور ہو گئے  
زمین بوس ہو گئے  
شوخی رعنائی کہیں گم ہونے لگی  
نیلے نیوں والی لڑکی جیسے اپنے  
آپ کو بھولنے لگی  
چوڑیوں کی کھٹک اب ماند پڑ گئی  
کھٹکیوں میں سرال کی چوڑیاں سج گئیں  
باہل انگٹا شدت سے یاد آنے لگا  
پر کیا کرے دنیا دستور سامنے آنے لگا  
ہر جانب یہی گونج آنے لگی  
لڑکیاں پر یاد دھن ہیں  
مگر یہ آہ یہ آواز  
نیلے نیوں والی لڑکی  
کے من میں ہی دب گئی  
کہ پرانے دھن کا کچھ  
محبت پر بھی حق ہے  
کچھ مان کچھ عزت  
پر بھی حق ہے  
پر یہ آہ فقط آہ ہی رہ گئی

ذرا سوچو تو.....!

ذرا سوچوں تو میری جان  
کسی خاص فرد کے بن رہتا

جو بہت اپنا ہوتا ہے

جسے بالکل اپنا سمجھتے ہیں

جسے اپنے آپ سے بڑھ کر چاہتے ہیں  
وہ اک پل کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جائے

داغی داغ مفارقت دے جائے

ہماری دسترس سے بہت دور ہو جائے

خالق کی رضا پر راضی ہو جائے

سوچوں تو دماغ کی تمام تر سوچنے سمجھنے

کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے

سانس ٹھہر جاتی ہے

دھڑکن ٹھہر سی جاتی ہے

کوئی بھی شخص کسی کا ساتھ دائمی نبھانہیں سکتا

یہ دنیاوی محبتیں دنیا میں ہی رہ جاتی ہیں

ماں و باپ، بہن بھائی، میاں بیوی بچے

عزیز و اقارب، کسی کے لیے بھی انسان

دنیا میں ٹھہر نہیں سکتا

آجائے قضا تو مہلت لے نہیں سکتا

یہ تو برحق ہے کہ قضا آتی ہے

پچھتے رہ جانے والوں کی بھی دکھی کہانی ہے

نہ کوئی مرکز چاہت ہوتا ہے

نہ کوئی دل کا دریچہ دیکھتا ہے

کسی خاص فرد کے جانے سے

زندگی اجڑی ویران ہو جاتی ہے

دعا ہے ملک الملک سے اپنے رب کریم سے

وہ سبھی کو آفات و بلیات سے محفوظ رکھے

وہ سبھی کو حادثات و ناگہانیوں سے محفوظ رکھے

نہیں کسی کو بھی خبر کہ کب تک کی ہے زندگی

نیلے نیلوں والی لڑکی

دنیا کے رواجوں میں رُل گئی

آسیہ مظہر چوہدری

نظم

کبھی کبھی

سب کو یوں ہی تنہا

بے وجہ بے مصرف بیٹھے

ہلکی نمی کی بے رنگ چادر

پیمانی کے پار کے سارے اُجلے

منظر دھندلاتی ہے

دل میں اک بے نام اذیت

ڈار سے پھڑکی کوچ کی مانند کر لاتی ہے

اس پر حاکم درد و چھوڑا

اک بھر پوری انگڑائی سے جاگ اٹھتا ہے

تو اس لمحے کیوں لگتا ہے جیسے وہ بھی یوں تنہا

بے وجہ بے مصرف بیٹھا ہوگا

میری یاد میں رو دیا ہوگا

فرزانہ شوکت

غزل

اپنی بستی کے سب کچے مکاں اچھے تھے

ان یقیوں سے تو وہم و گماں اچھے تھے

چھوڑ آئے تو یہ محسوس ہوا شدت سے

ہم جہاں بھی تھے بہر حال وہاں اچھے تھے

نامور ہیں تو ہر اک گام سے دل ڈرتا ہے

بات تو یہ ہے کہ بے نام و نشان اچھے تھے

جب جوانی تھی تو ہر بات بھلی لگتی تھی

اب یہ معلوم ہوا ہم بھی کہاں اچھے تھے

ان کی خاطر تو یہ انجام ہوا ہے اپنا

کون کہتا ہے کہ وہ شیریں بیاں اچھے تھے

ایس امتیاز احمد

## میں تمہاری ہوں

تم مجھ سے دور تو ہو  
مگر میرے دل کے اندر بستے ہو  
اور میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ!  
ہم خوابوں میں نہیں ملیں گے  
کیونکہ سنے بھی سچ نہیں ہوتے  
مگر اک بات یاد رکھنا  
تم میرے ہو اور میں تمہاری ہوں

فیضان احمد فیضی

## نظم

اوجاناں! سنا ہے یہ پڑھ بھی لو نا  
کچھ دنوں سے دل میں میرے کھلبلی مچی سی ہے  
میرا دل ہر پل یوں بی لے کل سار ہوتا ہے  
کچھ ان کہا سا اک سوال ہے پوچھنا تم سے  
کچھ لمحے کچھ وقت ہو تمہارے پاس اوجاناں!  
تو دل میں ابھرتا سا سوال یہ پوچھ لوں تم سے  
کچھ انجانا سا تعلق تمہارے میرے سچ میں ہے  
عرصے سے آشنائی کا جو رشتہ ہم نبھاتے ہیں  
تم اپنے دل کی دھڑکنوں کو تمام کر جواب دونا  
تمہارے دل میں جاناں! میرا کیا ہے نا؟  
اگر تم نہ بھی کہہ پاؤ تو میں نے کہہ دیا آخر  
تم خط میں یہ نظم پڑھنا اور پھر مسکرا دینا  
اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر

بہت جیکے سے دھیرے سے

لبوں کو قہقہہ دے کر یہ کہنا، اوجاناں!

مریم ماہ منیر

## غزل

کچھ قسمت میں لکھی جدائی بہت تھی  
کچھ اس شہر کے لوگوں میں بے وفائی بہت تھی

اب کے خیالات میں ذرا بھی عکس نہیں ملتا  
کبھی اس شخص کے ساتھ ہموائی بہت تھی  
اب اس سے بچھڑ کے سوچتی ہوں میں  
بس حال احوال تک ہی شناسائی بہت تھی  
وہ بات کیا بھی کچھ یاد نہیں ہے اب  
مگر اس ایک بات میں رسوائی بہت تھی  
جسے سن کے تیرا دل موم ہوا تھا  
میرے اس لفظ میں گہرائی بہت تھی  
آج جس شخص کی موت کا چرچا ہے شہر میں  
اس شخص کے گھر میں تنہائی بہت تھی  
حصہ کنول

## نظم

اشتہار بن گئی ہے جرات میری  
کبھی ہم بھی تھے تم سب میں  
جو پلٹ کے سزا دی تو جواباً مسکرائی  
اب مسکرانے کے بھی فسانے بنے لگ گئے  
کچھ جو کچھ سنا کچھ اور ہی  
تھی مجبوری جو کچھ میری  
اب لگا دوا اشتہار میری باتوں کا  
کہ پرواہ نہیں ہمیں اب اپنی رسوائی کا  
سحرش فاطمہ

## نظم

کچھ یہ وقت ایسا  
کچھ یہ حالات ایسے  
کچھ آگے رستہ ہے دشوار  
منزل نہیں کوئی اپنی  
مجھے ہے پہنچنا  
ساتوں آسمان کے پار

نور الصبا



جب تک کی ہے اپنوں کے سنگ  
جی بھر کر جی لو زندگی

ذرا سوچوں تو میری جان  
کسی کی جان بننے سے کسی کو جان بنانے سے  
زندگی کتنی حسین و دلکش لگتی ہے  
گروہ جان نہ رہے جس کو جان کہتے ہو  
زندگی کچھ نہیں بس را کھ لگتی ہے

ریما نور رضوان۔ کراچی

نظم

ابھی وہ درد باقی ہے

ہجر کے بے درد دھوئیں میں

جو ہمیشہ دل میں اٹھتا تھا

ابھی وہ خواب زندہ ہیں

کہ جن کی تعبیر پانے میں آنکھوں کھلایا تھا

ابھی وہ راستہ ہے یاد

جس پر مجھے کانٹوں نے پیروں کو لہو میں نہلایا تھا

ابھی وہ عشق تازہ ہے

سر مست روح کو جس نے زندان میں ڈالا تھا

ابھی تو دل کی دنیا میں کہیں تو نام اس کا ہے

ابھی بیتے دنوں کی سب یادیں سلامت ہیں

وہ سب گھاؤ بھرنے میں ابھی تو وقت باقی ہے

یہ قیامت جھیل گئے تو

پھر بیٹھ کے سوچیں گے

اگر زندہ بچے تو

پھر تم کو بتائیں گے

دوبارہ کب اجڑنا ہے

سحر مبین

تیری یاد

تیری یاد کا تپتا سورج

روح کھلے پاتا ہے

تیری یاد کا جاڑا  
پل پل دل کو ترپاتا ہے

تیرے ہجر کا سادون

کن من برستا ہے

تیری یادوں کے پت جھڑ میں

میرا دل ہر لمحہ بھگتا ہے

تیری بے وفائی کے گلاب

میری روح میں مہکتے ہیں

تیری کج ادائی کی دھند میں

زخم دل سلگتے ہیں

اشکوں کی برسات میں

دل سوز رہتے ہیں

اداس اداس خاموش خاموش رہتے ہیں

تیری یاد کے موسم میں جاناں

ہم ہر لمحہ ہر گھڑی مدہوش رہتے ہیں

شہلا گل سحر صالح

غزل

اے حسن ناتمام ذرا آنکھ تو ملا

خالی پڑے ہیں جام ذرا آنکھ تو ملا

جلتے نہیں چراغ ستاروں میں دم نہیں

منغوم ہے یہ شام ذرا آنکھ تو ملا

ہم بھی ہیں تیری دید کے مشتاق اے ندیم

ہو ہم سے ہمکلام ذرا آنکھ تو ملا

ان کشتگان عشق کی روداد کیا ہوگی

لاب پہ ان کا نام ذرا آنکھ تو ملا

اے حسن نو بہار تجھے دیکھنے قمر

آیا ہے تیرے بام ذرا آنکھ تو ملا

تو گلشن حیات میں نازدادا کے ساتھ

گل ہیں تیر غلام ذرا آنکھ تو ملا

حکیم خان حکیم



# سٹریٹ

## گیتی آراء — کراچی

پیاری آپ! آپ کی اور نورین کی خدمت میں ہمارا ڈھیروں سلام دعائیں اور پیار اور ایک بار پھر آپ سب کو ردا کی، آپ کی اور جشن آزادی کی سالگرہ کی دلی مبارک باد اور ساتھ ہی بقرعید کی بھی۔ 8 اگست کو ہمیں ہمارا دلعزیز ردا ملا۔ دیکھ کر طبیعت ہمیشہ کی طرح خوش اور بارغ باغ ہو گئی۔ سب سے پہلے حسب معمول گوشہ آگہی کی طرف بڑھے تو ہمیشہ کی طرح اچھا رہا۔ قمرش کا سلسلے دار ناول ”صحرا کی گلیوں میں عشق“ میں بقیس آراء کی مفلسی اور غربت کی داستان قابلِ رحم ہے۔ تمہینہ بانو کی ”مکافاتِ عمل“ بھی کمال تحریر تھی۔ شہلا گل سحر نے ”میرا خواب میری خوشی ہو تم“ میں کیا خوب کہا ہے کہ ”محبت آسمانی اور الوہی جذبہ ہے۔ اس کے جادو سے ہی ایک شخص دوسرے کے لیے ساری دنیا سے منفرد نظر آنے لگتا ہے۔“ حور العین ہر لحاظ سے اس ماہ کی سب سے منفرد اور زبردست تحریر رہی۔ جویریہ بانو نے تو کمال کر دیا۔ تمہینہ چوہدری کی ”بلا عنوان“ مختصر مگر خوب صورت انداز تحریر لیے ایک اچھی تحریر تھی۔ ریحانہ آفتاب کا ناول ”عشق کی داستان“ میں کہانی تیزی سے دلچسپ موڑ اختیار کرتی جا رہی ہے آنسو کو اس کے خوابوں کا شہزادہ ملنے والا ہے۔ ایقان علی کی ”یا قادر“ پڑھ کر خدا کی قدرت اور دعاؤں کی طاقت پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکی۔

ماریہ خان کی ”محبت یقین کامل“ میں سونی کا شوخ و چنچل کردار اچھا لگا۔ مریم فاطمہ کی ”خالی ہاتھ“ اچھی تحریر تھی۔ سیدہ عروج کی ”عشق سید ہے“ نظم اچھی لگی۔ فضا الرحمن کی ”دلوں کے ملن“ اچھی رہی۔ سعدیہ عابد ”ایک تھا حظلہ“ ایک اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ پڑھ کر دل ہول گیا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ”ماں“ مریم علی کی ماں نے دھی کر دیا۔ ایقان علی ”مستارے“ میں بھی اپنے جدا گانہ انداز تحریر کی وجہ سے میدان مار لے گی۔ شازیہ جی تو پہلے ہی اپنے ناول کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہیں اور کھڑکی ہیں۔ ”ردا کی ڈائری“ کے سبھی انتخاب اچھے تھے خاص کر رابعہ افضال اور ایم جے قریشی کا انتخاب۔ ”اشعار“ میں شاہ گل، مہرین کنول، حنا علی، عبدالغفار نے خوب لکھا۔ ”اس ماہ میں“ اور ”خوشبو“ ہمیشہ کی طرح زبردست رہے۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ میں ریحانہ آفتاب ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ۔ ”سندیے“ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ”پکن“ بقرعید کے حوالے سے لا جواب تھا۔ ”سنگھار“ میں بالوں کے متعلق ٹپس بہترین تھی۔

## افشاں علی — کراچی

محبّتوں کے پھول اور دعاؤں کے خزانے لیے افشاں علی ایک بار پھر سے سندیے کی محفل میں جلوہ گر ہیں۔ گو کہ یہ غیر حاضری تھوڑی طویل ہو چلی تھی اس لیے مصروفیت کے اژدھوں کے چاک کر کے فرصت کے

لحات نکال ہی لیے۔ سب سے پہلے پیاری سی صالحہ اپنا آپ کو سالگرہ مبارک ساتھ ہی ردا اور پاکستان کی بھی سالگرہ مبارک ہو۔ دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کو صحت و تندرستی ڈھیروں خوشیاں اور درازی عمر عطا فرمائے، (آمین) اور ردا بھی یوں ہی ترقی کی راہوں پر گامزن درخشاں ستارہ بن کر چمکتا رہے، (آمین)۔ جب کہ پیارے وطن کے لیے تو ہمارا رواں رواں دعا گو ہے کہ اللہ اسے برے لوگوں کی نظر بد سے بچائے اور دین اسلام و پاکستان کا جھنڈا ہمیشہ عالم اسلام میں سرخو رہے، (آمین)۔ جون میں میرے افسانے ”رنگ عید حقیقی خوشیوں کے رنگ“ کو جگہ دینے کے لیے بہت شکریہ۔ جون اور جولائی دونوں ہی عید نمبرز بہت ہی زبردست رہے اس میں بلاشبہ ردا ٹیم و صالحہ آپ کی کا ہی ہاتھ ہے اور ہماری پیاری رائیڈز کا بھی جن کی تحریروں نے عید نمبرز پر چار چاند لگائے عید سروے بھی خوب رہا۔ اپنے نام کی کمی تھوڑی محسوس ہوئی (باہا با)۔ جون میں شہلا گل سحر کے پیغام میں اپنا نام پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جولائی میں دوستوں کے نام پیغام میں شازیہ مصطفیٰ کی والدہ کا سن کر از حد افسوس ہوا اللہ انہیں جنت الفردوس اور گھر والوں کو صبر و حوصلہ عطا فرمائے، (آمین)۔ اس کے علاوہ عانیہ نیازی اور پیاری ثناء کنول کا پیغام اپنے نام دیکھ کر از حد خوشی ہوئی۔ پیاری سی لڑکی تمہارا نام تمہارا پیغام دیکھ کر ہمیشہ دلی مسرت ہوتی ہے۔ جیسا تمہارا حال ہے کچھ ایسا ہی ہمارا بھی حال ہے۔ تم سے ملنے کی خواہش اتنی ہی شدید تر ہے جتنی ہر ماہ روا ملنے کی ہوتی ہے تمہاری دوستی تمہارا پیغام تمہاری نظم تمہاری دعا اور تمہارا مخاطب کرنا میرے لیے باعث خوش قسمتی ہے۔ نصیبوں سے دوست ملتے ہیں اور پر خلوص و ہمدرد دوست تو قسمت کی بات ہے میری بھی خواہش ہے کہ تم سے ملوں یا کم از کم پیاری لڑکی تم سے بات ہی

کر سکوں تمہاری آواز ہی سن سکوں تب تک کے لیے ہم ردا کے توسط سے یوں ہی قلمی تعلق سے وابستہ رہیں گے دعا ہے کہ خدا تمہاری ہر دلی خواہش پوری فرمائے اور ڈھیروں خوشیوں سے نوازے، (آمین)۔ اب آتے ہیں جناب آزادی و سالگرہ نمبر کی طرف ”گوشہ آگہی“ میں صالحہ اپنا آپ کی باتوں سے ہم بھی متفق ہیں۔ باقی آپ نے پیغام میں بالکل بجا فرمایا۔ آن لائن کے بجائے ہمیں کتاب کو اہمیت دیتے ہوئے کتابی شکل میں ہی اپنے ادب کو فروغ دینا چاہیے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی مکمل ناول ”گلشنِ بے معطر ہوائے عید“ نام کی طرح بہت ہی زبردست ناول اسٹوری و منظر نگاری شاعرانہ رہی۔ ”مکافاتِ عمل“ ناولت بھی دنیا میں ہی سزا و جزا کو ظاہر کرنا اچھا تھا۔ افسانے تو سبھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ شہلا گل سحر کا افسانہ عید کے رنگ میں خوشیوں بھری سوغات لیے اچھا لگا۔ خالی ہاتھ، حورالعین، بلا عنوان، عشق سید ہے خیال رکھنا، ماں، یہ سبھی افسانے بھی اچھے تھے مگر اسے اندر ایک اداسی سموئے ہوئے تھے۔ ”دلوں کے گن“ بھی خوشگوار اختتام کے ساتھ اچھا افسانہ تھا جب کہ ”عشق سید ہے خیال رکھنا“ نام کی طرح اس میں شامل نظم دل کو بھائی۔ اس ماہ جو افسانہ دل کو چھو گیا وہ تھا ”یا قادر“ کے خوب صورت عنوان کے ساتھ ایقان علی کا افسانہ جس میں ایمان و یقین پختہ ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے اور بے شک اللہ ہی قادر مطلق ہے کا سبق بخوبی دیا گیا۔ ویل ڈن ڈنیر باقی ہر سلسلے وار ناول کی قسط اچھی رہی۔ تفصیلی تبصرہ آخری قسط میں ہی دوں گی۔ مستقل سلسلے ہمیشہ ہی خوب سے خوب تر ہوتے ہیں سندیسے کی محفل کو سائرہ مشعال، سیدہ عروج، شہلا گل، سحر مبین، گیتی آراء اور انیتا اختر نے سجایا مگر عانیہ نیازی، دھنک ناز، فریدہ فرید، صباح، نور بانو، ثناء کنول، رابعہ افضال آپ سب کی کمی شدت سے

مکمل ناول میں نیلہ نازش نے پہلی بار لکھا اور کمال لکھا۔ ناولٹ میں تہینہ بانو نے بھی خوب رنگ جمایا۔ افسانوں کی طویل فہرست اس بات کی گواہ تھی کہ سب نے اپنے اپنے انداز میں ہمیں زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ پھر بات ہو حورالعین کی، یا قادر، خالی ہاتھ، عشق سید ہے، یا ایک تھا حظلہ سب ہی بہت اچھے تھے۔ مستقل سلسلوں میں سبھی سلسلے زبردست تھے اور آل اگست کا شمار بیسٹ تھا۔

### دھنک ناز ————— کراچی

ڈیر صالحہ آپلی اور سویت سی تورین سب سے پہلے آپ کو سلام عرض ہے اس کے بعد ردا کی سند ہے کی محفل میں شرکت کی اجازت لیے ہم بھی شائع محفل ہوتا چاہتے ہیں۔ دلکش تحریر اور خوب صورت نگارشات کا گلدستہ لیے ردا ہر بار کی طرح اس بار بھی بہت ہی خوب صورت رہا۔ تمام رائج ناولٹوں نے بہت اچھا لکھا اور سب سے زیادہ میرے لیے سلسلے دار ناولز کی اقساط دلچسپی لیے ہوئی ہیں۔ جن کا بے صبری سے مجھے انتظار ہوتا ہے اور سبھی سلسلے دار ناولز اس بار بھی اچھے رہے۔ مستقل سلسلوں میں مجھے پیغام، سندیسے اور پچن سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے سب کے پیغام پڑھ کے بہت اچھا لگتا ہے اور سندیسے میں نصف ملاقات بھی دلچسپ رہتی ہے۔ کوکنگ سے مجھے دلچسپی بہت زیادہ ہے اس لیے میں ضرور رٹائی کرتی ہوں اس میں سے کچھ نہ کچھ۔ آخر میں میری دعا ہے ردا یوں ہی ترقی کرتا رہے اور ہمیں مزے مزے کے ناولز، ناولٹ پڑھنے کو یوں ہی ملتے رہیں۔

محسوس ہوئی پیاری سا ترہ مشعال آپ نے بہ خوبی اندازہ لگایا ”میں بھولی میرا آشیان“ میں نے ہی تحریر کی ہے اور حقیقتاً یہ اسٹوری میرے دل کے بے حد قریب تر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بھی یہ تحریر پڑھی۔ پیاری ریحانہ آفتاب دوستوں کے نام پیغام میں ہمیں یاد کرنے کے لیے شکریہ زندگی نے وفا کی فراغت نے نبھا کی تو انشاء اللہ پھر سندیسے کی محفل میں حاضر ہوں گے۔ تب تک اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا شکریہ۔ جانے سے پہلے بھی پڑھنے والی بصارتوں کو عید قرباں کی مبارکباد قبول ہو۔

### عانیہ نیازی ————— ربوہ

پیاری آپلی! ردا قارئین ورائٹرز کو محبتوں بھرا سلام امید ہے سب خیریت سے خوش باش ہوں گے اور جشن آزادی منا کر عید کی تیاریوں میں ہوں گے۔ سب کو ردا کی پاکستان کی آپلی کی سالگرہ مبارک اور ساتھ ہی عید کی خوشیاں بھی بہت بہت مبارک۔ اب بات ہو جائے اگست کے ردا کی تو سب سے پہلے ہم نے سلسلے دار سے شروع کیا کہ تجس کی پیاری میں بری طرح مبتلا میں ہم اور ناولز کی اقساط کا بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔ قمرش آپلی کا ”صحراؤں کی گلیوں میں عشق“ بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ شازیہ آپلی کا ناول خاندانی رشتوں کی آپس کی الجھنوں کے ساتھ دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ریحانہ جی کا ”عشق کی داستان جدا ہے میری“ ایک مڈل کلاس فیملی کے پرابلم اور خوابوں کی داستان لیے بہت زبردست جاری ہے۔ ایقان علی کا ”ستارے“ مجھے اس لیے پسند ہے کہ یہ آج کل کے نوجوانوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتا حقیقت کے قریب ترین ہے۔

☆.....



# دوستوں کے نام

برقی رہے (آمین)

شہلا گل سحر صالح۔ کوہاٹ

شازیہ مصطفیٰ کے نام

شازیہ جی! آپ میری فیورٹ رائٹر ہیں آپ کی والدہ کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبر جمیل عطا کرے۔ ماں کی کمی کبھی پوری نہیں ہو سکتی زندگی کے ہر مقام پر ہمیں ماں کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی یاد ساتھ رہتی ہے۔ اللہ آپ کو صبر اور حوصلہ عطا کرے ہم آپ کے غم میں شریک ہیں۔

صباحر۔ ہارون آباد

تایا کی فیملی کے نام

تایا جی اور تانی جان آپ کو حج کی سعادت بہت بہت مبارک ہو۔ سب سے مبارک بات یہ ہے کہ آپ کی پوری فیملی اس بار حج کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ خالد بھائی اور بھابی ان کے دونوں بچے مرنہ آئی اور ان کے ہسپتال اور دونوں بچے ہم سب کے لیے یہ بات باعث مسرت ہے۔ ہم سب کی جانب سے آپ سب کو بہت بہت مبارک۔

رابعہ منیر۔ سرگودھا

دوستوں کے نام

میری تمام دوستوں کو میٹرک کے شاندار رزلٹ

قمر و ش کے نام

ہماری بہت ہی پیاری اور سینئر رائٹر قمر و ش شہک بکے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ ادارہ اور ہم ان کے غم میں برابر شریک ہیں۔ رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کے درجات بلند ہوں اور ان کا جنت الفردوس میں مقام ہو۔ قارئین و رائٹرز سے دعا کی التماس ہے۔ اللہ تعالیٰ قمر و ش اور ان کی فیملی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آپی

صالحہ آپی کے نام

آپ کے جنم دن کی آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ خوشیوں کا جم غفیر ہر لمحہ آپ کا منتظر ہو اور محبت کی وادی کی ہر راہ گزر آپ کی منتظر ہو اور آپ اللہ کی رحمتوں کے حصار میں ہوں۔ آپ کی زندگی میں خوشیوں کے سلسلے طویل ہوں، (آمین)۔ آپ کے لیے میرے کچھ خاص الفاظ

محبت کا آچل پھیلانے

سب کو اپنے سائے میں سمیٹنے  
خلوص کے لفظوں کی مالا پروئے

ہر دل کو یونہی

فتح کرنی رہیں

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی

بارش پل پل آپ پر

پر بہت بہت مبارک باد، اب چلو جلدی سے پارٹی  
 چھی اریج کر لو کہ پھر کالج اشارٹ ہو گئے تو فرصت  
 ملنی مشکل ہے اور پھر پتا نہیں کس کا کہاں ایڈمیشن  
 ہو، سو گیٹ ریڈی اور پارٹی شاری ناں، ایک بار پھر  
 تمام فرینڈز کو بہت بہت مبارک ہو اور کامیابیوں کا  
 یہ سفر یونہی رواں دواں رہے، آمین۔

ماہ نور۔ فیصل آباد

### اپنی بہن کے نام

سوئیٹ اریبہ! عقیقہ تمہاری شادی  
 ہونے والی ہے۔ میری دعا ہے تمہارا یہ نیا سفر  
 محبتوں اور چاہتوں بھرا ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم  
 اپنی پر خلوص ذات سے اپنے سسرال والوں کے  
 دلوں میں گھر کر لو گی۔ یاد رکھنا سسرال وہ انٹی  
 ٹیوٹ ہے جہاں ہر لڑکی پہلے پہل زیر و کھلاتی ہے  
 مگر وقت گزرنے کے ساتھ اور اپنی صلاحیتوں  
 کے بل بوتے پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اسی  
 گھر کی سب ہو جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی  
 اپنی محبت سے اپنے سسرال میں اپنی جگہ بنا لو گی۔  
 نوٹین مدر۔ لاہور

### صالحہ آبی اور نورین جی کے نام

پیاری پیاری  
 صالحہ آبی  
 نورین تم بھی ساتھ ساتھ ہو  
 میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں  
 ہر لمحہ تم آباد رہو  
 شاد رہو  
 مسرور رہو  
 مصروف رہو  
 کبھی مغرور نہ ہونا  
 ریما نور سے

اپنی ریما سے بھی دور نہ ہونا  
 تمہارا حسین سا کھڑا  
 آفتاب کی مانند روشن رہے  
 تم پر میری دعاؤں کا پھر رہے  
 ہے دعا میری رب کریم سے  
 تم سدا کا میاب رہو  
 تم سے میرا ناطہ بنا رہے  
 دل میں دعائیں بہت ہیں  
 مجھ ناچیز کو لکھنے کا ڈھنگ نہیں

ریما نور۔ کراچی

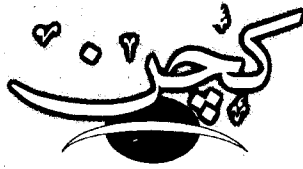
### ڈیئر خضر جانو

آپ کے جنم دن پر آپ کی آبی دل کی  
 گہرائیوں سے آپ کو مبارک باد کہتی ہے زندگی  
 کے ہر موڑ پر مقام پر اللہ آپ کو کامیاب کرے۔  
 آپ کی زندگی طویل ہو اور خوشیاں آپ کے مقدر  
 میں ستاروں کی طرح چمکتی رہیں۔ (آمین)۔  
 میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں اور دعاؤں  
 کے مولیٰ تمہارے لیے روز و شب بھیجتی ہوں۔  
 شہلا گل صالح۔ کوہاٹ

### ردا اشاف اینڈ انیتا اختر کے نام

السلام علیکم پیاری صالحہ آبی، نورین ملک  
 اور ردا کے تمام اشاف کو میری طرف سے دل کی  
 گہرائیوں سے عید مبارک۔ انیتا اختر کیسی ہو؟  
 تمہاری دوا اسٹوریز ردا میں شائع ہو گئیں۔ بہت  
 بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی تمہیں  
 کامیابیاں عطا کریں، آمین۔ میری حوصلہ افزائی  
 کے لیے میں دل سے تمہاری ممنون ہوں اگر  
 پوری دنیا میں کسی نے مجھے سراہا ہے تو وہ تم ہو، انیتا  
 اختر۔ ہمیشہ خوش رہو۔ اچھا اچھا لکھتی ہو اور مجھے  
 ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھنا۔ میری طرف سے

مہیں بڑی عید کی بڑی مبارک باد، ہا ہا ہا۔  
 حصہ کنول۔ نوبہ ٹیک سنگھ



## میتھی کلچی

میری نیٹ کی ہوئی مٹی ملا دیں اور پکائیں۔ بیس منٹ تک پکائیں۔ چولہے سے اتار لیں۔ آخر میں گرم مصالحہ اور مٹی ملا دیں اور ادراک کے باریک باریک ٹکڑوں کو ہرے مصالحے سے گارنش کر کے گرم نان کے ساتھ سرو کریں۔

## کٹناکٹ

### ضروری اجزاء

- چار عدد : گردے
- ایک پاؤ : چانپ
- دو عدد : بیجے
- پانچ عدد : سبز مرچیں
- دو چائے کے چمچے : مٹی پتے
- ایک انچ کھلوا : ادراک
- نصف کپ : دہی
- آٹھ کھانے کے چمچے : کھی
- دو عدد درمیانے : پیاز
- چار عدد : ٹماٹر
- ایک کھانے کا چمچ : لہسن (پسا ہوا)
- دو کھانے کے چمچے : سرخ مرچ پاؤڈر
- تین چائے کے چمچے : گرم مصالحہ
- چوتھائی کپ : خاص گرم مصالحہ
- دو تین عدد : سونف
- ایک کھانے کا چمچ : بڑی الائچی
- خشخاش

### ضروری اجزاء

- ایک پاؤ : کلچی
- دو عدد : پیاز
- ایک چائے کا چمچ : ادراک پیسٹ
- حسب ذائقہ : نمک
- ایک چائے کا چمچ : لہسن پیسٹ
- آدھا کپ : تیل
- ایک چائے کا چمچ : سرخ مرچ پاؤڈر
- حسب ضرورت : ہرا دھنیا کے پتے
- ایک چائے کا چمچ : زیری پاؤڈر
- دو کھانے کے چمچے : قصوری مٹی
- حسب ضرورت : سیاہ مرچ پاؤڈر
- چوتھائی چائے کا چمچ : گرم مصالحہ پاؤڈر
- حسب ضرورت : ہری مرچ
- آدھا کپ : تیل

ترکیب: پہلے کلچی کو نمک اور سیاہ مرچ کے ساتھ میری نیٹ کر کے پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ تیل گرم کریں اور پیاز کو براؤن فرائی کر لیں۔ ادراک پیسٹ، لہسن پیسٹ، سرخ مرچ پاؤڈر، ہرا دھنیا کے پتے، زیرہ پاؤڈر اور ہری مرچ ملا کر تھوڑا سا پانی ڈال دیں اور اچھی طرح فرائی کر لیں۔ درمیان میں پانی کا چھینٹا بھی دیتی جائیں۔ مصالحہ اس وقت تک پکائیں کہ اچھی طرح پک جائے۔ اس کے بعد اس میں

گرم مصالحہ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ  
 کچا پیتا پیسٹ : دو چائے کے چمچ  
 نمک : حسب ذائقہ  
 تیل : حسب ضرورت

ترکیب: ران کو اچھی طرح صاف کر کے گہرے کٹ لگائیں۔ اب اس پر نمک اور پیتا لگا کر ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرائنڈر میں ادرک، لہسن، ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچیں، زیرہ اور نمک ملا کر گرائنڈ کر کے ہر مصالحے تیار کر لیں۔ دہی میں پیسا ہوا ہر مصالحہ اور گرم مصالحہ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور یہ آمیزہ ہاتھ کی مدد سے پوری ران پر اچھی طرح لگائیں اور دو گھنٹے تک میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک بڑی پیلی میں چھ کھانے کے چمچ تیل گرم کر کے مصالحہ لگی ران اس میں ڈال کر بیس منٹ تک ڈھک کر پکا میں اس کے بعد پلٹ دیں اور مزید بیس منٹ تک ڈھک کر پکا لیں۔ سرخ ہونے پر اور گوشت گل جانے کے بعد نکال لیں۔ گرین مصالحہ ران تیار ہے۔ سلاڈ اور ہری چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

### سکے کباب

ضروری اجزاء : گوشت : ڈیڑھ کلو  
 لیون : ایک عدد  
 پیاز : ایک عدد  
 لہسن : دو جوے  
 دہی : ڈیڑھ پیالی  
 سرکہ : چار چمچے  
 گرم مصالحہ : دو چمچے  
 سرخ مرچ : دو چمچے  
 نمک : ڈیڑھ چمچ  
 ادرک : ایک کلو اداؤنچ

جاد تری : ایک چٹکی  
 سیاہ مرچ : دو کھانے کے چمچے  
 ثابت دھنیا : دو کھانے کے چمچے  
 پیسا ناریل : آدھا کپ  
 سفید زیرہ : دو کپ  
 لونگ : تین تا چار چھٹانک  
 جالغفل : دو عدد  
 وارچنی : ایک کلو  
 پیسا دھنیا : دو کھانے کے چمچے  
 کچری : آدھی

ترکیب: توے پر ذرا سا پانی ڈال کر پہلے گردے اور پھر چانپیں کاٹ لیں اتنا کاٹیں کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جائیں، اب اس میں لہسن ڈال دیں۔ ساتھ ہی پیاز ڈال کر کاٹیں۔ نمک اور سرخ مرچ پاؤڈر ملانے کے بعد بھیجا ڈال کر کاٹیں۔ ذرا سا پانی چھڑکیں اور دو مخصوص پنچوں کی مدد سے خوب کٹا کٹ کر پی ریں۔ سبز دھنیا، گھی اور دہی بھی ملا لیں اور چھپوں کی مدد سے بھون لیں۔ آخر میں خاص گرم مصالحہ، میتھی اور سبز دھنیا ڈال کر اچھی طرح کٹنا کٹ تیار کر لیں۔ بالکل باریک ہو جائے تو کھانے کے لیے تیار ہے۔

### گرین مصالحہ ران

ضروری اجزاء : بکرے کی ران : ایک عدد  
 ادرک : ایک انچ کا ٹکڑا  
 لہسن کے جوے : چار سے چھ عدد  
 ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا) : دو کھانے کے چمچے  
 پودینہ (چوپ کیا ہوا) : دو کھانے کے چمچے  
 ہری مرچیں : چار عدد  
 زیرہ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ  
 دہی : ڈیڑھ کپ

ملا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد پیٹیا، پیاز، کالی مرچ پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، گرم مصالحہ پاؤڈر، خشکاش، لال مرچ پاؤڈر اور دہی کو گوشت میں کس کر لیں اور ایک گھنٹا مصالحہ ملا ہوا گوشت میری نیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک طرف کوئلہ گرم کر لیں۔ پھر تیخ میں گوشت پر و لیں۔ اور کوئلہ پر سینک لیں۔ بہاری کباب جب تیار ہو جائیں تو برش یا روٹی کے ذریعے کھی لگائیں۔ گرم گرم لذیذ بہاری کباب پرائیجے کے ساتھ مزے سے نوش فرمائیں۔

### مصالحے دار دہی والی چانپ

اجزاء  
چانپ : ایک کلو  
لہسن (پسا ہوا) : ایک چائے کا چمچ  
ہر ادھیا (پسا ہوا) : ایک کھانے کا چمچ  
کالی مرچ (پسی ہوئی) : ایک چائے کا چمچ  
دہی : آدھا کلو  
پیاز (پسی ہوئی بڑے : دو عدد  
سانزکی)

ادرک (پسی ہوئی) : ایک چائے کا چمچ  
ہری مرچ (پسی ہوئی) : ایک چائے کا چمچ  
نمک : حسب ذائقہ  
کھی : ایک پاؤ

ترکیب: دہی کو اچھی طرح پھیٹ لیں۔ تمام لے ہوئے مصالحے دہی میں ملا دیں۔ اب چانپ کو اچھی طرح دھولیں اور ان کو مصالے لے دہی میں ڈبو دیں۔ کم از کم آدھا گھنٹا ان کو پڑا رہنے دیں تاکہ مصالحہ جات اچھی طرح چانپوں میں جذب ہو جائے۔ ساس پینا کڑا ہی میں کھی کو گرم کریں اور اس میں چانپیں ڈال کر تیل لیں۔ لذیذ مصالحے دار دہی کی چانپ تیار ہے۔ سلا دار چینی کے ساتھ تناول کریں۔

ترکیب: گوشت کے دوانچ کے ٹکڑے کاٹ لیں اور لیموں کا رس لگا دیں۔ اب آدھا پیاز کاٹ کر رکھ لیں اور باقی آدھا پیاز، لہسن، ادرک، سل پر باریک پیس لیں اور دہی، سرکہ، گرم مصالحہ، نمک اور سرخ مرچ میں حل کر کے گوشت کو یہ تمام مصالحہ اچھی طرح لگا دیں اور فریج میں رات بھر رکھ دیں۔ اگلے روز ان گوشت کے ٹکڑوں کو تیخ پر چڑھا لیں۔ ہر بوتلی کے بعد ایک کلو پیاز کا بھی تیخ پر چڑھاتے جائیں اور کوئلے اچھی طرح دھکا کر ان کے اوپر یہ تنکے پکا لیں۔ دھیان رہے کہ تنکے اوپر سے بہت جلد نہ پک جائیں۔ کوئلوں سے مناسب فاصلے پر رکھیں تاکہ گوشت اندر سے بھی اچھی طرح گل جائے۔ تیخوں کو وقفے وقفے سے گھماتے جائیں تاکہ تنکے تمام اطراف سے پک جائیں۔

### بہاری کباب

ضروری اجزاء  
مگائے کا گوشت

ایک کلو (پارچے ہوا لیں)

دہی : ایک پیالی  
سرسوں کا تیل : ایک پیالی  
پیٹا پسا ہوا : ایک کھانے کا چمچ  
پیاز پسی ہوئی : ایک پیالی  
کالی مرچ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ  
زیرہ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ  
گرم مصالحہ پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ  
خشکاش : ایک کھانے کا چمچ  
لال مرچ پاؤڈر : دو کھانے کے چمچ  
نمک : حسب ذائقہ  
ادرک کا پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ  
کھی : ایک کپ

ترکیب: گوشت میں پہلے نمک اور سرسوں کا تیل

# سنگھار

میک اپ ایک ایسی چیز ہے جو خواتین کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے۔ خواتین کو ضرورت ہے کہ وہ میک اپ کا استعمال ایسے خاص طریقے سے کریں جو کہ لمبے عرصے تک ان کی جلد کو ہموار اور خوب صورت رکھنے میں مددگار ہونے کے ساتھ جلد کو میک اپ کے نقصانات سے بھی محفوظ رکھے۔ خواتین کی جلد کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلینرز کے استعمال کو معمولات میں شامل کر لیں۔ دن کے آغاز پر میک اپ کے استعمال سے پہلے چہرے کو کلینزر کی مدد سے مساج کریں گرم پانی میں روئی بھگو کر چہرے کو اس سے اچھی طرح صاف کر لیں۔ جلد پر موجود چکنائی اور گرد و غبار صاف ہونے کے بعد جیسے ہی کلینزنگ مکمل ہو، روئی کی مدد سے جلد پر ٹونر استعمال کریں۔ ٹونر نہ صرف آپ کی جلد کو شفاف و ملائم بنانے میں مددگار ہے بلکہ جلد کو لمبے عرصے تک جراثیم کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ جلد کو دس سے پندرہ منٹ کا وقت دیں اور اس کے بعد خشک ہوتے ہی جلد پر موجود دھبوں اور جھریوں لائنوں پر کنسیلر کا استعمال کریں۔ یہ چہرے کی باریک لائنوں اور جھریوں کو چھپانے میں معاون ہے۔ کنسیلر کے استعمال کے فوراً بعد آپ اپنی جلد پر 2/1 چارج سن بلاک کا استعمال کریں اور ایک موٹی تہہ جلد پر اچھی طرح پھیلا لیں۔ اس سے آپ کی جلد دن بھر کی دھول مٹی سورج کی شعاعوں اور

میک اپ کے اثرات سے محفوظ ہو جائے گی۔ پندرہ منٹ کے دورانیے کے لیے سن بلاک کو جلد میں جذب ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔ جب بات آتی ہے سن بلاک کے استعمال کی تو چند لوگوں کا کہنا ہوتا ہے کہ یہ جلد کو چکنا چاک ہے لوگوں کا یہ سوچنا اب صحیح نہیں رہا کیونکہ سن بلاک مختلف درجہ کی میں موجود ہیں نہ صرف کریم بلکہ جیل فارم میں بھی دستیاب ہیں۔ سن بلاک کو جلد کی قسم کے مطابق چنا جانا بے حد ضروری ہے۔ چکنی اور خشک جلد کی اقسام کے لیے سن بلاک بھی مختلف اقسام میں میسر ہیں۔ سن بلاک جلد کو سورج کی شعاعوں سے بچانے کے ساتھ جلد کی عمر کو ڈھلنے سے روکنے اور جھریوں سے بچانے کے لیے بے حد مفید اور کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ سن بلاک کی تہہ کے جذب ہونے کے بعد جلد پر میس بنانے کے لیے آپ کامپیکٹ پاؤڈر کا استعمال کر سکتی ہیں چونکہ جلد پر سن بلاک کی تہہ موجود ہے تو میس یا فاؤنڈیشن لگانے کی بجائے آپ ڈائریکٹ پاؤڈر لگا سکتی ہیں۔ اس طرح آپ ہموار جلدی سطح بھی حاصل کر سکتی ہیں اور میس کے نقصان دہ اثرات سے محفوظ بھی رہ سکتی ہیں۔ پاؤڈر اپلائی کرنے کے بعد آپ اپنی ضرورت اور جلدی رنگت کے حساب سے اس کی مقدار میں کمی بیشی کر سکتی ہیں۔ چند لوگوں کا سوچنا ہے کہ میس کے بغیر ہماری جلد میں خوب صورتی نہیں آ سکتی لیکن یہ بالکل غلط

نظر یہ ہے۔ بیس کا اصل مقصد پاؤں کے جذب ہونے اور نکلے رہنے میں مدد کرتا ہے اور اس مقصد کو کسی بھی ایجنٹ بن بلاک سے پورا کیا جاسکتا ہے اور سن بلاک جلد کی رنگت کے حساب سے بھی میسر ہیں۔ چند لوگوں کو یہ مسئلہ درپیش رہتا ہے کہ کامیکٹ پاؤں جلد کی سطح پر ہموار نہیں رہتا اور جلد کی سطح کو کھردرا دیتا ہے۔ لوگوں کے شعور کے لیے یہ بات جانتا ہے کہ ضروری ہے کہ بیس اور کامیکٹ جلد کی سطح کو خطرناک حد تک نقصان پہنچاتے ہیں لیکن یہ اثرات تب مرتب ہوتے ہیں جب انہیں بغیر سن بلاک کے جلد پر استعمال کیا جائے جن لوگوں کی جلد کی سطح چکنی ہوتی ہے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلیئرنگ کرنے کے بعد میک اپ اپلائی کریں اور میک اپ کو اتارنے کے لیے تونز اور کلیئرنگ کا استعمال کریں۔ اگر روزانہ میک اپ اپلائی کرنے کی ضرورت درپیش ہو تو ہفتے میں دوبار اسکرُب کا استعمال کریں۔ اس سے ان کی جلد میک اپ کے مضر اثرات سے بچی رہتی ہے۔ جن لوگوں کی جلد خشک ہوتی ہے ان کو چاہیے کہ وہ میک اپ کرنے سے پہلے جلد پر ماسیجر یا تونز کا استعمال ضروری بنا لیں اس سے ان کا کامیکٹ پاؤں جلد کی سطح پر ہموار رہتا ہے اور جلد خشکی کے باعث خراب ہونے سے بھی محفوظ رہتی ہے۔ ان تمام باتوں پر عمل کر کے خواتین نہ صرف خوب صورت نظر آسکتی ہیں بلکہ اپنی جلد کو پہلے سے بہتر بنانا ان کے لیے نہایت آسان بن سکتا ہے۔ خواتین ہمیشہ اچھی کوالٹی کے میک اپ کی اشیاء استعمال کریں اور جلد کو میک اپ کے مضر اثرات سے محفوظ رکھیں۔

آسان ٹوکلے آزمائیے:

☆ بالوں کو چمکدار بنانے کے لیے لیموں کا رس نکال کر اس کی ماسھ کر کے تھوڑی دیر کے بعد دھو لیں۔ اس کے علاوہ شیمپو کرنے سے ایک یا دو گھنٹے پہلے سر پر تیل کی اچھی طرح ماسھ کرنے سے بھی بالوں کی چمک بڑھ جاتی ہے۔

☆ ناخنوں کو مضبوط بنانے کے لیے ایک گہری پیالی یا پیٹل میں زیتون کا تیل ڈال کر اس میں ناخنوں کو ڈبو دیں اس کے بعد نیم گرم تیل میں ڈال کر ناخنوں کو ٹشو پیپر سے صاف کر لیں کچھ دنوں کے بعد ناخن مضبوط ہو جائیں گے۔

☆ روزانہ جانے کے دوپچھے شہد پانی میں ملا کر پینے سے چہرے کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔  
☆ اگر آپ کے بالوں میں خشکی بڑھ گئی ہے تو آدھا پاؤں دہی میں ایک انڈا ملا کر بالوں پر لگائیں۔ اس کے بعد تو لیے سے اپنے بالوں کو پلیٹ لیں ایک گھنٹے کے بعد سر دھو لیں اس طرح سر میں خشکی کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔

☆ بالائی سے پاک دہی میں تھوڑا سا خیر ملا کر گالوں پر لگائیں چند منٹ بعد سادے پانی سے چہرے کو دھوئیں جلد سے دانوں کیل مہاسوں کا خاتمہ چند ہی دنوں میں ہو جائے گا۔

☆ ماہرین جلد کا کہنا ہے کہ دہی کے اندر قدرتی حسن کو برقرار رکھنے کے لیے شہد خصوصیات ہوتی ہیں، کیونکہ اس میں موجود عنصر جلد کو سچ کرنے میں مددگار ہوتا ہے دہی کو جلد پر لگا کر کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیں اور ملے گرم پانی سے چہرے کو دھوئیں جو آپ کو نہ صرف نکھر نکھر بنا دے گا بلکہ چہرے پر موجود دانوں کو بھی ختم کر دے گا۔

☆.....